قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ستمبر 2013، قیمت -/15

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

علاقائی زبان وادب اور اردو

ماہنامہ اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
جلد:15،شمارہ:09،ستمبر 2013

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا
انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: منظر سبحانی

قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے
■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت: 49539009)

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 24415194- 040

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 2

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3

انٹرویو
پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی سے گفتگو — غضنفر اقبال 7

کور اسٹوری
بنگلہ اور اردو: جتنے دور اتنے پاس — ف س اعجاز 12

اردو اور پنجابی: اتحاد اور امتزاج — کرشن بھاوک 16
اردو پنجاب اور پنجابیت — کہکشاں فلک 20
اڑیا زبان و ادب اور اردو — کرامت علی کرامت 22
تلگو زبان میں مستعمل اردو الفاظ — ستار ساحر 25
اردو مراٹھی کے باہمی روابط — سید یحییٰ نشیط 27
بہار کی علاقائی زبانوں کا ادب اور اردو — قاسم خورشید 29

زبان و تعلیم
گجرال کمیٹی کی رپورٹ اور سردار جعفری — لئیق صلاح 32
اختر حسین رائے پوری کا اسلوب — خالد ندیم 34

ادبی مباحث
جموں کشمیر میں اردو تحقیق — مشتاق احمد وانی 38

جدیدیت، حلقۂ اربابِ ذوق کی توسیع — عبدالرحمٰن 42

شخصیت
عبدالماجد دریابادی — عبدالستار دلوی 45

مشاہیر ادب/نظم
مرزا شوق — ادارہ 47
انتخاب کلام مرزا شوق 48

مشاہیر ادب/نثر
کرشن چندر — ادارہ 51
پشاور ایکسپریس — کرشن چندر 52

ہماری مطبوعات
دکن کا بہمنی سلطان: تاج الدین فیروز — ہارون خاں شیروانی
مترجم: رحم علی الہاشمی 56

دوسری زبانوں سے
لمس (اڑیا کہانی) — پرتیبھا رائے
مترجم: رشدہ خاتون 61

صحت
سوائن فلو: ڈریں نہیں لڑیں — بلال احمد 67

تہذیب و ثقافت
قوالی کی روایت اور ہندستانی مشترکہ تہذیب — رضی شہاب 69

سائنس
اسرارِ کائنات — محمد حازم کمال 73

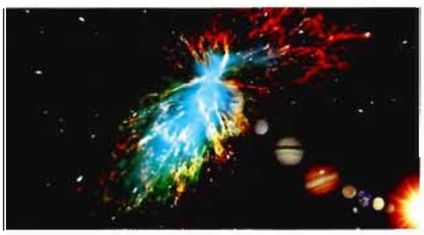

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 75

اردو کیمپس
یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں — ادارہ 82

عالمی اردو نامہ
ڈنمارک کوپن ہیگن سے شائع ہونے والے اردو جرائد — نصر ملک 83
عالمی خبریں — ادارہ 86

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 87

ہماری بات

قوتِ انجذاب اردو زبان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اپنے آس پاس کے ماحول، سماجی حالات، رہن سہن کے طور طریقوں اور روایتوں سے جنم لینے والے لفظوں اور علاقائی زبانوں کے الفاظ، محاوروں، استعاروں اور کہاوتوں کو جس فطری انداز میں اردو زبان اور اس کے ادب نے جذب کیا ہے اور اپنے اندر سمویا ہے، اس کی دوسری مثال کم از کم ہندوستان کی کسی اور زبان میں نہیں ملتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ملک کی دوسری زبانیں سب سے الگ تھلگ رہتی ہیں یا ہماری علاقائی زبانوں نے ملک کی بڑی زبانوں سے کچھ نہیں لیا ہے۔ ماہرین لسانیات اس پر اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ زبان کوئی جامد شے نہیں ہے اور وہ سب سے الگ Isolation میں بھی نہیں رہ سکتی۔ زبانیں بہتی ہوئی ندیوں کی طرح ہوتی ہیں جو اپنے کناروں کی مٹی کو بھی ساتھ لے کر چلتی ہیں، ماحولیاتی تبدیلیوں کے حساب سے اپنا رخ بھی بدلتی ہیں، نوک دار پتھروں کو گھستی، پیستی اور لڑھکاتی ہیں اور اپنی طاقتِ نمو سے طرح طرح کے پھول، بوٹے، جھاڑیاں اور درخت اگاتی رہتی ہیں۔ اس طرح زبانوں کا اپنا ایک حیاتیاتی نظام Ecological System ہوتا ہے۔ وہ اپنے بولنے والوں کے تہذیبی وثقافتی مزاج، رسم ورواج، سیاسی وسماجی حالات، تجارت، معیشت اور صنعت وحرفت کے وسیلوں سے پیش آنے والی ترسیلی ضرورتوں اور فکر وفلسفہ وادبی تخلیقات کا اثر قبول کرتی ہیں۔ ان کے لفظ، معنی ومفہوم یہاں تک کہ املا اور تلفظ کے لحاظ سے بھی اپنی شکل، شخصیت اور کردار کو بدلتے رہتے ہیں۔

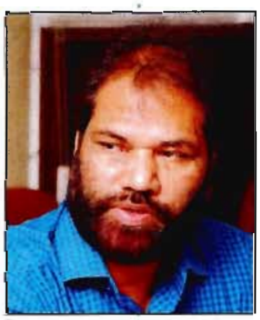

اردو اپنے ارتقا اور نشو ونما کی تقریباً ایک ہزار سال کی تاریخ کے دوران طرح طرح کے مشکل حالات اور لسانیاتی ایکو سسٹم کے ساتھ کی گئی چھیڑ چھاڑ کے بعد بھی ہمارے بیچ آج ایک زندہ، جیتی جاگتی اور سانس لیتی ہوئی زبان کے طور پر موجود ہے۔

اپنے آس پاس کے ماحول سے جو زبان جتنی زیادہ جُڑتی جاتی ہے اور دوسری زبانوں کے ساتھ میل جول اور لین دین کے معاملے میں جس قدر لچک دار رویہ اپناتی ہے اتنا ہی اس کا دائرہ اثر وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو اردو زبان دنیا کے سب سے زیادہ ملکوں میں بولی جانے والی زبان انگریزی سے بڑی حد تک ملتی جلتی ہے۔ اسی لسانی رویے کی وجہ سے اردو یا ہندوستانی بولنے اور سمجھنے والوں کی مجموعی تعداد فرانسیسی، جرمن، عربی، فارسی، ہسپانوی، روسی اور پرتگالی بولنے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔

برصغیر ہند وپاک میں بھی اسے رابطے کی سب سے بڑی زبان Lingua Franca کا درجہ اسی لیے مل پایا ہے کہ اس نے اس خطے کی بیش تر علاقائی زبانوں سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔ علاقائی زبانوں اور ان کے ادب پر اردو کا خاصا اثر مرتب ہوا ہے اور خود اردو نے بھی زبان اور ادب کی سطح پر ان سے کافی اثر قبول کیا ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں ہم نے ملک کے علاقائی زبان وادب کے ساتھ اردو کے اختلاط واشتراک کا مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ بعد میں ہم اس جائزے کو ملک کی قومی زبان ہندی اور اس کے ادب تک دراز کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تا کہ اس کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکے کہ اردو نے لسانی اشتراک کے کن راستوں کو اپنا کر ارتقائی منزلیں طے کی ہیں اور خود اردو زبان کے فروغ میں دوسری زبانوں کے ساتھ اس کے لسانی روابط کا کتنا ہاتھ ہے۔

امید ہے یہ کور اسٹوری آپ کو پسند آئے گی اور اس کے بارے میں اپنے تاثرات سے ہمیں آگاہ فرمائیں گے۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

شاھد علی دلکش

کانکی نارہ، شمالی چوبیس پرگنہ، مغربی بنگال

قومی اردو کونسل کے مدیر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین کے ساتھ ساتھ آپ تمام حضرات کو دل کے نرم گوشے سے بہت بہت مبارک باد کہ آپ نے اردو قارئین کے لیے ایک جامع اور معیاری میگزین بطور تحفہ دیا۔ جولائی کے شمارے کا عنوان 'ادب مذہب اور اردو' پر جب میری نظر پڑی تو میں نے اپنا سارا کام چھوڑ کر فوراً اسے اپنے ہاتھوں لیے ورق گردانی شروع کردی جب بغور مطالعہ کیا تو اداریہ 'نصرت ظہیر صاحب کا انٹرویو' حسین الحق کی 'اردو زبان میں مذہبی ادبیات' اور 'مذہبی لٹریچر اور اردو' جیسے اچھے مضامین سے علمی تشنگی بڑھی تب ہی زبان و تعلیم کے حوالے شریف احمد قریشی کے 'معنی کی نیرنگیاں اور ان کا تحفظ' اور عبدالواسع کے 'نئی نسل اور اردو زبان و ادب' کے مضامین پڑھنے میں مسرور و مصروف ہوگیا۔ جولائی کے شمارے میں ایک خاص بات یہ بھی رہی کہ غالباً پہلی بار میری حد نظر کے مطابق قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر جیسا مضمون نظر آیا اس کے لکھنے والے محمد فضل خان مبارک باد کے مستحق ہیں۔ علاوہ ازیں ذی ہوش قاری کے لیے 'اردو اور سکھ گرنتھ' اور 'بائبل کے اردو تراجم کہانی سے حقیقت تک' کافی توجہ کے حامل ہیں۔ عبدالرشید صاحب کا 'اردو ادب میں کتے کا علامتی استعمال' اور شبیر احمد لون کا 'انانیت اور انا نیتی ادب' بھی شاندار و جاندار ہیں۔ اس شمارے میں کریئر گائیڈ بعنوان 'چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کورس' بذریعہ ندیم غوری پڑھا تو قومی اردو کونسل کی پوری ٹیم کے لیے دعائیہ کلمات والے خیالات آنے لگے کہ اللہ آپ کو اسی طرح قوم و ملت کی خدمت کی توفیق عطا کرے تاکہ آپ بلاناغہ ہر شمارے میں طالب علموں کے لیے مفید کریئر گائیڈنس والے مضامین بھی شائع کرتے رہیں۔ قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں بطور خبرنامہ میں 'تخلیقی ادب کے انتخاب کاروں کی شمولیت' نیز قومی اردو کونسل کے صدر دفتر فروغ اردو بھون میں تخلیقی ادب پینل کی پہلی میٹنگ کی خبر پڑھ کر شادمانی ہوئی۔

ڈاکٹر محمد ھاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا نئی دہلی

جولائی 2013 کا اردو دنیا کا شمارہ پیش نظر ہے۔ یہ اگر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ شمارہ ان متعدد محققانہ مضامین کے لحاظ سے دوسرے شماروں سے بہت بڑھ گیا اور ان گراں قدر مضامین کی اشاعت پر آنجناب اور ان کے لکھنے والے قابل صد تہنیت و تبریک ہیں۔ یہ مضامین ہیں 'اردو زبان میں مذہبی ادبیات، مذہبی لٹریچر اور اردو، بائبل کے اردو تراجم کہانی سے حقیقت تک، اردو اور سکھ گرنتھ، قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر، معنی کی نیرنگیاں، مشاہیر ادب نثر۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کا مضمون 'اردو شاعری کے معشوق پر نظر' اردو کے جلیل القدر ادیب، نامور محقق اور نقاد وہاب اشرفی پر مضمون 'وہاب اشرفی: شخصی و ادبی جائزہ' اور مظہر الحق علوی صاحب سے انٹرویو۔ جناب وہاب اشرفی سے احقر کو شرف نیاز تھا اور مظہر الحق علوی کے متعدد ناول زمانہ طالب علمی میں راقم السطور نے بڑی دل چسپی سے پڑھے۔ قرآن مجید کے اردو تراجم اور تفاسیر میں مولانا حمید الدین فراہی کے نامور شاگرد اور صاحب نظر عالم دین مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر تدبیر القرآن کا ذکر رہ گیا۔

سید نجمی ظفر

'دلکشا' کارا ہاؤس کمپاؤنڈ، پیر باعث گلی، عالم گنج، پٹنہ 7

ماہ جولائی اداریہ میں آپ نے اردو زبان کے شمولی مزاج اور تکثیری کردار پر مدلل گفتگو کی ہے اور کور اسٹوری کے مقالوں کے لیے واضح خطوط بھی طے کردیے ہیں۔ ادارتی تحریر کی جامعیت روشن ہے۔ کور اسٹوری کے تحت کل چھ مقالوں نے جگہ پائی ہے اور مضامین و مواد کے لحاظ سے ان کی اہمیت واضح ہے۔ دیگر مقالات اور مشمولات سے قطع نظر چند سطروں میں یہاں میں پروفیسر حسین الحق کی تحریر کے تعلق سے چند باتیں لکھنے کی اجازت چاہوں گا۔ پروفیسر موصوف نے اپنی تحریر کی ابتدا چند ایسے نظریاتی وفلسفیانہ مفروضوں اور کلیوں سے کی ہے، جن کا اصل موضوع سے بمشکل تمام ہی کلیدی رشتہ محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک طرف بہت ساری ممکنہ باتیں نہیں کہی ہیں اور دوسری طرف کئی غیر متعلق باتیں سامنے لاکر بالآخر قاری کو انتظار کے بھنور میں چھوڑ دیا ہے۔ اصطلاحوں کے استعمال نے موصوف کی تحریر میں سنجیدہ فکر و فلسفہ اور چیستاں گوئی یا معمہ گوئی کا فرق ہی مٹا دیا ہے۔ شعریت اور شریعت کے رشتے کی تلاش خوب بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ سطح مذہب کی تقسیم بھی کسی ایسے تازہ ذہنی اپج کے شاہکار سے کم نہیں جہاں لفظ 'ظاہر' کو 'داخل' کی ضد سے نوازا گیا ہے اور بیچارہ باطن اور 'خارج' منہ دیکھتا رہ گیا ہے۔ موصوف تصوف کے سلسلے میں ایک فکر پیش کرتے ہیں اور پھر اُس فکر کے تحت قرآن، حدیث اور تصوف کے متعلق اپنی ذاتی رائے پورے وثوق کے ساتھ رکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح علم الفقہ کے ضمن میں آپ فرماتے ہیں کہ فقہ پر کتابیں کم نظر آتی ہیں۔ یہ سوال بار بار ذہن پر دستک دے رہا ہے کہ کیا 'مذہب' کی بات صرف 'اسلام' تک ہی محدود ہے۔ آخر اردو ادب میں دیگر مذاہب کے متعلق تحریریں کس خانے میں رہیں گی۔ 'مذہبی ادبیات' سے کیا مراد ہے؟ اس کے ممکنہ اصولی دائرے کیا ہیں؟ کاش ایسے سوالوں کا جواب پروفیسر موصوف کے قلم سے سامنے آتا۔ ایسا لگتا ہے کہ موصوف مذہبی ادبیات میں عرفان و تصوف کے متعلق

ادبیات کو شامل کرنے کی پر اصرار وکالت کرنا چاہتے ہیں ۔مگر غور طلب ہے کہ پھر 'صوفیانہ ادبیات' کا کیا ہوگا اور مباحث کو گڈ مڈ ہونے سے بچانا کہاں تک ممکن رہے گا۔ پھر عرفانیات ہی کیوں؟ اخلاقیات بھی کیوں نہیں؟ ذیلیات پر اس طرح زور دینا مشکلیں ہی کھڑی کرسکتا ہے۔ موصوف نے 'اسلام' کو سامنے رکھا ہے مگر تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، فرائض واصول فرائض، علم کلام، علم الرجال، تاریخ وسیرت وغیرہ کتنی جہتوں سے گفتگو کا قاری کو انتظار ہی رہ گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ موصوف کی اس تحریر کا قاری ایک عجیب ابہام اور مذہبی لفظیات کے دام میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور ایک خالص ادبی موضوع محض مسلکی ونظریاتی اوراعتقادی بحث ومباحث کی نذر ہوجاتا ہے۔ یہ شاید تاریخی حیرت ناک جملہ کہا جائے گا کہ '' فتویٰ خود فقہ نہیں ہے''۔ معلوم نہیں اس انداز تحریر سے کتنے علوم اپنے اپنے ماضی، حال و مستقبل کی خیر منانے لگیں گے۔ بہرکیف یہ امید کی جاسکتی ہے کہ جو باتیں وضاحتی اصول کے ساتھ سامنے آنے سے رہ گئی ہیں وہ کسی موقع پر موصوف کے قلم سے بطریق احسن ضرور سامنے آئیں گی انشاءاللہ تعالیٰ۔شریف احمد قریشی کا مقالہ 'معنی کی نیرنگیاں اور ان کا تحفظ' میں موصوف نے جہاں معنی کی نیرنگیاں کے ضمن میں تفصیل اور طوالت کے ساتھ اپنا مافی الضمیر بیان کیا ہے، کاش عنوان کے دوسرے جز پر بھی اسی طرح قدرے تفصیل سے خامہ فرسائی کرتے تو مضمون کی علمی وتکنیکی اہمیت وافادیت مزید مستحکم ہوجاتی۔ نصرت ظہیر نے مظہرالحق علوی سے انٹرویو کا حق ادا کردیا ہے۔ بہرصورت بحیثیت مجموعی شمارہ حسب روایت مطالعہ کے لیے خاصا مواد فراہم کردیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ، ضلع نظام آباد

'اردو دنیا' ماہ جولائی کا شمارہ موصول ہوا۔اب کے تاخیر پر تشویش ہوئی ورنہ یہ ہمیشہ پہلی تاریخ کو مل جاتا ہے۔ سرورق پر ادب مذہب اور اردو عنوان پڑھنے سے ایسا محسوس ہوا کہ اب مزید نیا مواد ملے گا ویسا ہی ہوا ہماری بات میں مدیر صاحب نے حق اور سچ کہا ہے کہ اردو کا دوسرا نام سیکولرزم ہے۔ اردو دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے اور اخلاقیات کے فروغ کی زبان ہے۔ جناب نصرت ظہیر نے مظہرالحق علوی سے گفتگو کے ذریعے بہت سی معلومات اردو دنیا کے قارئین کو عطا کی ہے۔ اس سلسلے کو جاری رکھیں تاکہ ادبی کوائف وحقائق آشکار ہوسکے۔ کور اسٹوری کے تحت جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ جدت وندرت لیے ہوئے ہیں اور ان مضامین سے یہ یقین پختہ ہوگیا ہے کہ اردو کا کردار سیکولر کردار ہے اس نے اپنے دامن میں تمام مذاہب کے ادب کو سمو لیا ہے۔ زبان وتعلیم کے تحت معنی کی نیرنگیاں اور ان کا تحفظ میں فکر انگیز انداز سے لفظوں کے معنی بتلائے ہیں۔ باقی حصے بہت خوب ہیں اور ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو نئی معلومات سے پر ہیں اردو دنیا اپنے get-up set-up کے لحاظ سے ایک کتاب سے کم نہیں اور اس میں مختلف علوم وفنون پر جو مضامین شائع ہورہے ہیں اس سے نہ صرف ادبی قاری کو بلکہ عام قاری کو فیض پہنچ رہا ہے اسی پالیسی اور نہج کو برقرار رکھیے۔ 21 ویں صدی میں ایسے ہی رسالے کی ضرورت ہے جس سے اردو والے اردو ماحول عصری وٹکنالوجی کا ادراک کرسکیں۔

کرشن بھاوک

A-201، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، پٹیالہ، پنجاب

'اردو دنیا' کا جولائی کا شمارہ ہمدست ہوا۔ اس میں اگر چہ تمام مشمولات عمدہ اور معیاری ہیں، تاہم ڈاکٹر ناشر نقوی کا مضمون 'اردو اور سکھ گرنتھ' بے حد پسند آیا ہے۔ ایک غیر پنجابی ہوکر بھی موصوف نے موضوع کے ساتھ ہر زاویے سے کاملاً انصاف کیا ہے۔ وہ 'آدی گرنتھ' کے ماہر عالم و فاضل ثابت ہوتے ہیں اور اپنے عمیق و دقیق مطالعے کی شہادت دیتے ہیں۔ وہ اور ادارہ ایسا اہم مقالہ شائع کرنے پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کے اعلیٰ مضمون 'معنی کی نیرنگیاں...' میں ادارے کی اس گزارش کی تکمیل وتعمیل کی گئی ہے کہ نگارشات 'موضوعات اور جدید تقاضوں پر لکھی جانی چاہئیں' یہ مقالہ ہماری جانکاری بڑھانے والا ہے۔ موصوف نے مترادفات کے استعمال کی بابت یہ صحیح فرمایا ہے کہ ''ایسے الفاظ کی اس طرح سے تشریح کی جانی چاہیے، جس سے ان کا پورا مفہوم واضح ہوجائے۔'' (ص 25) کیا موصوف نے بجائے خود اس مضمون میں مستعمل دو الفاظ 'لغت' اور 'فرہنگ' کی تفریق کی کوئی تشریح کی ہے؟ ورنہ انھوں نے 'لغت نگار' اور 'فرہنگ نویس' جیسے مترادف الفاظ کا استعمال کیوں کیا ہے؟ تاہم یہ موضوع بہت ہی مفید ہے۔ مثال کے طور پر اردو میں کچکول، کجکول، اور کشکول یہ مختلف املا والے فارسی زبان کے ہی تین مترادف لفظ کیوں ہیں؟ عربی مذکر 'استاذ' اور فارسی مذکر کے 'استاد' جیسے متعدد الفاظ کے الگ الگ املا کی کیا وجہ ہے؟ 'حلال' لفظ کی مانند سیکڑوں الفاظ ایسے ہیں، لغات میں بیک وقت جن کے اچھے اور برے معانی دستیاب ہوتے ہیں۔ ادارہ صد فی صد مبارک باد کا مستحق ٹھہرتا ہے کہ وہ ہر بار نئے اور مفید موضوعات پر تحریر کیے مقالے شائع کرتا جارہا ہے۔ بقول داغ ''اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ!''

نثار احمد صدیقی

معرفت جنتا میڈیکل اسٹور، کریم گنج، گیا بہار

'اردو دنیا' شمارہ (جولائی 2013) کا سرورق خوبصورت و پرمعنی ہے۔ آپ کا اداریہ حسب معمول اچھا اور معلوماتی ہے۔ 'کور اسٹوری' کے تحت سارے مضامین پڑھے، حسین الحق اور نوشاد عالم کا مضمون معلوماتی ہے۔ بہت دنوں بعد اس طرح کے مضامین پڑھنے کو ملے، اس کے لیے آپ سب شکریہ کے مستحق ہیں۔ نصرت ظہیر کا مظہرالحق علوی سے لیا ہوا انٹرویو بہت ہی خوب ہے۔ اس طرح کے انٹرویو سے بہت ساری اہم ادبی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رکھیے۔ اسلم جمشید پوری کا مضمون افسانچے پر بھرپور اور مکمل مضمون ہے، لیکن یہ مضمون بحث کا بھی دروازہ وا کرتا ہے۔ مجموعی طور پر رسالہ معیاری ہے۔

محمد محسن احمد

نزد حنیف کرانہ شاپ، اکبر پلاٹ، اکوٹ فیل اکولہ

'اردو دنیا' جولائی 2013 میں محترم اسلم جمشید پوری کا ادبی مباحث کے تحت ایک مضمون بعنوان 'افسانچے کے خدوخال اور جدید اردو افسانے میں عصری حیثیت' دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اردو دنیا جیسے رسالے میں بھی افسانچوں سے متعلق مضمون کو اہمیت دی جارہی ہے جس سے یقیناً افسانچے کے مقام و ادبی مرتبے میں اضافہ ہوگا۔ لیکن مضمون پڑھ کر حیرت ہوئی کہ مہاراشٹر (اکولہ) کے نوجوان افسانچہ نگار محمد رفیع الدین مجاہد کا کوئی ذکر نہیں اور نہ ہی کسی افسانچے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ محمد رفیع الدین مجاہد کے افسانچوں کا مجموعہ 'چنگاریاں' 2010 میں شائع ہوچکا ہے جس کے مرتب ڈاکٹر محمد ذاکر نعمانی ہیں۔ اس مجموعے پر بہار اردو اکادمی نے حال ہی میں محمد رفیع الدین مجاہد کو اختر اورینوی ایوارڈ دیا ہے۔

سلمان جونپوری

23 اقراڈ پلیکس، نارول، وٹوا روڈ، احمدآباد

'اردو دونیا' کا تازہ شمارہ دستیاب ہوا بہت پسند

آیا۔ سودا کی ہجوگوئی بہت اچھی لگی۔ مظہر الحق علوی کا انٹرویو بھی بہت پسند آیا۔ مختلف مذاہب کے بارے میں جو مضامین ہیں بہت ہی معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ امید ہے کہ ایسے معلوماتی مضامین کے ساتھ آئندہ بھی رسالہ دستیاب ہوتا رہے گا۔

محمد عبدالعزیز سہیل

4-2-75 لطیف بازار نظام آباد 503001

’اردو دنیا‘ جولائی کا شمارہ موصول ہوا۔ ٹائٹل پر نظر ڈالی تو ادب مذاہب اور اردو کا موضوع سامنے آیا۔ مشمولات میں کوراسٹوری کے تحت کئی اہم شخصیات کے مضامین شامل ہیں جو کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہماری بات کے تحت مدیر محترم کا اداریہ خیالات کی وسیع بلندیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ حالانکہ المیہ یہ ہے کہ اردو کو مخصوص مذہب سے جوڑ دیا گیا ہے جس سے زبان کی ترقی رک جاتی ہے۔ مدیر محترم کا یہ اداریہ ایک مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مظہر الحق علوی سے نصرت ظہیر کا مصاحبہ بہت اچھا ہے جس سے مظہر الحق علوی کی شخصیت سے متعلق مختلف گوشوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہیں۔ نوشاد عالم کا مضمون مذہبی لٹریچر اور اردو کافی اچھا مضمون ہے جس کے مطالعے سے مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ سائنس کے زمرے کے تحت ڈاکٹر اسلم فاروقی کے مضمون سے نئی معلومات حاصل ہوئی۔ انھوں نے تعلیمی اداروں میں تدریس کے لیے جدید ٹکنالوجی کے استعمال سے متعلق جو باتیں بیان کی ہیں وہ تمام ہی قابل قبول ہیں۔ اردو دنیا محمد خواجہ اکرام الدین صاحب کی ادارت میں ترقیوں کی منزلیں طے کررہا ہے۔ الحمداللہ وقفے وقفے سے اہم موضوعات سے متعلق اردو کے موقف کو واضح کیا جارہا ہے۔

خان محمد شکیل سہسرامی

اردو شعبہ، بہار قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ

اردو دنیا کی بوقلمونی اور گوناگوں رنگینی بہر حال اپنے چاہنے والوں سے داد لیے بغیر نہیں رہتی۔ کمال کا سرورق، بے مثال نقش و نگار، آئینہ روطباعت، غضب کا گیٹ اَپ اور سب سے بڑھ کر نادر محتویات کی فراہمی لائق تحسین ہے۔ ہماری بات کی آخری سطر سے بالخصوص میں اتفاق ظاہر کرتا ہوں اور تائید بھی کرتا ہوں۔ علوی صاحب کا انٹرویو لائق اعتنا ہے۔ ٹھیک اس کے بعد صفحہ نمبر 10 پر نظر جاتے ہی دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اپنا ربط خاص بھی جناب حسین الحق کے سہسرام ہی سے ہے۔ پروفیسر حسین الحق کا مضمون پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ شریف احمد قریشی کو میرے خیال سے مضمون ایک بار اور دیکھ لینا چاہیے تھا کہیں کہیں کوئی بات کھٹکتی نظر آتی ہے۔ ممکن ہے میری رائے صحیح نہ ہو۔ پروفیسر واسع صاحب کی احاطہ کاری اعتبار کے قابل ہے۔ خیابان خلیل کا مطالعہ ذہن کو تھکا دیتا ہے۔ راشد انور راشد نے مرحوم مخمور سعیدی کے حوالے سے جی خوش کر دیا۔ شبیر احمد لون کا مضمون بالکل منفرد تخلیق ہے۔ صفحہ نمبر 41 اور 42 کا جائزہ اونٹ کے منہ میں زیرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک جشن وہاب کا سوال ہے تو یہ خاکسار بھی شامل جشن تھا جو دیکھنے اور سننے کے قابل تھا۔ وہاب صاحب نے مجھے اپنے مباحثہ میں اخلاقیات کا بہت بڑا علمبردار لکھا ہے۔ یہ ان کا ظرف عظیم تھا۔ فردوس نذیر بٹ کی محنت قابل قدر ہے۔ انتخاب کلام امیر مینائی حاصل شمارہ گوشہ ہے۔ عام طور سے پتنگ بازی کرتے ہوئے لڑکے بچے دیکھے جاتے ہیں مگر اس فن پر مہتاب جہاں کا مضمون ایک مختلف قسم کا اضافہ ہے۔ ندیم غوری کی توجہ طالب علموں پر ایک احسان جمیل ہے۔ اصغر وجاہت میرے طالب علمی کے زمانے سے ہی من پسند قلم کار رہے ہیں۔ عہد حاضر میں جدید ٹکنالوجی کا استعمال زندگی کا جزولاینفک بن چکا ہے۔ مکتوب کا اختتام میں اپنے دو مصرعوں پر کرتا ہوں جو اردو دنیا کی فرقہ دارانہ ہم آہنگی کی نذر ہیں اور دوسرا شعر عید سعید کی نذر:

بائبل قرآن رامائن گرنتھ
ایک شکچھا ایک منزل ایک پنتھ
ہر طرف تو غموں کی آندھی ہے
کیا خوشی عید کی منائے کوئی

سلیم احمد رحمانی

ایڈیٹر ماہنامہ ’گلشن اطفال‘ 1032، اسلامپورہ، مالیگاؤں (ناسک)

’اردو دنیا‘ جون 2013 کا شمارہ اپنی تمام آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ بچوں کے ادب سے والہانہ لگاؤ کی بنا پر ’بچوں کا ادب اور اردو‘ کا گوشہ دل کو بھا گیا۔ اسی گوشے کے تحت جناب امتیاز احمد کا مضمون ’بچوں کے اردو رسائل، کردار اور تقاضے‘ پڑھ کر فاضل مضمون نگار کی ایک غفلت پر افسوس ہوا۔ دو باتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو مضمون نگار نے جان بوجھ کر نظرانداز کیا یا پھر واقعی ان کے علم میں یہ بات نہیں کہ اردو کے گڑھ شہر مالیگاؤں سے سات سال سے گلشن اطفال ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوکر پورے ملک میں پڑھا جارہا ہے۔ اوّل الذکر بات سمجھ میں آتی ہے جب کہ فروری 2013 سے شروع ہونے والے رسالے کا تذکرہ کیا گیا مگر ’گلشن اطفال‘ کو نظرانداز کیا گیا۔ دیگر قارئین کے لیے عموماً اور مضمون نگار امتیاز احمد کے لیے خصوصاً معلومات عرض ہے۔ رحمانی پبلی کیشنز مالیگاؤں تقریباً 19 سال سے اردو ادب اطفال کی آبیاری میں لگا ہوا ہے۔ 16 جون 1995 کو بچوں کا اخبار ’بزم اطفال‘ جاری کیا جو کہ الحمدللہ مسلسل پابندی کے ساتھ 12 سال تک شائع ہونے کے بعد قارئین کے بے حد اصرار پر ماہنامہ کی شکل میں 2007 ’گلشن اطفال کے نام سے وجود میں آیا ہے۔ اور الحمدللہ آج نہ صرف مہاراشٹر بلکہ پورے ملک میں پھیل گیا ہے اور ملک کے نامور ادبا اور شعرا کی تخلیقات اس رسالے کی زینت بنتی ہیں۔ ساتواں سال ہے، اب تک 78 شمارے شائع ہوئے۔ دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ فن اور فنکار کا سلسلہ، بچوں کی دلچسپی کے مستقل کئی کالم اور بچوں کے مزاج اور معیار کے مطابق ہر چیز شائع ہوتی ہے۔

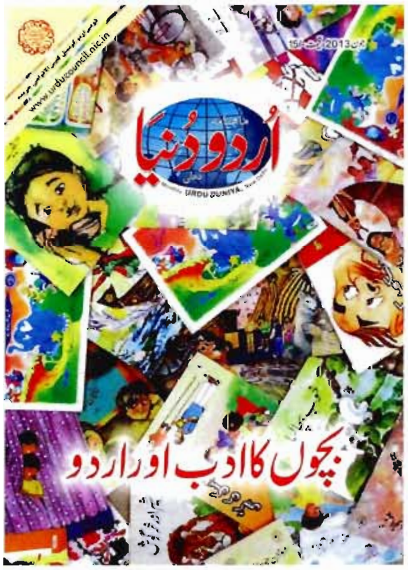

صابر شیخ برہان پوری

بی 13، صدیقی نگر (میٹھا مولا)، پوسٹ، برہان پور

اردو دنیا ماہ جون 13 کا شمارہ سامنے ہے۔ 1948 تا 1959 بحیثیت اردو میڈیم طالب علم کے اور 1960 تا 2003 اردو میڈیم مدرس کے عمر عزیز کا عرصہ گزرا ہے۔ بچوں کے ادب میں کیا کیا نشیب و فراز آئے بچشم خود مشاہدہ کیا ہے۔ اس تعلق سے رسالے کے مضامین کا ایک ایک حرف صحیح ہے۔ میں ایک سال سے زیادہ عرصے سے اس رسالے کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ بہت عمدہ اور معلوماتی مضامین جیسے جولائی 12 کے شمارے میں ’ابوالقاسم زہراوی- ایک عظیم سرجن‘، ’ہندوستانی سنیما-

جسے اردو نے بولنا سکھایا' اکتوبر 12 کے شمارے میں سرورق پر مہاتما گاندھی کے اردو خط کا عکس۔ غرض ادبیات، شخصیات، واقعات، خدمات، طبی معلومات، سوانح، کارنامے، کمپیوٹر، سائنسی واقفیت اور انٹرویو وغیرہ۔ ان میں کچھ مضامین ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں بار بار پڑھ کر بھی سیری نہیں ہوتی۔ فی زمانہ اردو زبان میں بگاڑ یا اغلاط، ہمعصر اور مقامی زبانوں کے زیر اثر اور بالخصوص ٹی وی کی وساطت سے درآئی ہیں۔ جیسے ہندی اخبارات لفظ 'مخالفت' کو 'خلافت' لکھتے ہیں۔ جب کہ دونوں لفظوں میں معنوی بعد ہے۔ ٹی وی خاص طور سے 'فیصلہ کرنا' کے بجائے 'فیصلہ لینا' تلاش کیا کو تلاشا۔ سوال کیا کے بجائے سوال پوچھا اور انکار کی جگہ منع اور جانے کتنے ہی الفاظ و تراکیب کو بگاڑ کر استعمال کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے زبان بگاڑنے کی سازش ہو رہی ہے۔ لفظ سوال کے معنی ہی پوچھنا یا دریافت کرنا ہے۔ ''فلاں نے مجھ سے پوچھا۔ یا۔ فلاں نے مجھ سے سوال کیا۔''

اسی طرح ایک لفظ 'منع' ہے اور دوسرا 'انکار' ہے۔ دونوں کے معنی و محل استعمال الگ الگ ہے۔ منع کے معنی ہیں روک دینا۔ یہ دوسرے شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے میں نے حامد کو بازار جانے سے منع کر دیا یعنی روک دیا اور انکار کے معنی ہیں نہ ماننا۔ جیسے حامد نے بازار جانے سے انکار کر دیا یعنی بازار جانے کی بات نہ مانی۔ ایسا لگتا ہے انکار کی جگہ پر منع نے अतिक्रमण (بالجبر قبضہ) کرلیا ہے اور قصداً نہ سہی سہواً ہی تحریری ادب میں بھی آنکھ بچا کر نوکِ قلم پر آجاتا ہے۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری

زرینہ منزل، ورنداون کالونی، قدیم جالنہ، ضلع جالنہ

'اردو دنیا' جون 2013 میں جناب سید معین الدین علوی کا گراں قدر مضمون بعنوان 'گمشدہ مصرعوں کی تلاش' نظر سے گزرا۔ کافی کاوش سے لکھی ہوئی ایک مفید تحریر ہے۔ دراصل ایسے ہی برمحل اور زبان زدِ خاص و عام ضرب الامثال، روزمرہ، محاورے اور اشعار کی اکثر قارئین کو جستجو رہتی ہے۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کے ماخذ کیا ہیں۔ یا اکثر ایک مصرعہ عام ہو تو اس کا اولی یا ثانی مصرعہ کیا ہے، شاعر کون ہے وغیرہ ایسے کئی ادبی مباحث پر فاضل مصنف نے بڑے عالمانہ مگر دلنشین انداز میں بحث کی ہے۔ اِس موضوع پر چند ایک کتابیں دستیاب تو ہیں لیکن اِس ایک مضمون میں جو بات ہے وہ صفحات در صفحات میں گم ہے۔

سمیع الدین خاں شاداب

رام پور، یوپی

'اردو دنیا' (جون 2013) کا شمارہ کچھ دیر سے یعنی 8 جون کو ملا۔ اداریہ پڑھتے ہی بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے تمام مراحل طے کرتے ہوئے 'بچوں کی دنیا' کو قارئین کے سامنے جلد ہی اس ماہ میں ہی رکھنے کا فیصلہ کرلیا آپ کو اور آپ کی تمام ٹیم کو بہت بہت مبارکباد۔ اس کی قیمت کیا رکھی ہے ضرور مطلع کریں تاکہ میں بھی اس کے خریداروں میں شامل ہوسکوں۔ ان حالات میں بچوں کی ذہن سازی کرنے، ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے، مطالعے کا ذوق پیدا کرنے، اخلاقی بلندی تک لے جانے اور 'اچھا' ماحول بنانے میں 'بچوں کی دنیا' اہم رول ادا کرے۔ بس یہی دعا ہے۔

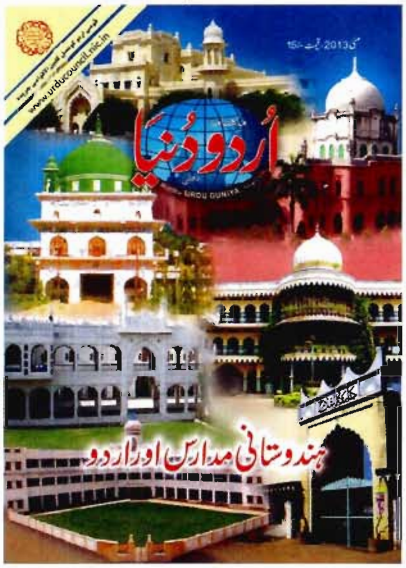

منظور دایک

سکریٹری، کشمیر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، سرینگر

'اردو دنیا' نظروں سے گزرا۔ واقعی آپ لوگ اردو زبان و ادب سے وابستہ تازہ ترین تحقیقی مضامین شائع کرکے قارئین رسالہ کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ مرحوم اصغر علی انجینئر بھی ایک انقلابی شخصیت کے قابل ترقی پسند ادیب اور محقق تھے مرحوم نے تمام عمر سماجی جبر کے خلاف جدوجہد کے علاوہ، ترقی پسند نظریہ پر کثیر مضامین بھی لکھے۔ مرحوم نے مجھ کو عظیم شخصیت مرحوم حکیم عبدالحمید بانی ہمدرد یونیورسٹی سے ملایا ہے اور مرتے دم تک خط و کتابت و فون پر رابطہ قائم رکھتے تھے۔ اردو کے عظیم افسانہ نگار رام لعل پر مضمون سے میری ان کی تصنیفات پر نظر پڑی۔ ان سے میری اولین ملاقات رسالہ 'شانِ ہند' دریا گنج دہلی کے دفتر مرحوم ودیا پرکاش سرور کے ذریعے ہوئی تھی۔ ان کے سفرنامہ زرد پتوں کی بہار پر کافی چرچے ہو رہے تھے۔ شان ہند کے سب ایڈیٹر نے مخمور اکبرآبادی کی روح نظیر 1985 میں دوبارہ شائع کی تھی، میرے بزرگ نند کشور وکرم کو عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ ملنے پر خوشی ہوئی مگر ان کی اہلیہ کی موت سے مجھ کو رنج ہوا۔ مرحومہ کتنی مہمان نواز اور نرم طبیعت کی تھیں صفی لکھنوی اور بچوں کے ادب مضامین اچھے ہیں۔

حافظ سیف الرحمن

اسٹڈی سینٹر مدرسہ عثمانیہ، سرونج

اردو دنیا کا ہر شمارہ اپنی تمام تر خوبیوں اور دلکش رعنائیوں سے مزین اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سیاسی سماجی پہلو تہذیب و ثقافت کی پائیداری کے ساتھ ہندوستان کے مختلف شہروں کا تعارف ادبی شخصیات کے انٹرویو کریئر گائڈ سائنسی معلومات، ہر شمارے میں بہتر سے بہتر شامل کیا جاتا ہے جو نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

امجد جاوید

حلیمہ ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ، گلبرگہ

این سی پی یو ایل کی غیر معمولی سرگرمیوں سے واقفیت ہوتی رہتی ہے، ہر وقت کچھ نہ کچھ ایسا پڑھنے اور سننے کو ملتا ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے، ہر ہفتہ ای ٹی وی کے ذریعے اردو دنیا کے ذریعے، اردو اخبارات کے ذریعے، مسلسل این سی پی یو ایل کی سرگرمیاں پڑھنے اور دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اردو دنیا کے تو کیا کہنے روز افزوں ترقی کی طرف ہی گامزن ہے، ہر شمارہ اپنے آپ میں ایک ادبی دستاویز ہے، حالیہ دو خصوصی شمارے فلمی صنعت کے سو سال اور بچوں کا ادب پر گوشہ خاص توجہ کے متقاضی ہیں، بعض اوقات تو ایسے مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں جو طبیعت پر ایک سحر سا طاری کرتے ہیں۔ اب این سی پی یو ایل ایک واحد متحرک ادارہ رہ گیا ہے جس سے آس بندھی ہے اور ڈھارس ہوتی ہے کہ اردو زبان اور تہذیب و ادب زندہ رہیں گے۔ بلا مبالغہ بغیر کسی رسمی گفتگو کے این سی پی یو ایل کے کام کو دیکھ کر متذکرہ حالات کے تناظر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان و ادب اب کروٹ لے رہا ہے، اور اس میں ایک نئی جان ڈالی جارہی ہے، اس کی بازیافت ہو رہی ہے اس کی گم گشتہ راہوں کی پھر سے دریافت ہو رہی ہے۔ ■

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی سے گفتگو

غضنفر اقبال

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، اردو شاعرات میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ان کی شاعری میں تانیثیت کی پرچھائیاں گھری ہیں۔ رفیعہ شبنم عابدی کو ادب وراثت میں ملا ہے۔ ان کے والد بزرگ وار محترم شاکر منچری، شعری سلسلے کے اعتبار سے حضرت داغ کے تلامذہ سے نسبت رکھتے تھے۔ رفیعہ شبنم مختلف تعلیمی اداروں میں چالیس برس تک تدریس کے پیشے سے منسلک رہ کر ممبئی یونیورسٹی سے بہ حسن خدمات پر سبکدوش ہوئیں۔ دو درجن سے زائد کتابوں کی مصنفہ رفیعہ شبنم نے آکاش وانی ممبئی کے بزم اردو کے تحت 'بینی بائی کی چال' کے نام سے ایک مستقل سیریل ایک عرصے تک تحریر کیا۔ کئی ایک جرائد کی مشاورت میں شامل رہنے والی شاعرہ رفیعہ شبنم عابدی نے ملک اور بیرون ملک کے مشاعروں کی نظامت بھی انجام دیتی رہی ہیں۔ ان کو ملک کی مختلف اکادمیوں نے اعزازات سے بھی نوازا ہے۔ اردو دنیا کے باذوق قارئین کے لیے ان سے لیے گئے انٹرویو کے اقتباسات نذر ہیں: (غ الف)

غضنفر اقبال: آپ کا خاندانی پس منظر کیا ہے؟

رفیعہ شبنم عابدی: میرے جدِاعلیٰ سید محمد مدنی ایک متقی، پرہیزگار عالم دین تھے۔ ساری عمر درس و تدریس میں صرف کردی۔ مختلف علمی و دینی موضوعات پر عربی و فارسی میں متعدد کتابیں لکھیں جو اب نایاب ہیں۔ غالباً سولھویں یا سترہویں صدی میں مدینے سے ایران ہوتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے۔ میرے دادا میر زلف علی جعفری نے مہاراشٹر کے ایک قصبے منچر (مینو چہر کا مخترب) میں سکونت اختیار کرلی۔ والدِ محترم میر سجاد علی اسی نسبت سے شعر و ادب کی دنیا میں اپنے تخلص کے سبب شاکر منچری کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق شاعر بلکہ ماہرِ عروض وقواعد، ماہرِ ریاضیات اور ماہرِ تعلیم بھی تھے ان کی تیار کردہ نصابی کتاب ایک طویل عرصے تک ریاست بمبئی میں تحتانوی اور ثانوی سطح پر اردو مدارس میں پڑھائی جاتی رہیں۔ والدہ سیدہ زینب اپنے زمانے کی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ قرآن و دینی تعلیم کے علاوہ ادبی ذوق وشوق بھی رکھتی تھیں۔ صحافتی مضامین سے بھی انھیں کافی دل چسپی تھی۔ چنانچہ میں نے بچپن میں امورِ خانہ داری سے فراغت پانے کے بعد منشی فیاض علی، ڈپٹی نذیر احمد، احمد علی، راشد الخیری اور اے آر خاتون کے ناولوں کا مطالعہ کرتے دیکھا تھا۔ شاید اسی لیے یہ ادبی ذوق ہم نو بہن بھائیوں میں منتقل ہوگیا اور میرے حصے میں یہ ورثہ شاید کچھ زیادہ ہی آ گیا۔

پھر خوش قسمتی سے میری شادی نوگانواں سادات (یوپی) کے ایک عابدی خاندان میں ہوئی۔ میرے شوہر سید حسن اختر عابدی (علیگ) حسنِ اتفاق سے خود بھی شاعر ہیں۔ اس لیے شادی کے بعد ادبی سرگرمیاں یوں ہی جاری رکھنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی، بلکہ انھوں نے اپنا بھرپور تعاون دیا جس کے لیے عمر بھر ان کی شکرگزار رہوں گی۔

غ الف: آپ نے لکھنا کب اور کیسے شروع کیا؟

رفیعہ شبنم عابدی: جب آنکھ کھلی گھر میں ایک ادبی ماحول پایا، جہاں نثر سے زیادہ شاعری کا چرچا تھا۔ اکثر گھر میں ہی اہلِ خانہ کے درمیان غزل گوئی بلکہ طرحی غزل گوئی کے مقابلے ہوتے۔ تقریباً سبھی بھائی بہن شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن خوش قسمتی سے 'قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند' کے مصداق اکثر وبیش تر بہترین غزل یا بہترین گرہ کا انعام ناچیز کے حصے میں ہی آتا۔ یہ سلسلہ آگے چل کر روبی ادبی طرحی غزل ایوارڈ کی شکل میں ظاہر ہوا اور ملک گیر سطح پر بہترین گرہ کا انعام حاصل کیا۔ مصرعہ تھا:

موت ہم سے ملی زندگی طرح

ناچیز نے گرہ لگا کر شعر یوں مکمل کر دیا تھا:

کچھ گریزاں تو کچھ مہرباں مہرباں
''موت ہم سے ملی زندگی کی طرح''

پنجم جماعت سے ہی شعر کہنے لگی تھی۔ نو، دس سال کی عمر سے ہی نظمیں اور کہانیاں لکھنے کا آغاز ہوا اس صلاحیت اور ذوق کو جلا ملی ان ادبی سرگرمیوں سے جو اسکول، کالج اور ادبی و نیم ادبی انجمنوں کی جانب سے منعقد کی جاتی تھیں۔ پھر جب نظمیں اور کہانیاں بچوں کے رسالوں اور روزناموں میں شائع ہونے لگیں تو اس پذیرائی نے حوصلے اور شوق کو ہوا دی اور پڑھنے لکھنے کا سلسلہ چل پڑا۔ پہلی کہانی نو سال کی عمر میں روزنامہ 'انقلاب' بمبئی میں، پہلا افسانہ اٹھارہ سال کی عمر میں 'تمنا دبی رہی' کے عنوان سے ماہ نامہ 'بیسویں صدی' دہلی میں اور پہلی غزل پندرہ سال کی عمر میں ماہنامہ 'شمع' دہلی میں شائع ہوئی اور پہلا تنقیدی مضمون میر پر ہفت روزہ 'ایشیا' (برمنگھم) میں اشاعت پذیر ہوا؟ تب میں بی اے (سالِ اوّل) کی طالبہ تھی۔

غ الف: آپ کن شعرا اور افسانہ نگاروں سے متاثر ہیں اور کیوں؟

رفیعہ شبنم عابدی: اردو ادب بے حد وسیع

ہے۔ اس لیے متاثر تو ظاہر ہے بہت سے شاعروں اور افسانہ نگاروں نے کیا لیکن میرے شعور پر سب سے پہلا اور گہرا اثر بچپن میں ہی اقبال اور نظیر نے ڈالا اور پھر میر، غالب اور انیس کا ہوا۔ افسانہ نگاروں میں بچپن میں منشی پریم چند، کرشن چندر اور علی عباس حسینی سے متاثر رہی کالج اور یونیورسٹی تک آتے آتے عصمت اور بیدی نے ذہن پر گہرا تاثر چھوڑا۔ البتہ قرۃ العین حیدر کی جگہ ذہن و شعور میں کہیں الگ رکھی رہی۔ آپ نے شاعروں افسانہ نگاروں کے بارے میں پوچھا ہے ورنہ نثر نگاروں میں مجھے مولانا ابوالکلام آزاد اور مرزا غالب نے تاایں دم حلقۂ تاثیر میں گرفتار رکھا ہے۔ سوال کے دوسرے حصے 'کیوں؟' کا کوئی جواب نہیں۔ متاثر وہی لفظ کرتا ہے جو آپ کے ذہن و شعور سے مطابقت، آپ کے ذوق کو مسرت اور آپ کے جذبوں کو سکون اور سوچوں کو وسعت عطا کرتا ہے۔

غ الف: کیا آپ کی ادبی وراثت آپ کی اولاد میں منتقل ہوئی ہے؟

رفیعہ شبنم عابدی: جی ہاں! اللہ کا شکر ہے میرے تمام بچے عمدہ ادبی ذوق کے مالک ہیں۔ تخلیقی دیوانگی جو ایک ادیب کا وطیرہ ہوتا ہے، ان میں شاید اتنی نہ ہو، لیکن میری دونوں بیٹیاں شاداب اور سیماب عمدہ لکھتی ہیں۔ یہ اور بات کہ انھیں شائع ہونے کا شوق ہے نہ جنون۔ اس لیے کم کم چھپتی ہیں۔ بیٹے انگریزی میں لکھنا پسند کرتے ہیں، حالانکہ اردو سے نابلد نہیں۔

غ الف: آپ کا تخلیقی عمل کس طرح سے ہوتا ہے؟

رفیعہ شبنم عابدی: کسی منظر، کسی واقعے، کسی حادثے یا سانحے سے شعور و ذہن کو اگر جھٹکا سا لگے اور جذبے اور احساس کی آنکھیں چھلنے لگیں تو اعصاب اسے سوچ کے دائروں اور لہروں میں تقسیم کرکے انگلیوں کو متحرک کر دیتے ہیں اور الفاظ شدتِ کرب و اضطراب سے کروٹیں بدلنے لگتے ہیں اور بیک جنبشِ قلم کبھی شعوری اور بیش تر غیر شعوری طور پر صفحۂ قرطاس پر اپنے نقوش مرتسم کر دیتے ہیں۔ اکثر ان کی آمد اور ورود کا وقت نیم شب یا صبح کاذب، بیش تر ہلکی رم جھم کا سماں یا سردی کا موسم جو بہت ہی 'ڈل' خیال کیا جاتا ہے، ہوتا ہے۔ وہ ساعت، جب ذہن میں بیتی یادوں کا گزر ہونے لگتا ہے اور 'باغ میں لگتا نہیں، صحرا سے گھبراتا ہے جی' والی کیفیت ہو تو سوچنا پڑتا ہے کہ ''اب کہاں لے جاکے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم''۔ تب قلم اس اعتراف کو شعر میں یوں ڈھال دیتا ہے:

کمالِ فکر نہ معراجِ فن مذاق سمجھ
سخن کو عرشِ بریں، لفظ کو براق سمجھ
یا
لہو کو آگ تو احساس کو ہوا کرنا
ہنر کی شرط ہر اک زخم کو ہرا کرنا

غ الف: ادب کے بارے میں آپ کے کیا نظریات ہیں؟

رفیعہ شبنم عابدی: ادب برائے زندگی اور زندگی کے حصار میں قاری، قلم کار، نقاد، عوام یعنی پورا سماج اور کل سماجی سروکار شامل ہوجاتے ہیں۔ شرط بس اتنی ہے کہ صاحبِ قلم جذبوں اور لفظوں پر قادر ہو۔ تخلیقی حسیت وصلاحیت رکھتا ہو اور اپنے فن کے تئیں ایک صحت مند رویے پر عامل ہو اس ادبی نظریے کو میں نے اپنی ایک نظم میں یوں ظاہر کیا ہے۔ نظم کا عنوان ہے ''تم کو یہ بات سمجھ لینی تھی''

ادب برائے زندگی اور زندگی کے حصار میں قاری، قلم کار، نقاد، عوام یعنی پورا سماج اور کل سماجی سروکار شامل ہوجاتے ہیں۔ شرط بس اتنی ہے کہ صاحب قلم جذبوں اور لفظوں پر قادر ہو۔ تخلیقی حسیت و صلاحیت رکھتا ہو اور اپنے فن کے تئیں ایک صحت مند رویے پر عامل ہو

صاحبِ لوح و قلم ہو تو ذرا دھیان رہے
اپنے افکار کی تذلیل نہ ہونے پائے
اور غلط بات کی ترسیل نہ ہونے پائے
حرمتِ لفظ کا احساس ضروری ہے بہت
اور روایات کا بھی پاس ضروری ہے بہت

غ الف: تنقید آپ کے نزدیک کیا ہے؟

رفیعہ شبنم عابدی: ہر قسم کے علاقائی، لسانی، فکری، مکتبی، مذہبی، مسلکی، سیاسی، سماجی اور صنفی تعصّبات سے مبرا ہو کر کسی تخلیق، متن یا فن پارے کا ایک دیانت دارانہ، صحت مند، متوازن احتساب اور تجزیہ۔ جس میں زبان ادبی ہو لیکن بوجھل، ادق، سائنٹفک اور دھونسانے والی ترجمانی اور جناتی اصطلاحات سے گریز کیا جائے۔ میرے نزدیک تنقید بھی ایک تخلیقی حسن رکھتی ہے۔ اگر نقاد اپنا ایک مخصوص تخلیقی اسلوب رکھتا ہے تو وہ بھی اسی طرح پہچانا جاتا ہے جس طرح کوئی تخلیقی فن کار شاعر یا ادیب۔ مثلاً آلِ احمد سرور، عسکری، کلیم الدین احمد، ظ انصاری اور وارث علوی ایسے ہی صاحبِ طرز نقاد کہے جاسکتے ہیں۔

غ الف: اردو نظم کی روایت کیسے تشکیل پاتی ہے؟

رفیعہ شبنم عابدی: عام کلیہ ہے کہ ادب میں ہر تخلیق اپنی شکل خود بناتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر نئی تبدیلی جو سماجی، سیاسی یا معاشی سطح پر انقلاب لاتی ہے، ادبی روایت کو متاثر کرتی ہے اردو نظم کی روایت بھی انہی تبدیلیوں کے زیر اثر اپنی شکلیں بدلتی رہی ہے۔ ایک زمانے تک صنفِ 'نظم' نثر کے مدمقابل، غزل کے علاوہ اصنافِ شاعری مثلاً مثنوی، مرثیہ، قصیدہ وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوتی رہی۔ البتہ نظم کا جدید تصور بہ حیثیت صنف، جس میں تسلسلِ کلام، موضوع کی وحدانیت، ہیئت کی آزادی، ارتکاز، ایجاز و اختصار، تہہ داری اور جامعیت وغیرہ جیسے عوامل شامل ہیں، انیسویں صدی کی دین ہے۔ جس میں محمد حسین آزاد اور حالی کا ایک اہم رول رہا ہے یہ دور 1857 کے آس پاس کا دور ہے جب ایک نئی تہذیب کی آمد نے ہماری شاعری کو فنی وفکری دونوں اعتبار سے متاثر کیا۔ محمد حسین آزاد اور حالی کی قیادت میں 1867 میں انجمنِ پنجاب لاہور کے مشاعروں کے وسیلے سے ایک نئی نظم نگاری کی بنیاد پڑی۔ پھر وہ تمام شعرا ہیں جنھوں نے دیگر زبانوں کے ترجمے نظموں کی صورت میں کرتے ہوئے اس روایت کو آگے بڑھایا جن میں اکبر، شبلی، وحیدالدین سلیم، چکبست، محروم، سرور جہان آبادی، شوق قدوائی اور خصوصی طور پر عبدالحلیم شرر کے نام شامل ہیں۔ ان منظوم ترجموں کے سہارے اسلوب اور ہیئت کی تبدیلیاں نیز اسٹینزا فارم کی شروعات ہوئی۔ پھر 'مخزن' نے اقبال کی نظموں کے ذریعے ایک ایسی نظم نگاری کو فروغ دیا جو مختلف اور نئے فکر وفن کی حامل تھی۔ لیکن نظم کی اس روایت میں ہم قلی قطب شاہ اور نظیر اکبرآبادی اور کسی حد تک جعفر زٹلی کو بھی فراموش نہیں کرسکتے پھر ایک کھیپ شعرا کی وہ بھی ہے جس میں حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، جمیل مظہری، جوش، احسان دانش، اور اختر شیرانی جیسے نظم نگار ہیں۔ البتہ یہ مانا جاتا ہے کہ نظم گوئی کی روایت کا اصل آغاز ترقی پسند تحریک یعنی 1936 سے ہوتا ہے جس میں فیض، سردار جعفری، کیفی، ساحر وغیرہ کے ساتھ نظم کی ادبی روایت کی ایک تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ پھر حلقہ اربابِ ذوق ہے۔ میراجی، ن م راشد اور خاص طور پر اختر الایمان جو نظم کو ایک نیا روپ

دیتے ہیں۔ بقول شمس الرحمان فاروقی ''اردو والوں کے مزاج میں جدت اور تنوع کا رجحان بہت ہے'' بالفاظ دیگر اس رجحان کے نتیجے میں اردو والے 'روایت' سے 'بغاوت' کے عادی ہیں۔ موجودہ دور میں آزاد اور معریٰ نظم کے ساتھ ساتھ نثری نظم کی تشکیل اسی حقیقت کی غماز ہے۔ کسی بھی روایت کی تشکیل کا یہ عمل یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ ناچیز کا ایک شعر ہے:

روایت سے بغاوت کر کے خوش ہو لو کہ ہم بدلے
روایت اس طرح خود اپنی ہی صورت بدلتی ہے

غ الف: میرا خیال ہے کہ اردو شاعری میں نسائی شاعری کے واضح تر نقوش آپ کے یہاں ہیں۔ آپ کے علاوہ نسائی شاعری میں اور کون سے نام آسکتے ہیں؟

رفیعہ شبنم عابدی: عزت افزائی کا شکریہ، لیکن ناچیز کے علاوہ بھی بے شمار نام ہیں۔ سماجی قدغن کے باوجود ہر دور میں نسائی شاعری ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ مردوں نے بھی 'ریختی' کی شکل میں نسائی شاعری میں طبع آزمائی کی۔ البتہ عورت کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ ہی عورت کے جذبات کے صحیح عکاس نظر آتے ہیں۔ ان میں لطف النسا امتیاز اور مہ لقا بائی چندا سے لے کر صفیہ شمیم ملیح آبادی، کنیز فاطمہ حیا اور ادا جعفری تک اور اس کے بعد زہرا نگاہ، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر تک کئی نام ہیں جن کا تذکرہ کرنے بیٹھوں تو ایک طویل فہرست تیار ہو جائے۔ البتہ ہمارے ملک کی مٹی نم ہوتے ہوئے بھی ابھی تک اتنی زرخیز نہیں ہوئی ہے کہ خواتین کے قلموں اور ذہنوں کو شاداب کر سکے۔ اس لیے یہاں یہ فہرست کچھ مختصر سی ہے۔ پاکستان کے برخلاف ہمارے یہاں مشاعروں میں شاعرات کی شرکت کی روایت نے genuine شاعرات کو شرمندہ کر رکھا ہے۔ بہرحال پھر بھی زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، شفیق فاطمہ شعریٰ کے علاوہ دورِ حاضر میں بلقیس ظفیر الحسن، عذرا پروین اور شائستہ یوسف وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

غ الف: عصرِ حاضر کی نظمیہ شاعری سے آپ کہاں تک مطمئن ہیں؟

رفیعہ شبنم عابدی: بری نہیں، لیکن آج کی صدی کو، ابھی مسجدِ قرطبہ، خضرِ راہ، آدھی رات، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام، آوارہ، تاج محل، میرا سفر، اودھ کی خاکِ حسیں، صبا ویراں، دریچے کے قریب، تنہائی اور ملاقات، یہ رات اس درد کا شجر ہے، ایک لڑکا، پیاس، چاند تاروں کا بن، صلصلۃ الجرس اور پرانی بات جیسی ہر دور میں تر و تازہ رہنے والی اور عوامی ذہنوں کو جھنجھوڑنے والی ایک عمدہ نظم کا انتظار ہے۔ روایتوں کی شکست و ریخت، لسانی انسلاکات میں تبدیلیاں، نئی لفظیات کی اختراع، استعارات میں تنوع اور توسیع اور علامات کی ایمائیت و اشاریت کے باوجود ایسا لگتا ہے جیسے ابھی نظم زبیر رضوی، شہریار، محمد علوی اور ندا فاضلی تک آکر رک گئی ہے البتہ اس میں چند نسوانی ناموں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے مثلاً فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، شفیق فاطمہ شعریٰ اور بس!

غ الف: آپ نے ملازمتیں کہاں کہاں کی ہیں؟

رفیعہ شبنم عابدی: برہانی کالج آف کامرس اینڈ آرٹس میں بہ حیثیت اردو فارسی لکچرر، پھر مہاراشٹر کالج آف آرٹس، سائنس اور کامرس میں بہ حیثیت اردو فارسی لکچرر پھر ریڈر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے اور آخر میں ممبئی یونیورسٹی میں بہ حیثیت صدر شعبۂ اردو...

میرے نزدیک تنقید بھی ایک تخلیقی حسن رکھتی ہے۔ اگر نقاد اپنا ایک مخصوص تخلیقی اسلوب رکھتا ہے تو وہ بھی اسی طرح پہچانا جاتا ہے جس طرح کوئی تخلیقی فن کار شاعر یا ادیب.

غ الف: آپ کے تعلیمی دور اور آج کے تعلیمی دور میں تفاوت کس طرح محسوس کرتی ہیں؟

رفیعہ شبنم عابدی: کل کی تعلیم ذہن سازی اور تعمیرِ کردار پر زور دیتی تھی۔ آج کی تعلیم طالبِ علم کی شخصیت کی ہمہ جہت نشو و نما کی بات تو کرتی ہے لیکن کوئی جہت مکمل جلا پاتی نظر نہیں آتی۔ بلکہ ہمہ جہتی کے چکر میں طالبِ علم کی شخصیت بکھر سی گئی ہے۔ کل کا طالبِ علم اوائلِ عمر ہی میں زبان کی باریکیوں اور قواعد کی نزاکتوں کے واقف ہو جاتا تھا۔ آج کا طالبِ علم وقت سے پہلے باشعور اور باخبر ہونے کے باوجود عقل و دانش کی ان منزلوں تک پہنچتا نہیں دکھائی دیتا جس کا راستہ علم و ادب سے ہو کر گزرتا ہے۔ کل کے طالبِ علم کے حصے میں کتابوں کا بوجھ کم تھا اور علم کا وزن زیادہ تھا۔ آج کے بچے کی پیٹھ کتابوں کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہے اور ذہن face book کی الجھنوں کا شکار ہے۔

غ الف: نئے اساتذہ سے آپ کی کیا امیدیں ہیں؟

رفیعہ شبنم عابدی: امیدیں کم ہیں۔ لیکن مایوسی نہیں۔ نئے اساتذہ میں سے اکثر و بیشتر، مطالعے سے دور ہیں۔ بھاری بھرکم تنخواہ کی کشش انھیں اس پیشے میں لے آئی ہے۔ کم محنت میں 'بہت کچھ' پانا چاہتے ہیں۔ اس لیے دیگر مضامین تو درکنار خود اپنے مضمون میں بھی ان کی معلومات محدود اور غیر تسلی بخش ہے۔ علم اور زبان کی کمی کے باعث فنِ تدریس میں دل کشی پیدا نہیں کر سکتے۔ پس طلبہ کو پوری طرح مطمئن نہیں کر پاتے۔ اس لیے صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ ہمارے نئے اساتذہ مطالعے کی طرف توجہ دیں اور اپنی معلومات میں وقیع اضافہ کریں اور طلبہ تک اس علم کو دیانت داری کے ساتھ پہنچائیں تاکہ آنے والی نسلیں فیض یاب ہوں اور ان کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع مل سکے۔

غ الف: علی سردار جعفری کے فکر و فن پر آپ نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ جعفری مرحوم کا فن آپ کی نگاہ میں؟

رفیعہ شبنم عابدی: بس ایک جملے میں یوں سمجھیے۔ دانش ورمی اور علم سے بھرپور، شائستگی اور شگفتگی کے ساتھ، نثر و نظم دونوں کے وسیلے سے ترقی پسند افکار اور خصوصی طور پر انسان دوستی کی تشہیر و تشریح۔

غ الف: کوئی قابلِ ذکر واقعہ جو آپ کے ساتھ گزرا؟

رفیعہ شبنم عابدی: یہ 1973 کی بات ہے۔ میری زندگی کا پہلا آل انڈیا مشاعرہ تھا جس میں میں بہ حیثیت شاعرہ پہلی بار شریک ہو رہی تھی۔ اُس وقت میری پہچان ایک طالبہ کی تھی۔ مشاعرہ غالباً ممبئی کے داؤد بھائی فاضل بھائی ٹرسٹ کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا یا شاید سرسنگھا سمسد کی جانب سے۔ ٹھیک طرح سے یاد نہیں، لیکن ہاں اتنا ضرور یاد ہے اس میں اپنے وقت کے تقریباً سبھی بڑے اور مشہور شعرا شریک تھے۔ خاص طور پر فراق کی شرکت میرے لیے کشش کا باعث تھی۔ میں ان کی غزلوں کی معترف تھی۔ جب کسی رسالے میں کوئی طویل غزل نظر سے گزرتی تھی تو فوراً مجھ جیسی ایک طالبہ کے ذہن میں یہ خیال آتا تھا کہ نہ جانے فراق کی غزلیں شبِ فراق کی طرح اتنی طویل کیوں ہوتی ہیں؟ انھیں دیکھنے اور اس بات کا سبب جاننے کی خواہش میرے دل میں جاگ اٹھتی تھی۔ اتفاق سے وہ موقع بھی ہاتھ آ ہی گیا۔ بمبئی کے اُس آل انڈیا مشاعرے میں، جس میں مجھ جیسی نومشق شاعرہ بھی مدعو تھی۔ بیکل اتساہی اس مشاعرے کی نظامت فرما رہے تھے۔ جس وقت میں مشاعرہ گاہ میں پہنچی، شہ نشین پر اِکا دُکا شاعر تشریف فرما تھے، مگر وہ چہرے کہیں نظر نہیں آرہے تھے جن کا سامعین کو انتظار تھا۔ پتہ چلا کہ ہمارے شعرا حضرات شغل فرمانے گئے ہوئے

ہیں۔ کافی دیر کے بعد جب مجمع بے چین ہونے لگا، شاعروں کا ایک گروہ اسٹیج پر آیا اور ان کے پیچھے پیچھے فراق گورکھپوری، پھر اچانک اسٹیج کا پردہ گرایا گیا۔ معلوم ہوا کہ فراق صاحب کا لباس درست کیا جا رہا ہے۔ پھر ایک صاحب انھیں سہارا دے کر اسٹیج پر لائے اور بمشکل ناظم مشاعرہ کے قریب عین درمیان میں بٹھا دیا۔ میرے لیے تو یہ منظر حیران کن تھا۔ ایسا کبھی کاہے کو دیکھا تھا۔ میں سر سے پا تک لرز رہی تھی۔ فراق صاحب کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ پوری طرح عالم سرور میں تھے۔ یہاں تک کہ ان کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ صرف دیدوں کی سفیدی جھلک رہی تھی۔ ٹھیک طور پر بیٹھ نہیں پا رہے تھے۔ کبھی اِدھر لڑھکتے، کبھی اُدھر۔ اپنے آپ کو سنبھالنا ان کے لیے مشکل تھا۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر میرے دل میں ان کے لیے جو اشتیاق اور احترام تھا وہ رخصت ہوگیا۔ اگر اس کا نام مشاعرہ ہے تو لعنت ہے ایسے مشاعرے پر!! اور اگر شاعر ایسے ہی ہوتے ہیں تو خدا ہی بچائے ان سے!!— بہرحال تاخیر سے ہی سہی، آخر مشاعرے کا آغاز ہو ہی گیا۔ دو چار شاعروں کو سننے کے بعد سامعین نے فراق صاحب کا نام پکارنا شروع کیا۔ فراق صاحب اس حالت میں کہاں تھے کہ اپنا کلام سناتے۔ بیکل صاحب کسی نہ کسی طرح سامعین کو بہلاتے رہے اور مشاعرے کی فضا کو مکدر ہونے سے بچائے رکھا۔ لیکن مجمع کا مطالبہ بڑھتا گیا اور ہال کے چاروں طرف سے ایک ہی آواز بلند ہونے لگی "We want Firaque"۔ یہاں تک کہ مجمع کو قابو میں رکھنا دشوار ہوگیا۔ آخر مجبور ہوکر بیکل صاحب نے فراق صاحب کو دعوتِ سخن دی۔ مشکل یہ تھی کہ وہ کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ لہٰذا بیٹھ کر ہی کلام سنانے کا انتظام کیا گیا۔ مائک فراق صاحب کے سامنے آیا۔ انھوں نے ایک دو شعر پڑھے اور پھر اگلا شعر بھول گئے۔ اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے شاعروں سے مخاطب ہوکر بولے ''بھئی آپ لوگ بتائیں میری اس غزل کا اگلا شعر کیا ہیں؟'' کسی کو یاد نہ آیا تو بھڑک اٹھے۔ ''سب بدذوق ہیں۔ جاہل ہیں۔ کم عقل ہیں۔ میرا ایک شعر بھی یاد نہیں رکھ سکتے۔'' کوئی کچھ نہیں بولا پھر ہاتھ آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے نشے سے بھرپور لہجے میں بولے ''نائیں... یہ غزل نہیں... دوسری سنیے—'' مگر دوسری غزل کا بھی یہی حشر ہوا۔ تقریباً دس پندرہ منٹ تک یہی تماشا چلتا رہا۔ وہ نشے میں جھوم جھوم کر اور ہاتھ نچا نچا کر کوئی ایک غزل چھیڑتے، پھر اسے ادھورا چھوڑ دیتے۔ اکثر خمار آلود لہجے کے سبب الفاظ سمجھ میں نہ آتے۔ کبھی سنانا چاہتے تو لکنتِ زبان مانعِ تکلم ہو جاتی۔ آخر مجمع بے چین ہوگیا۔ سامعین کا موڈ مکدر ہونے لگا۔ کچھ شرارت آمیز فقرے ادھر اُدھر سے سنائی دینے لگے۔ کچھ کاغذی تیر بھی اسٹیج پر پھینکے گئے اور پھر ہنسی اور قہقہے اور ہوٹنگ!! ایک عجیب طوفانِ بدتمیزی!!۔ ممکن تھا کہ مشاعرہ اکھڑ جاتا۔ اِدھر بیکل صاحب پریشان، اُدھر شعرا متّوش اور سامنے مجمع ہوٹنگ کے موڈ میں — ''کیوں رے بیوڑے! چڑھ گئی کیا؟'' ہاہاہا— '' یہ سننا تھا کہ اچانک فراق صاحب کا ہوش واپس آگیا اور انھوں نے بڑے طمطراق سے، غضب آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے، تیوریاں چڑھا کر، تقریباً شیر کی طرح دہاڑنے والی آواز میں یہ شعر پڑھا:

فراق گرمِ سخن ہے، مذاق ختم کرو
وہ دیکھو ہوگئے سنجیدہ سب در و دیوار

مبالغے سے قطع نظر، یقین کیجیے کھمبئی کے اس مشہور وسیع و عریض ہال میں اس وقت ایسا سناٹا چھا گیا جیسے واقعی ہال کی بلند و بالا دیواروں کا ذرّہ ذرّہ ان کے سخن کی شعلگی میں جل کر خاک ہوگیا ہو۔ سوائے تنفس کے کوئی آواز باقی نہ تھی۔ اس کے بعد جب انھوں نے مزے لے لے کر اپنی غزلیں سنائیں تو نہ لہجے میں لکنت تھی، نہ نشہ تھا، نہ خمار۔ سارے ماحول میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ فراق اتنے ہردل عزیز کیوں ہیں؟ لیکن آج تک یہ معمہ حل نہ ہوا کہ اس سے پہلے جو کچھ ہو رہا تھا آخر ہوا کیا تھا، مذاق؟ ڈراما؟ یا واقعی نشہ؟ اس واقعے کا ذکر میں نے فراق کی زندگی ہی میں اپنے ایک مضمون 'فراق گورکھپوری کی شاعری میں رات کا تصور' مطبوعہ ماہ نامہ آج کل دہلی 1973 میں کیا تھا۔

غ الف: اب تک کی زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ؟

رفیعہ شبنم عابدی: یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں افسانے لکھتی تھی میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ 'بیسویں صدی' میں میرے افسانے اکثر شائع ہوتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں 'بیسویں صدی' خوشتر گرامی کی ادارت میں نکلنے والا بڑا مقبول رسالہ تھا جس میں مشہور نام اور معتبر افسانہ نگار لکھتے تھے۔ کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، مہندر ناتھ وغیرہ وغیرہ جیسے افسانہ نگاروں کے ساتھ چھپ کر بڑی خوشی ہوتی تھی اگر ایک افسانہ شائع ہوتا تھا تو بے شمار خطوط اس کی تعریف میں موصول ہوتے تھے۔ کمسنی میں یہ مقبولیت بڑی اچھی لگتی تھی۔ ایک مرتبہ ڈاک سے ایک صاحب کا خط موصول ہوا وہ

رفیعہ شبنم عابدی سوانحی کوائف

اصلی نام: سیدہ رفیعہ بیگم

ادبی نام: رفیعہ شبنم عابدی

تاریخ و جائے پیدائش: 7 دسمبر 1943 بمبئی

پہلی تخلیق: یاد نہیں، ابتدا میں بچوں کی چھوٹی چھوٹی نظمیں اور کہانیاں لکھیں

کتابیں: (1) نظر نظر کے چراغ، (تنقید) 1980، (2) موسم بھیگی آنکھوں کا (شاعری)، 1985، (3) ملا وجہی اور انشائیہ (تحقیق)، 1988 (4) انوار سہیلی کی کہانیاں (فارسی سے ترجمہ) 1988، (5) حرف حرف چہرے (تنقید)، 1990، (6) سردار جعفری-شخصیت اور فن (تنقید)، 1991، (7) انمول کہانیاں (فارسی سے ترجمہ)، 1992، (8) اگلی رت کے آنے تک (شاعری)، 1994 (9) بچوں کے سردار جعفری (ادب اطفال)، 1994، (10) بچوں کے یوسف ناظم (ادب اطفال)، 1994، (11) میری درسگاہ (مراٹھی سے ترجمہ)، 1995، (12) اردو شاعری میں تذکرہ فاطمۃ الزہرا (تنقید و تحقیق)، 1998، (13) نوائے سروش (محمود سروش سے متعلق مضامین کی تالیف)، 1998، (14) سلام (مراٹھی سے ترجمہ)، 1998، (15) کرشن چندر، ممبئی اور اردو کہانی (تنقید و تحقیق)، 1999، (16) فارسی ادب کا مطالعہ۔ انقلاب اسلامی کے تناظر میں، 1999 (17) مراٹھی ادب۔ ایک تعارف (انگریزی سے ترجمہ)، 1999 (18) معاصر اردو ناول (تنقید)، 2000، (19) سردار جعفری۔ ایک مطالعہ (تحقیق و تنقید)، 2001، (20) مجذوب شیرازی (خواجہ حافظ۔ احوال و آثار۔ تحقیق)، 2002، (21)، غالب کون ہے؟ (غالب پر کہی گئی نظموں کی انتھالوجی)، 2003، (22)، ہندوستان میں شیعیت اور عزاداری کی تاریخ (تحقیق)، 2003، (23)، آنگن آنگن پروائی (شاعری)، 2009، (24) نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں (شاعری)، 2010،

زیر طبع کتابیں:

(1) وہی راستے، وہی منزلیں (رومانی و معاشرتی افسانے)، (2) شاخ نبات (خواجہ حافظ کی ایک سو ایک غزلوں کا منظوم ترجمہ)، (3) تعین (تنقیدی مضامین)، (4) آئینہ روبرو ہے (تقابلی تنقید)، (5) لمحہ لمحہ احتساب (خودنوشت)

پتہ: 502 اے، سن رائز، آرام نگر 2، ورسوا، اندھیری (ویسٹ)، ممبئی، 400061

اسکاٹ لینڈ میں قیام پذیر تھے۔ انھیں میرے نام سے کچھ غلط فہمی ہوگئی تھی۔ انھوں نے تحریر کیا تھا کہ ''میرا خاندان آزادی سے قبل بمبئی میں قیام پذیر تھا لیکن آزادی کے بعد خاندان کے بیشتر افراد نے ہجرت کی اور پاکستان چلے گئے۔ میرے والدین بھی پاکستان (غالباً کراچی) آگئے، لیکن میری ایک خالہ وہیں رہ گئیں۔ اُن کا نام بھی رفیعہ ہی تھا۔ میرا خاندان تو سب کا سب ختم ہوگیا۔ البتہ میں برسوں سے اپنی خالہ کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ اگر آپ وہی ہیں تو ضرور لکھ بھیجیں میں فوراً بمبئی آکر آپ کی قدم بوسی کروں گا۔'' انھوں نے اپنے خاندان کی تاریخ اور افرادِ خاندان کے نام وغیرہ بھی تفصیل سے تحریر کیے تھے۔ میں، ظاہر ہے اس وقت ان کی خالہ کی عمر کی نہیں تھی۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ ''میں آپ کی وہی خالہ تو نہیں۔ البتہ سارے رشتے محض خون کے نہیں ہوتے۔ کچھ رشتے انسانیت کے بھی ہوتے ہیں۔ اس ناطے آپ مجھے اپنی چھوٹی بہن کہہ سکتے ہیں۔'' اس کے بعد انھوں نے واقعی مجھ سے بڑے بھائی کی سی شفقت و محبت کا سلوک کیا۔ ہمارے درمیان خط و کتابت کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ اشرف زبیری بھائی نے (ان کا یہی نام تھا) مجھے یہ مژدہ سنایا کہ وہ مجھ سے ملنے عنقریب بمبئی (ہندوستان) تشریف لا رہے ہیں۔ میں آنکھیں بچھائے منتظر تھی کہ اچانک ڈاک سے انگریزی میں اسکاٹ لینڈ سرکار کی جانب سے ایک خط موصول ہوا۔ جس نے میرے ہوش اڑا دیے۔ پتہ چلا کہ اشرف بھائی کار کے ایک بدترین حادثے میں اپنی جان گنوا بیٹھے مگر مرنے سے پہلے انھوں نے اپنی ساری جائداد جو ایک فیکٹری، ایک ذاتی مکان یا حویلی اور بینک بیلنس جو ایک بھاری رقم پر مشتمل تھا، میرے نام کر گئے ہیں۔ یہ اطلاع بھی دی گئی تھی کہ آپ جلد از جلد اپنا دعویٰ پیش کریں تا کہ اس کی منتقلی آپ کے نام کر دی جائے۔ فی الحال وہ اسکاٹ لینڈ پولس کی کسٹڈی میں ہے۔ میں نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ کچھ دنوں بعد پٹنہ سے مشہور افسانہ نگار عظیم اقبال کا خط بھی اسی ضمن میں موصول ہوا۔ اشرف بھائی کے کسی دوست نے جو عظیم اقبال صاحب کے بھی دوست تھے، میرے نام یاددہانی کروائی تھی۔ میں نے اس پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔ اور صاف صاف لکھ بھیجا کہ ''میں اشرف زبیری کی حقیقی بہن نہیں ہوں، اس لیے اپنے آپ کو ان کا حقیقی وارث نہیں سمجھتی اور جب میرا بھائی ہی اس دنیا میں نہیں رہا تو میں یہ دولت لے کر کیا کروں گی۔ بہتر ہوگا کہ یہ سب کچھ اس حکومت کے حوالے کر دیا جائے، جس ملک کے وہ شہری تھے۔'' مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ اور کس نے اس تمام اثاثے پہ قبضہ کیا۔ میں تو اس واقعے کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتی ہوں کہ یہ اردو زبان کی عالمی مقبولیت کا ہی سبب تھا جس نے دو مختلف سرزمینوں کے افراد کو ایک مقدس انسانی رشتے میں باندھ دیا۔ یعنی اردو زبان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ دلوں کو جوڑتی ہے۔ انسانوں کو انسانوں سے ملاتی ہے۔ انسانی دردمندی کو زندہ رکھتی ہے۔ نیز اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک فن پارے اور ایک صاحبِ قلم کے لیے قاری کا وجود کتنا ضروری ہے۔ ادب میں سے قاری کو منہا کر دیا جائے تو محض کاغذ پر لکھے گئے الفاظ باقی رہ جائیں گے۔ دنیا کی کسی بھی زبان کا ادب قاری کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

غ الف: اردو شعر و ادب کا مستقبل؟

رفیعہ شبنم عابدی: اگر قاری زندہ ہے اور اردو کے لکھاری کا دل دھڑک رہا ہے قلم سانسیں لے رہا ہے تو اردو شعر و ادب سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ زبانیں مٹ جاتی ہیں۔ لیکن وہ ادب جو دل کی زبان میں تخلیق پاتا ہے کبھی نہیں مرتا۔ پھر اردو تو ایسی زبان ہے جس کے مردہ ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ یوں سمجھ لیجیے اگر کرۂ ارض پر انسان باقی ہے تو اس کے جذبات و احساسات باقی ہیں۔ اس کے غم والم، اس کی امیدیں، ناامیدیاں، اس کی ناکامیاں کامرانیاں— غرضیکہ اس کی زندگی کی اچھی بری، تلخ شیریں سبھی حقیقتیں زندہ ہیں اور اردو شاعری اسی جذبے اور احساس کے اظہار کا نام ہے۔ حقائق زندگی کی اسی تشریح و تعبیر کا نام ہے۔ لہٰذا اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنا انسان کی بقا اور اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنے کے مترادف ہے۔ انسان زندہ ہے تو اردو شعر و ادب بھی زندہ رہے گا۔ لوگوں کی دھڑکنوں میں، ذہنوں میں، لفظوں میں، روزمرہ کی بول چال میں۔ آپ کتنے دلوں کی دھڑکنوں پر تالے لگائیں گے؟ کتنے ذہنوں کی سوچوں پر پہرے بٹھائیں گے؟ یہ تو وہ زبان ہے جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اربابِ سیاست کی ریشہ دوانیوں کے باوجود سیاسی ایوانوں میں، مذہبی اختلاف و منافرت کے باوصف مذہبی جلسوں اور محفلوں میں اور انسانی ترقی اور سائنس کے کارناموں کی اونچائیوں اور بلندیوں کے ساتھ ساتھ دور خلاؤں میں اردو شعر و ادب زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

غ الف: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی خدمات آپ کی نظر میں:

رفیعہ شبنم عابدی: قابل ستائش۔ اردو کے فروغ کی غرض سے غیر اردو داں حضرات کے لیے اردو کلاسز کا اجرا۔ اردو بولنے والے پس ماندہ افراد کی معاشی امداد کی خاطر کمپیوٹر کی سستی یا مفت تعلیم، کلاسیکی ادب کی اشاعت کے ذریعے تہذیبی بازیافت یا ماضی کے قیمتی ادبی فن پاروں کا اعادہ، مختلف علوم و فنون سے متعلق نیز تکنیکی کتابوں کی اردو میں اشاعت، تاریخی، سماجی اور معاشی موضوعات پر عہدِ حاضر کے معتبر اہلِ قلم اور اسکالرز کی تحریر کردہ کتابوں کو منظرِ عام پر لانے کا کارنامہ، ہندوستان اور دنیا کی مختلف زبانوں کے ترجمانی ادب کو اردو قاری تک پہنچانے کی کامیاب کوششیں اور سب سے بڑھ کر فارسی اور عربی زبانوں کی خصوصی تعلیمی و تدریسی کلاسیں اور ان زبانوں کا فروغ۔ کیونکہ اردو ان کے بغیر ادھوری ہے۔ عربی فارسی جانے بغیر اردو کا قاری نہ فیض کو سمجھ سکتا ہے، نہ اقبال اور غالب کو، نہ مولانا ابوالکلام آزاد اور رجب علی بیگ سرور کی نثر کو۔ ان تمام کارناموں کے لیے قومی کونسل کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے مگر 'ہنوز دلی دور است' کے مصداق قومی کونسل اور خصوصاً خواجہ اکرام سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ ابھی تک دلی میں اردو کو دوسری ریاستی زبان کا باضابطہ وہ حق نہیں ملا، جو ملنا چاہیے۔ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اردو شعبوں کا قیام، اردو اساتذہ کی باضابطہ اور ہر وقت تقرری، بینکوں، ریلوے اسٹیشنوں اور دیگر قومی اور سرکاری اداروں میں اردو کے استعمال کی سہولت، نیز تمام تعلیمی اداروں میں قومی سطح پر ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کو کمپوزٹ مضمون کی حیثیت سے لازمی قرار دیا جائے، اس بات کی کوشش ضروری ہے۔ میڈیا میں اردو کا فروغ اور زیادہ سے زیادہ اردو کا روزی سے رشتہ جوڑنا— اردو کے فروغ کے پیش نظر یہ اور ایسے بہت سے کام ہیں جو قومی کونسل انجام دے سکتی ہے اور یہ ہمت قومی کونسل کی مختلف کمیٹیوں اور خود خواجہ اکرام الدین کے ہاں نظر آتی ہے۔ اللہ رب العزت انھیں کامیاب کرے۔

■

Dr. Ghazanfar Iqbal, 'Saiban' Zubair Colony, Hagarga Cross, Ring Road, Gulbarga-585104 (K.S)

ف س اعجاز

بنگلہ اور اردو

جتنے دور اتنے پاس

'علاقائی زبان و ادب اور اردو' کے عنوان سے ترتیب دی گئی اس شمارے کی کور اسٹوری کا بنیادی مقصد ان لسانیاتی عوامل کی نشان دھی کرنا ھے جن کی بدولت کسی علاقائی وحدت میں بولی جانے والی مختلف زبانیں ایک دوسرے کا اثر قبول کرتی ھیں۔ اردو زبان و ادب اپنے ارتقا اور نشو و نما کی تقریباً ایک ھزار سال کی تاریخ میں جنوبی ایشیا کی مختلف علاقائی زبانوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر آگے بڑھی ھے۔ لسانیاتی لین دین کے اس طویل دور میں اردو نے علاقائی زبانوں سے بہت کچھ لیا ھے تو بھت کچھ دیا بھی ھے۔ زیرنظر مجموعۂ مضامین میں بنگلہ، مراٹھی، پنجابی، اڑیا، تلگو اور بھار کی علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو کے رشتوں اور باھمی اختلاط کے عمل کو مختلف پھلوؤں سے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ھے۔

جنوبی ایشیا میں ہندی اور اردو کے بعد سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان بنگلہ ہے۔ پاکستان سے کٹ کر ایک خودمختار ملک بن جانے والے بنگلہ دیش کی یہ قومی زبان ہے۔ اور ہندوستان میں مغربی بنگال کے علاوہ تری پورہ کی بھی سرکاری زبان ہے۔

اردو اور ہندی کے برعکس جب ہم بنگالی پر گفتگو کا آغاز کرتے ہیں تو اظہار خیال ایک بھاشا کی لسانی اور دستوری حیثیت تک محدود نہیں رہ جاتا بلکہ بات لازماً ایک مخصوص کلچر تک جا پہنچتی ہے جس کی ڈور سے' ظاہر ہے کہ اب' مغربی بنگال اور تری پورہ کے علاوہ بنگلہ دیش بندھے ہوئے ہیں۔ اور اس کلچر نے انیسویں اور بیسویں صدی میں مختلف سیاسی تحریکات کے زیر اثر کئی طرح کی جغرافیائی شکست وریخت کے صدمات کو سہنے کے باوجود اپنے صدیوں پرانے اتحاد کو برقرار رکھا۔ ہندو اکثریت والے مشرقی ہندوستان کے صوبہ مغربی بنگال کی یہ زندہ وتوانا زبان ہمارے پڑوسی مسلمان اکثریت والے ملک بنگلہ دیش کی ثقافتی حسیات سے حیرت انگیز طور پر اس حد تک پیوستہ ہے کہ اس نے کسی قوم میں اتحاد کے ضامن سب سے اہم عنصر مذہب کو دیگر عوامل سے کمتر ثابت کر دکھایا ہے۔ یعنی بنگالی بولنے والوں میں ان کا کلچر اور زبان باہمی اتحاد کی پہلی بنیاد ہے۔ مذہب کی حیثیت ثانوی ہے۔ بنگال کی متحدہ ثقافت اتنی طاقتور ہے کہ یہاں کے لوگ اپنی بھاشا پر کسی اور زبان کا غلبہ برداشت نہیں کرتے۔ خواہ اس کی امتیازی صفات کی جتنی بھی داد دے لیں۔ لہٰذا اس خطے میں بنگلہ کی لسانی برتری کو تسلیم کیے بغیر ہندوستان کی کوئی اور زبان اپنے نشو ونما کے لیے گنجائش نہیں نکال سکتی۔ مغربی بنگال میں ہندی اور اردو بھی بولی جاتی ہیں اور اردو زبان جو تحریک آزادی اور پورے شمالی ہند کے اتحاد کی بقا کے تاریخی شواہد اپنے ساتھ رکھتی ہے، اپنی کئی خوبیوں کی وجہ سے بنگالیوں میں قابل ستائش سمجھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود بنگالی قومیت کی جدید سیاسی تحریک نے اردو سے سامنا آرائی کی تاریخ مرتب کی ہے۔ اور اس سامنا آرائی کا محاذ مشرقی پاکستان میں 'بھاشا آندولن' کی شکل میں 1952 میں پہلی بار کھلا۔ دوسری بار یہ محاذ 1971 میں بدترین خونیں ہولی کھیلنے کے لیے پھر سرگرم ہوا جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان آزاد ہوکر بنگلہ دیش بن گیا۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان 1600 کیلو میٹر ہندوستانی زمین کی طوالت واقع تھی۔ پاکستان کا مرکز اقتدار مغربی پاکستان میں تھا۔ وہاں مقتدروں کا فیصلہ تھا کہ اردو نہ صرف مغربی پاکستان بلکہ مشرقی پاکستان کی بھی سرکاری زبان رہے گی۔

مشرقی پاکستان کو یہ قبول نہ تھا۔ اس صورت حال نے قومی بنگلہ تحریک کو جنم دیا۔ 1952 میں ڈھاکہ میں فسادات ہوئے۔ پاکستانی فوج کے ہاتھوں 12 طلبا میڈیکل کالج کے قریب مارے گئے۔ جب 1971 میں مشرقی پاکستان آزاد ہوکر بنگلہ دیش میں تبدیل ہوگیا تو بنگلہ میں 'جے' کا نعرہ لگایا گیا جو اردو کے معروف تاریخی نعرے 'زندہ باد' کا بدل تھا۔ 1972 میں باغی (بدروہی) بنگالی شاعر نذرالاسلام ہندوستان سے بنگلہ دیش منتقل ہوئے۔ (وہیں ان کا انتقال 1976 میں ہوا)۔ بنگلہ قومی تحریک آزادی سے بنگلہ۔ اردو کے قدیم خیر سگالانہ روابطہ متاثر ہوئے۔ حتیٰ کہ 1977 سے 2011 تک مغربی بنگال میں جو مارکسی حکومت رہی اس کے وزیراعلیٰ جیوتی باسو نے اردو کو مغربی بنگال کے چند ضلعوں اور سب ڈویژنوں میں دوسری سرکاری زبان بنانے کا نوٹی فکیشن تو جاری کر دیا لیکن وہ نوٹی فکیشن ایکٹ کبھی نہ بن سکا۔ موجودہ وزیراعلیٰ ممتا بنرجی کو اردو سے خاص لگاؤ رہا ہے۔ انھوں نے اپنی ڈیڑھ سال کی حکمرانی میں اردو کو مغربی بنگال کی ثانوی زبان بنا ڈالا، اُن کے در پردہ مقاصد چاہے کچھ بھی رہے ہوں۔

اِدھر بنگلہ دیش میں بھی اعلیٰ تعلیمی سطح پر ازسرنو اردو کے لیے راہ کچھ ہموار ہونے لگی ہے۔ یہ ایک خوش آئند رجحان ہے۔ موجودہ دور میں جب تہذیبوں میں عالمگیریت کا رجحان پنپتا نظر آرہا ہے ہم اسے ایک مثبت اشارہ قرار دے سکتے ہیں۔ کراچی یونیورسٹی میں بنگلہ اور ڈھاکہ اور راج شاہی یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جانے لگی ہے۔

مغربی بنگال میں بولی جانے والی زبان کو عموماً بنگالی اور سابق مشرقی بنگال/ مشرقی پاکستان یعنی موجودہ بنگلہ دیش کی بولی کو 'بنگلہ' کہا جاتا ہے۔ اس زبان کا مآخذ پراکرت ہے جس نے سنسکرت کا بھی اثر قبول کیا۔ دراوڑ و منگول زبانوں کے اثرات بھی بنگلہ (بنگالی) نے قبول کیے۔ مغربی اور مشرقی بنگال (یعنی بنگلہ دیش) کی زبانوں میں تلفظ کا تھوڑا بہت فرق اس طرح پایا جاتا ہے کہ مغربی بنگال پر دراوڑوں کا اثر زیادہ رہا جبکہ مشرقی بنگال نے منگولوں کا اثر زیادہ قبول کیا۔ اور اسی سبب سے 'مغربی بنگالی' میں غنائیت (Nasalization) 'مشرقی بنگالی' سے سوا پائی جاتی ہے۔ غیر آریائی اثرات بھی بنگلہ زبان پر پڑے۔ آریائی زبان کی مشرقی شاخ مگدھی پراکرت نے بہاری، اڑیہ، آسامی اور بنگلہ زبانوں کو جنم دیا۔ غالبًا ساتویں صدی میں جو زبان بنگال میں بولی جاتی تھی وہ مگدھی پراکرت کا بگڑا ہوا روپ (اَپ بھرنش) تھی۔ اندازہ ہے کہ ان میں سے بنگلہ زبان کے خدوخال دسویں صدی میں واضح ہونا شروع ہوئے۔

برصغیر میں جدید شمالی زبانوں کے تاریخی مآخذ ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ لسانی تشخص مقامی خطے اور رسم خط سے قائم ہوتا ہے۔ اردو اور بنگلہ کا قدیم تاریخی منبع اکثر جگہوں پر مماثل نظر آتا ہے لیکن ہند میں اسلام کی آمد اور مغلوں کی بود و باش اور حکمرانی نے اردو کو ایک منفرد زبان کے انوکھے سانچے میں ڈھال دیا جس میں اخذ و قبول کی صلاحیت کسی بھی دوسری ہند آریائی زبان سے بدرجہا زیادہ تھی (اور ہے)۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو نہ صرف ہندوستان اور اپنے بعض پڑوسی ملکوں بلکہ دنیا کے کئی اور خطوں میں منتشر اور پر پھیلائے ہوئے نظر آتی ہے۔ ہر چند کہ کئی زبانوں کی طرح بنگلہ زبان بھی اپنا ایک تشخص رکھتی ہے لیکن اردو کا تشخص اس کی مخصوص لامرکزیت میں ہے جو اس کی یونیورسل اپیل کا سبب ہے حالاں کہ وہ اپنا محدود جغرافیائی خطہ نہیں رکھتی۔

اردو کی طرح بنگلہ زبان نے بھی اپنے متعلقہ صوبہ جات میں بیرونی حملہ آوروں کے اثرات کو جذب کیا۔ 1200 عیسوی کے قریب بنگال نے اسلامی فتوحات کے ماتحت فارسی، عربی اور ترکی طرز نظم و نسق کو خوش آمدید کہا۔ مغل شہنشاہ اکبر کے ذریعے فتح بنگال

یہ سچ ہے کہ بنگلہ دیش کی زبان پر فارسی عربی کا اثر دین اسلام کی وجہ سے زیادہ پڑا ہے۔ مغربی بنگال ہندو اکثریت کا علاقہ ہے اس لیے یہاں کی ثقافتی زبان پر سنسکرت فیملی کے الفاظ کی مقدار زیادہ ہے۔ چنانچہ ثقافتی فرق دونوں طرف کی زبانوں میں اس طرح ظاہر ہوتے ہیں: گشُل کورا (غسل کرنا، بنگلہ دیش)۔ سنان کورا= چھاند کورا = نہانا (مغربی بنگال)۔ پانی (بنگلہ دیش)۔ جول (جل، مغربی بنگال)۔ دادا (باپ کاباپ، بنگلہ دیش)۔ دادا (بڑا بھائی، مغربی بنگال)۔

کے بعد بنگلہ زبان میں فارسی الفاظ کے قابل لحاظ ذخیرے کا اضافہ ہوا۔ آج ان فارسی لفظوں میں سے بہت سارے الفاظ متروک ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود تقریباً تین ہزار قدیم فارسی الفاظ بنگلہ زبان میں مستعمل ہیں۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں پرتگال اور فرانس کے لوگ ہندوستان آئے اور اس مشرقی خطے میں متمکن ہوئے۔ بنگلہ لغت میں ان کی وجہ سے الفاظ کا اضافہ ہوا۔ کئی یونانی الفاظ بھی بنگلہ میں رائج ہوئے۔ بنگالی لغت میں انگریزی لفظیات کا تناسب ایک فی صد بتایا جاتا ہے۔ بنگلہ زبان کے خارجی زبانوں کے اخذ و قبول کے اسی معتدل رویے کی بدولت اردو کے ذریعے فارسی، عربی، ترکی و دیگر زبانوں کے الفاظ بنگلہ میں ضم کر لیے ہیں۔

بنگلہ زبان کا خط دیوناگری سے مماثل ہے اور اُسی کی طرح بائیں سے دائیں لکھا جاتا ہے۔ برسرِ حرف ایک لکیر بھی اسی طرح کھینچی جاتی ہے۔ پرانی بنگلہ پالی سے زیادہ قریب تھی، بعد کو سنسکرت سے بنگلہ کی مماثلت میں اضافہ ہوا۔ اردو بنگلہ کا رابطہ 18 ویں صدی کے بعد مغلیہ اور انگریزی حکومتوں کے عہد میں قائم ہونا شروع ہوا۔ چونکہ ہندی اور اردو بولیوں میں زیادہ فرق نہیں پایا جاتا سوائے اس کے کہ ہندی میں سنسکرت اور اردو میں عربی و فارسی کی آمیزش زیادہ رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بنگلہ زبان کا خط صدیوں قبل تیار ہو چکا تھا لیکن گرامر 18 ویں صدی سے پہلے تیار نہیں کی گئی تھی۔ 1778 میں ایک انگریز گرامر ساز Nathaniel Brassey Halhed نے اوّلین بنگلہ گرامر لکھی اور بنگلہ ٹائپ میں اسے چھاپا۔ جبکہ اردو گرامر صدیوں پہلے تشکیل پا چکی تھی۔ جب 19 ویں صدی میں بنگلہ زبان کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہونے لگا تو راجہ رام موہن رائے اور ایشور چندر ودیا ساگر نے بنگلہ میں لسانی و قواعدی اصلاحات کو تیز تر کر دیا۔ یہ دونوں بنگالی مصلحین اسلام اور مروجہ فارسی و اردو زبانوں کے پرستار تھے۔ لہٰذا انھوں نے بنگالی کلچر کو بھی اپنی پسندیدہ اقدار سے متعارف کرایا۔

ودیا ساگر نے اپنی کتاب 'برنو پریچے' میں 'سادھو بنگلہ' کو فروغ دیا جس میں 'تَت سم' (یعنی پورے موزوں و مکمل) الفاظ کی کثرت تھی۔ زبان کی دوسری نوعیت 'چلتی بھاشا' یا 'چلِت بنگلہ' تھی جس میں 'تدبھَو' (یعنی بگڑے ہوئے یا اپ بھرش سنسکرت) الفاظ کا ذخیرہ زیادہ تھا۔

یہاں تک ایک زبان کے دوسری زبان سے متاثر ہونے کی تاریخ کا مختصر معروضی جائزہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد سے بنگالیوں کا اردو سے چاہت کا اور اردو اختیار کرنے کا دور شروع ہوتا ہے جس کا ایک سنگِ میل اوّلین اردو پریس کا قیام اور پہلے اردو اخبار 'جام جہاں نما' کا اجرا ہے جو پنڈت ہری ہر دت اور سدا سکھ لال کے ذریعے کلکتہ سے 1822 میں ہوا۔ اسی سال میں پہلا فارسی اخبار 'مراۃ الاخبار' کلکتہ سے راجہ رام

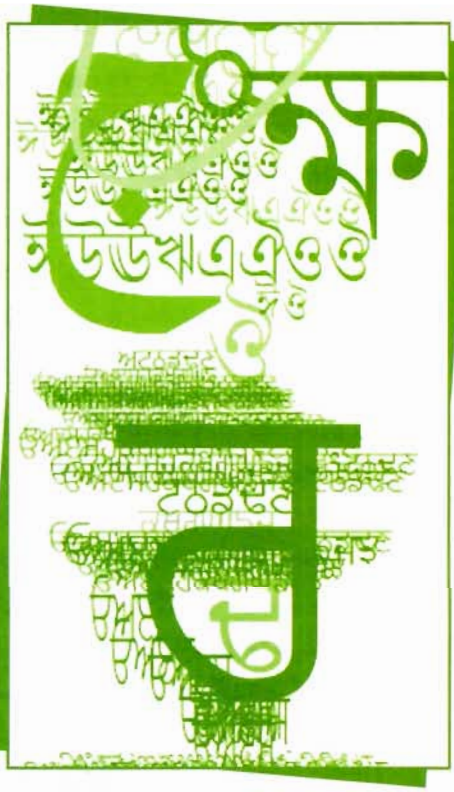

موہن رائے نے نکالا۔ پیشتر 1800 میں گورنر جنرل لارڈ ویلزلی نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی۔ ڈاکٹر جان گلِکرسٹ کالج کے ہندوستانی شعبے کے صدر تھے۔ کالج تو 1854 تک قائم رہا مگر اس کی سرگرمیاں 1828 میں ختم ہوچکی تھیں۔ 1803 سے کالج کی طرف سے اردو کتابیں چھپنا شروع ہوئیں۔ اس زاویے سے کلکتہ کو اولیت حاصل ہے۔ کیونکہ 1837 سے قبل لکھنؤ، دہلی اور کانپور میں سے کہیں کسی اردو چھاپہ خانے کا سراغ نہیں ملتا۔

فورٹ ولیم کالج میں لکھنؤ سے لاہور تک کے ماہر انشا پردازوں کو مدعو کیا گیا تھا جنھوں نے اپنے نثری کارناموں کے ذریعے اردو کو پہلی بار ایک باضابطہ علمی زبان بنا ڈالا۔ ’چہار درویش‘، ’قصہٗ حاتم طائی‘ اور ’گل بکاؤلی‘ کے علاوہ مختلف تذکروں، تاریخ، فلسفہٗ اسلام، قرآن، تورات، انجیل وغیرہ کے تراجم یہاں ہوئے۔ گرچہ یہ علمی مشن فرنگیوں نے انجام دیا لیکن یہ بات کم اہم نہیں کہ یہ مشن بنگالی سماج میں انجام پایا۔ اسی کلکتہ میں مئی 1856 میں یعنی غدر سے ایک سال پہلے لکھنؤ سے واجد علی شاہ کو جلاوطن کر کے مٹیا برج میں لارکھا گیا۔ شاعر بادشاہ تہذیب وثقافت کا نمائندہ تھا۔ قلعہٗ فورٹ ولیم میں دوسالہ نظر بندی کے دوران واجد علی شاہ اختر نے مثنوی ’حُزن اختر‘ لکھی۔ لکھنؤ سے اس کے ساتھ تقریباً 500 ماہرین، خواص، درباری اور خدمت گار کلکتہ پہنچے۔ متعاقب برسوں میں ان کے ذریعے اردو اور اودھی تہذیبی نقوش ٹھمریوں اور سنگیت سمیت بنگال کی متواضع راجدھانی کلکتہ کے دل ودماغ پر مرتسم ہوئے۔

بنگلہ نثر اردو نثر کی پیش رو کہی جاسکتی ہے کیونکہ بیسویں صدی کے رُبع اوّل میں جب بنگالی نظم ونثر کا اردو میں ترجمہ شروع ہوا اُس وقت اردو افسانہ جنم لے رہا تھا۔ یلدرم اور نیاز فتحپوری دیگر زبانوں سے اردو میں کہانیوں کا ترجمہ کر رہے تھے اور خود کہانیاں لکھتے بھی تھے۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ جب اردو افسانہ داستان کے بطن سے پیدا ہو رہا تھا اس وقت بنگالی کہانی عروج حاصل کرنے لگی تھی۔ بنکم چندر چٹرجی، شرت چندر چٹرجی، رابندر ناتھ ٹیگور کی کہانیاں اردو میں ترجمہ ہوکر خود افسانہ خیز ثابت ہونے لگی تھیں۔ ٹیگور کا نوبیل انعام یافتہ ’گیتا نجلی‘ نظموں کا ترجمہ کسی غیر انگریزی زبان میں سب سے پہلے اردو میں نیاز فتحپوری نے کیا۔ (اب تک ’گیتا نجلی‘ کے اردو میں کئی ترجمے ہوچکے ہیں)۔ ٹیگور کے کئی افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے بھی ترجمے ہوچکے ہیں۔ ترجمہ اور کبھی کبھی فلم کے ذریعے ہم کئی بنگالی ناول نگاروں کے کاموں سے واقف ہوئے ہیں جن میں ٹیگور، تارکیشور بنرجی، بھوتی بھوشن بندوپادھیائے، پریمندر مترا، بالائی چند مکھوپادھیائے (بن پھول) بمل کار، بمل مترا سے لے کر عہد جدید کی مہاشویتا دیوی، سمریش باسو، شکتی چٹوپادھیائے، سنیل گنگوپادھیائے، سمریش مجمدار، سرشیند ومکھوپادھیائے کے علاوہ اور کئی نمایاں نام شامل ہیں۔ اردو ہی کیا بنگلہ فکشن کی طاقت اور اثر کا ہر زبان کے قارئین اعتراف کریں گے۔ جاری سال 2013 کے اوائل میں دہلی میں ساہتیہ اکادمی نے پہلی بار جدید بنگالی افسانوں کا اردو میں ترجمے کا ایک بڑا ورکشاپ راقم کی کنویز شپ میں منعقد کیا جس کا حاصل ایک کتاب کی شکل میں اکادمی عنقریب شائع کرے گی۔

بنگالی لوگ خصوصاً مغربی بنگال کے باسی اردو شاعری کے دلدادہ ہیں۔ نظمیں سنتے ہیں لیکن غزلیں (ادبی اور فلمی دونوں) گانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کلاسیکی سنگیت بیرون بنگال زوال آمادہ سہی، بنگال میں ابھی برقرار ہے۔ برسوں یہاں موسیقی پر غزلوں کے کنسرٹ ہوتے رہے ہیں۔ ہاں فی الحال غزل کی لہر جوش میں نہیں ہے۔ ماضی میں ہندوستان ریکارڈ کمپنی، ایچ ایم وی، پولی ڈور وغیرہ اس خطّے کو اپنی غزلیہ وٹھمری پیشکشوں اور مارکیٹنگ کے لیے بہت اہم سمجھتی تھیں۔ کے ایل سہگل، پنکج ملک، طلعت محمود، کملا جھریا، بیگم اختر، دُگل نندی غزل کے میدان میں ایچ ایم وی کے ذریعہ بنگال سے جُڑے ہوئے تھے۔ ہزاروں بنگالی شائقین بیگم اختر طلعت محمود، مہدی حسن، غلام علی، جگجیت اور چترا، پنکج ادھاس، انوپ جلوٹا، راجندر اور نینا مہتا وغیرہ کے پروگرام سننا پسند کرتے تھے۔ غالب، میر، مومن، ظفر، اقبال، داغ، حسرت موہانی، امیر مینائی سے لے کر ناصر کاظمی، سدرشن فاکر، ندا فاضلی، بشیر بدر وغیرہ کی غزلیں میوزک پر سنی جاتی ہیں۔

موجودہ دور میں اردو لفظیات سمیت غزل کا رنگ لیے ہوئے جدید بنگالی گیت لکھے جانے لگے ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور اپنے باپ دیبندر ناتھ کے توسط سے مولانا رومی اور حافظ شیرازی کے افکار وشعریات سے متاثر تھے لیکن قاضی نذر الاسلام نے بنگلہ میں بطرز اردو تقریباً 100 غزلیں بھی کہی ہیں۔ محمد رفیع کی گائی ہوئی ان کی یہ بنگلہ غزل بہت مشہور ومقبول ہے:

(1) الگا کورو کھوپار بادھن دل وہی میرا فس گئی
بِنود بینیسر زرین فیتائے اندھا عشق میرا فس گئی

(2) تُمار کیشیر گوندھے کوُھن لُکائے آشی لوبھی امار مون
بے ہوش ہوکر گر پڑی ہاتھ میں بازو بند میں فس گئی

(3) کانیر دُولے پران راکھی لے بیندیا آنکھ پھر دیا چوری کر نیندیا
دیہیر ڈیوڑھی تے بیڑاتے آشیا آر نہیں وہ واپس گئی

معنی

(1) جُوڑے کا بندھن کھول دو، دل میرا وہیں پھنس گیا۔
زرّیں فیتے سے لپٹا بینی کا گجرا ہے، میرا اندھا عشق اسی میں پھنس گیا۔

(2) تمہارے گیسو میں کب گوندھ پائے گا، میرا لوبھی من تاک آتا ہے
بے ہوش ہوکر گر پڑیں ہاتھ میں، بازو بند میں پھنس گئیں۔

(3) کانوں کی بالیوں نے جان رکھ لی، آنکھیں باندھ لیں، نیند چُرالی
جسم کی ڈیوڑھی پر وہ گھومنے آئی، پھر کبھی نہیں وہ واپس گئی۔

قاضی نذر الاسلام کی دو اور بنگالی غزلوں کے مطلعے نقل کیے جارہے ہیں:

(1) گُل باگیچائے بُلبلی امی رونگین پریمیر گائی غزل
انوراگے لال شراب مور آنکھی جھولے جھولمل [ہائے]

(2) چیونا سِنائیونا، آرچیونا ایۓ نین پانے
جانی تے نائی کو باکی سُواِی اوآنکھی کی جادو جانے

معنی

(1) باغیچے کا میں گُل، رنگین بلبل ہوں، پریم کی گاتا ہوں غزل
انوراگ کی سرخ شراب میری آنکھیں، کرتی ہیں جھل مَل [ہاۓ]

(2) مت دیکھوسندر نین، اورمت دیکھواُس نین کی جانب
اب کچھ جاننا باقی نہیں رہا، اُن آنکھوں کی محبت وہ جادو جانتی ہے

شاعری کا ترجمہ شاعری میں بہت مشکل ہوتا ہے جنوری فروری 2012 کا 'ماہنامہ انشا' اس لیے بہت اہم تھا کہ اس میں اردو میں پہلی بار رابندرسنگیت گیتوں کا رابندرسنگیت میں ترجمہ ایک گوشہ کی شکل میں شائع ہوا تھا جس کا اجرا باوقار فلم ہدایت کار گوتم گھوش نے یکم جنوری 2012 کو گیان منچ کلکتہ میں کیا تھا۔ میں نے سولہ رابندرسنگیت نغموں کا ترجمہ کیا تھا جن میں سے میرا خیال ہے تیرہ ترجمے ٹیگور کی اصل دھنوں کے بہت زیادہ قریب تھے جس کا اعتراف رابندرسنگیت کی ماہر ترجمہ کار جلج بہادری نے ایک پروگرام میں کیا۔ (جلج بہادری نے سیکڑوں رابندرسنگیت کا آسامی، اڑیہ، ہندی اور کئی دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا ہے)۔

ایک رابندر گیت کے اپنے ترجمے کا یہاں حوالہ دے رہا ہوں جسے فوراً ٹیگور کے اردو میں ترجمہ کیے گئے ایک ڈرامہ میں سنگیت پر استعمال کرلیا گیا:

بنگالی گیت کا مُکھڑا:

کاندھا لے تُمی مورے بھالو باشاری گھائے
نبیٹر بیدوناتے پُلوک لاگے گائے

اسی گیت کے صرف ایک ٹکڑے کا ترجمہ:
''تونے ایسی الفت جتائی مجھ کو رُلا دیا

....

اِس دکھ میں بے حد مٹھاس ہے، میرا سب کچھ تیرے پاس ہے
تونے سب کچھ میرا چھین لیا، اب کچھ بھی کہاں میرے پاس ہے
میں پوری طرح تیرے بس میں ہوں
یہ کیسے پیش و پس میں ہوں
آزاد نہ ہونا چاہے من، ہے جانے کیسا یہ بندھن
تونے کس بندھن میں باندھ لیا!''

اس کے بعد 2012 میں مجھے ٹیگور کے لکھے ہوئے بھارت کے پورے قومی ترانے 'جن گن من' کا اردو میں ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور 'بھارت بھاگیہ ودھاتا' سے متعلق ایک تحقیقی مضمون بھی لکھا۔ 2010 میں انشاء کا ٹیگور نمبر شائع کیا۔

مغربی بنگال میں بنگلہ اور اردو زبانوں میں مراسم کے فروغ کے واقعی یہ اچھے دن ہیں۔ انھی دنوں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی نے مرکزی وزرات ثقافت کے تحت ٹیگور کی تحریروں کے تراجم اور ان کی حیات اور فن سے متعلق ایک بڑے پروجکٹ کی تکمیل کی ہے۔ پروفیسر خالد محمود، شہزاد انجم اور ان کے رفقا نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے دہلی اور کلکتہ میں اس منصوبے کو کامیابی سے مکمل کیا ہے۔

اس موقع پر ہم ایک نہایت سادگی پسند ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹرجی کی یادیں بھی تازہ کرنا چاہیں گے جو اردو کے بڑے ہمنوا اور پرستار تھے۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ مرحوم کی منفرد تحقیقی و تصنیفی کاوشوں کو بھی ہم فراموش نہیں کرسکتے جو بنگلہ۔ اردو دوستی اور باہمی خیر سگالی کی راہ میں روشن چراغوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبدالصمد، گلزار وغیرہ کی کہانیوں کا بنگلہ میں ترجمہ ہوا ہے۔ بعض کلاسیکی و جدید اردو شعرا کی منتخب شاعری بھی بنگلہ میں ترجمہ کی گئی ہے۔ اردو تنقید سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی معرکۃ الآرا تصنیف 'ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات' کا ترجمہ لائق و فائز ادیبہ سوما بندو پادھیائے نے بنگلہ میں کیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ بنگلہ دیش کی زبان پر فارسی عربی کا اثر دین اسلام کی وجہ سے زیادہ پڑا ہے۔ مغربی بنگال ہندو اکثریت کا علاقہ ہے اس لیے یہاں کی ثقافتی زبان پر سنسکرت فیملی کے الفاظ کی مقدار زیادہ ہے۔ چنانچہ ثقافتی فرق دونوں طرف کی زبانوں میں اس طرح ظاہر ہوتے ہیں: گُشُل کورا (غسل کرنا، بنگلہ دیش)۔ سنان کورا= چھاند کورا = نہانا (مغربی بنگال)۔ پانی (بنگلہ دیش)۔ جول (جل، مغربی بنگال)۔ دادا (باپ کا باپ، بنگلہ دیش)۔ دادا (بڑا بھائی، مغربی بنگال)۔

عام واقفیت کے لیے ذیل میں میں کئی ایسے بنگالی الفاظ درج کررہا ہوں جو اصل اردو یا فارسی کے متبادل ہیں۔ ملاحظہ کیجیے کہ اردو تلفظ میں ذرا سی تحریف یا بگاڑ کے ساتھ یہ الفاظ کس سہولت کے ساتھ بنگلہ میں برت لیے جاتے ہیں:

جَھنوک = جھنک	جِھلک = جَھلک	دِماگ = دماغ
ماملا = معاملہ	میج = میز	پھرمان = فرمان
کُبالا = قُبالہ	جاری = جاری	باطل = باطل (بمعنی رد)
جرا = جرح	کُھشی = خوشی	گرپھتار = گرفتار
حاکم = حاکم	منصف = منصف	چیہرہ = چہرہ
پھوئیسلہ = فیصلہ	ایکین = یقین	درکھاست = درخواست
حشاب = حساب	جادو = جادو	کھارِج = خارج
جامِن = ضامن	تابیج = تعویذ	مدروشہ = مدرسہ
رجوان = رضوان	شوریفہ = شریفہ	آلّا تالا = اللہ تعالیٰ
کُران = قرآن	پوئگمبور = پیغمبر	لوئیلا = لیلیٰ
پا = پا	کیس یا کیش = گیس یا گیسو	میجان = میزان
تیراجو = ترازو	باسی یا باشی = باشندہ	کُھون = خون
کولوم = قلم	کاگوج = کاغذ	گجول = غزل
کاجول = کاجل	جاہد = زاہد	چاندا = چندہ
روشید = رسید	نجور = نظر	اِجّوت = عزت

واضح رہے کہ میں نے اس مضمون کے ذریعے تاریخی تناظر میں بنگلہ اور اردو کے مابین دوری اور قربت کا معروضی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

◘

Fe Seen Ejaz, Editor 'Mahnama Insha'
25-B, Zakaria Street, Kolkata-700073

ستاروں کے جھرمٹ یہ موتیوں سے ہیں
جو ہے دھوپ خوشبوئے کہسار بھی ہے
تو جھونکے ہوا کے چنور کر رہے ہیں
نباتات میں پھول بے غم سماں ہیں
تیری آرتی میں یہ سب خود لگے ہیں 4

ڈاکٹر نقوی کے مطابق ''شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر کے بارے میں محمود شیرانی نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ خواجہ برہان الدین کی والدہ نے جب اپنے بیٹے کو بابا فرید کی بیعت میں دیا، تو انھوں (والدہ) نے بابا فرید سے کہا ''خوجا برہان الدین بالا ہے۔'' یعنی کم عمر ہے، تو بابا نے فرمایا ''مادر مومناں، پونوں کا چند بالا ہوتا ہے۔''

پنجاب اور اردو: آگے ڈاکٹر نقوی لکھتے ہیں ''اس گفتگو سے یہ واضح ہے کہ بارہویں صدی عیسوی میں اردو بول چال کی زبان بن چکی تھی۔ ادھر بابا فرید ایک صوفی شاعر بھی تھے، انھوں نے اردو کو بالواسطہ طور پر جو ترقی دی، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔''5

شیخ فرید کی تمام شاعری عربی، فارسی، اردو اور پنجابی الفاظ سے مملو ہے۔

شیخ فرید کے ہی ہم عصر صوفی مذہب کے نمائندے حضرت امیر خسرو کی ہندوی یا ہندی زبان سے ہی آگے چل کر اردو زبان کا بتدریج ارتقا ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ایک عوامی قصے کے مطابق اپنے مرشد سلطان الاولیا حضرت نظام الدین کا جسد خاکی دیکھ کر خسرو اپنا ہی یہ دوہا کہتے ہوئے بے ہوش ہو کر وہیں پر گر پڑے تھے:

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چھوں دیس

غور سے دیکھنے پر اگر اس مصرعے میں شروع کی دہلوی زبان یعنی ہندوی کے الفاظ کے ساتھ 'مکھ' جیسا سنسکرت زبان کا اصل لفظ ہے، تو اسی زبان کے اصل الفاظ گور، شیآ، کیش، گرہ، سندھیا اور دیش سے اشتقاق شدہ گوری، سیج، کیس، گھر، سانجھ اور دیس ... یہ تمام الفاظ ہندی واس کی بولیوں سے وابستہ ہیں۔

پنجاب میں ہی اردو زبان کی پیدائش ہوئی ہے، یہ بیان محقق جناب محمود شیرانی کے بعد ڈاکٹر ناشر نقوی کا ہے، اگر چہ اس تحقیق سے کسی عالم و فاضل محقق کو اختلاف ہوسکتا ہے اور یہ مدعا موضوع بحث بھی ہوسکتا ہے، تاہم دونوں زبانوں کے باہمی رشتوں کے ضمن میں علما و فضلا کے

گنڈا سنگھ مشرقی سے لے کر آج راجیندر ناتھ رہبر اور ڈاکٹر نریش تک پنجاب کے لاتعداد شعرا نے اردو شاعری میں همه گیر مقبولیت حاصل کی هے اور ان کی شاعری میں اردو اور پنجابی کا امتزاج هے اور دونوں کا هی آمیزه دستیاب هوتا رهتا هے۔ یه دونوں زبانیں لاکھوں لوگوں کو متاثر مسرور و مسحور کرتی چلی آ رهی هیں۔ زبان کے علاوه تهذیب و تمدن دونوں هی پیمانوں پر پنجاب اور اس سے باهر کے لا تعداد شعرا کی شاعری آج تک عربی فارسی، اردوا ور پنجابی کے باهمی رشتے کی خط کشی کرتی آ رهی هے۔

دلائل پر نظر ثانی کرنے کی سعی کی جارہی ہے۔

پاکستان کے عالم و فاضل اور شاعر ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی کہا تھا۔ ''پنجاب کے کلچر کے بنیادی عناصر میں رواداری، مذہبی اور سماجی سطح پر ایک دوسرے کے خیالات و جذبات کا احترام بلاتفریق ملت ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شرکت وسیع النظری، کشادہ قلبی، زندگی کو جی بھر کے جینے کی خواہش، روحانی ارتفاع و جلال اور جسمانی شکوہ و جمال شامل ہیں۔''6

ڈاکٹر ناشر نقوی کا بھی خیال ہے۔ ''اردو کی ہر ترقی پسند تحریک اور روش کے تانے بانے پنجاب ہی میں مربوط نظر آتے ہیں۔ اردو نے پنجاب کی تہذیب، یہاں کے رسم و رواج، یہاں کے عوامی مزاج، ان کی متنوع زندگی کی ترجمانی بھی کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں پنجاب کے جوہر نے ایک طرف تو خود کو پنجابی زبان میں اور دوسری طرف اردو زبان میں منعکس کیا ہے۔ اس لیے دونوں زبانوں کی ادبیات میں اگر کوئی فرق ہے، تو وہ جوہر کا نہیں، بلکہ پیمانوں کا ہے، جن میں اس جوہر کو پیش کیا گیا ہے۔''7

سردار گنڈا سنگھ مشرقی کے بعد پنجاب میں لاتعداد ادبا نے ادب کی مختلف اصناف نثر نظم پنجاب ریاست کی تہذیب و تمدن کو بھی پیش کیا ہے۔ پنجابی قصوں اور رسم و رواجوں کی عکاسی کی ہے۔ مختلف اصناف ادب سے منسلک ادیبوں و شاعروں چند نام قابل ذکر ہیں مثلاً سردار بدھ سنگھ، مولانا حالی پانی پتی، مولانا وحیدالدین سلیم، علامہ اقبال، پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ، اودے سنگھ شائق، سعادت حسن منٹو، تلوک چند محروم، راجیندر سنگھ بیدی ساحر لدھیانوی، مالک رام، گوربخش سنگھ مخمور، فیض احمد فیض، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، جوش ملسیانی، پنڈت میلا رام وفا۔ پنڈت رتن پنڈوروی، بلونت سنگھ، کلونت سنگھ جانی، کرپال سنگھ بیدار، نوبہار صابر، تخت سنگھ، پورن سنگھ ہنر، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، شرون کمار، جوگندر پال، جگر جالندھری، ڈاکٹر آزاد گلاٹی، پریم وار برٹنی، سدرشن فاکر، ست نام سنگھ خمار، ڈاکٹر ناشر نقوی، ڈاکٹر نریش، کرشن ادیب، کرشن بیتاب، مہیش پٹیالوی، ڈاکٹر امرجیت سنگھ ساگر، امرت پال سنگھ شیدا اور ان کے علاوہ بھی بے شمار شعرا و ادبا ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے تحریر کیا ہے'' جب پنجاب کا ادیب اردو زبان میں لکھتا ہے، تو اپنی جنم بھومی کی ساری بو باس، مزاج اور لہجے کو اردو میں منتقل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔''8

راجیندر سنگھ بیدی نے از خود یہ اہم بیان دیا ہے کہ ''میرا ماحول پنجابی ہے اور میں پنجابی اردو لکھتا ہوں، تو کوئی قصور نہیں کرتا، بلکہ اپنے خلوص کا ثبوت دیتا ہوں۔''9

پروفیسر آزاد گلاٹی نے بھی اپنے مضامین کے ایک مجموعے 'اذکار' میں کہا ہے۔ ''سچ تو یہ ہے کہ پنجاب اپنی تمام تر ثقافتی توانائی اور برنائی کے ساتھ اردو کی رگ رگ میں جاری ساری ہے۔''10

ڈاکٹر ستنام سنگھ خمار پنجابی یونیورسٹی میں محکمۂ نفسیات کے چند برس صدر رہے تھے اور ایک بلند پایہ شاعر بھی مانے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے مضمون 'ادب اور ادیب' میں پنجابی اور اردو زبان کے باہمی تعلق کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ''سکھ لوگوں کی شخصیت کا شعری اور ادبی اور کشادہ دلی کا پہلو ابھر کر

کرشن بھاوک

اردو اور پنجابی

اتحاد اور امتزاج

پنجاب: سب سے پہلے لفظ 'پنجاب' کو دیکھیں تو اس میں جو 'پنج' ہے، اس کا ماخذ سنسکرت لفظ 'پنچ' ہے، جس کی تبدیل یا اشتقاق شدہ صورت ہی 'پنج' ہے۔ آج یہ لفظ خالص پنجابی ہی مانا جاتا ہے۔ اسی لفظ میں لاحقہ لفظ 'آب' خالص فارسی زبان کا مذکر لفظ ہے اور دونوں الفاظ کے مرکب سے 'پنجاب' کے مرتب لفظ کی تشکیل ہوتی ہے۔ کہنے کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستاں کی اس بے حد اہم ریاست کے نام میں ہی پنجابی و اردو زبانوں کی جاذب نظر آمیزش ہے۔

اردو: لفظ 'اردو' بھی قومی اور لسانی اتحاد کا مظہر ہے۔ پنڈت دتا تریہ کیفی نے لکھا ہے۔ ''اردو دو لفظوں سے مرکب ہے، سنسکرِت میں 'اُر' کے معنی 'دِل' ہیں اور فارسی میں 'دوٗ' کے معنی 'دوٗ' تحریر کیے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے اردو دو دلوں کے اتحاد اور قومی اور لسانی ملاپ کی نشان دہی کرتی ہے۔''1

سکھ مذہب اور اردو زبان: پنجابی زبان کی عظیم کتاب ''شری گورو گرنتھ صاحب' سکھ مذہب قابل احترام کتاب ہے۔ اس کو گورو گوبند سنگھ نے از خود 'گوروٗ' ('گورو مانیو گرنتھ') کا درجہ دے کر دنیا بھر میں ایک نایاب و مفصّل مثال قائم کی تھی۔ اس مذہب کا اردو زبان سے ایک ناگزیر و لازمی ناتا ہے۔ ڈاکٹر ناشر نقوی نے پنجاب میں اردو زبان کے سردار گنڈا سنگھ مشرقی کو اول عظیم 'صاحبِ دیوان سکھ شاعر' صحیح اعلان کیا ہے۔ لالہ لاجپت رائے کو حب الوطنی کی تعلیم دینے والے اس عالم فاضل و بلند پایۂ شاعر نے متعدد مذہبی وتنقیدی مضامین تحریر کر کے پنجابی کے ساتھ اردو زبان کی بھی نا قابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا فقط ایک ہی مخمس یہاں بطور نمونۂ کلام پیش ہے۔ اسی سے اردو اور پنجابی کی مشترکہ ہیئت و اسلوب کو نشان زد کیا جا سکتا ہے۔ اس میں سکھ مذہب کے بانی گورو نانک دیو کے فرمودات درج ہیں اور ان کی تعریف کی گئی ہے اور اس کی مشابہت اردو کے مدحیہ کلام سے بھی کی جا سکتی ہے۔ 'واہِ گوروٗ' محترم لفظ کا یہ تصرف تمام دنیا کی شاعری میں لاثانی مثال ہے: ''اے شاہِ نانک کر سکوں میں کیا تیری حمد و ثنا، گمراہ جب عالم ہوا، آ کر ہوا تو رونما، ہے جلوۂ نورِ خدا جلوہ ترے دیدار کا، روئے مقدس جب ترا دیکھا، ملایک نے کہا۔

''واہِ گورو، واہِ گورو، واہِ گورو، واہِ گوروٗ''!2

اسی طرح سکھوں کے حوصلہ افزائی نعرے یا مقدس

اور پاک قول کے طور پر بولے جانے والے یہ الفاظ 'واہِ گورو جی کا خالصہ واہِ گورو جی کی فتح' میں بھی 'خالصہ' اور 'فتح' یہ دو الفاظ بھی عربی اور فارسی زبان سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ عربی زبان کا لفظ 'خالص' بھی پاک، صاف، بے عیب وغیرہ معنی میں ہی ہے، جس سے اشتقاق شدہ 'خالصہ' لفظ کو ہی گورو صاحبان نے ایسی فطرت والے فرقے یا قوم کے لوگوں کے لیے محفوظ کر دیا تھا اور تا حال چلا آ رہا ہے۔ اس نعرے وقول میں قابلِ غور الفاظ 'کا' اور 'کی' بھی ہیں، جو پنجابی زبان کے 'دا' اور 'دی' ان دو الفاظ کی جگہ دانستہ مستعمل ہوئے ہیں۔ اسی عقیدت آمیز اور پاک قول کی زبان میں پنجابی، عربی اور فارسی کے توسط سے اردو زبان کا خوبصورت گوناگوں امتزاج بھی قابلِ دید و داد ہی کہا جائے گا۔

گنڈا سنگھ مشرقی سے لے کر آج راجیند رناتھ رہبر اور ڈاکٹر نریش تک پنجاب کے لاتعداد شعرا نے اردو شاعری میں ہمہ گیر مقبولیت حاصل کی ہے اور ان کی شاعری میں اردو اور پنجابی کا امتزاج ہے اور دونوں کا ہی آمیزہ دستیاب ہوتا رہتا ہے۔ یہ دونوں زبانیں لاکھوں لوگوں کو متاثر مسرور و مسحور کرتی چلی آ رہی ہیں۔ زبان کے علاوہ تہذیب و تمدن دونوں ہی پیمانوں پر پنجاب اور اس سے باہر کے لا تعداد شعرا کی شاعری آج تک عربی فارسی، اردو اور پنجابی کے باہمی رشتے کی خط کشی کرتی آ رہی ہے۔ اس سے قبل مختلف مذاہب میں یگانگت و اتحاد کی بابت چند علما و فضلا کی آرا سے واقف ہونا لازمی ہے۔

ڈاکٹر ناشر نقوی کی یہ رائے بھی خاصی مدلل ہے کہ ''درحقیقت سکھ مت کی بنیاد ہے توحید کی تلقین، اور توہم پرستی، بت پرستی اور شرکت کی مخالفت۔' آگے'' شری گورو گرنتھ صاحب میں درج جذبات کی بابت اپنا یہ خیال بھی رقم کرتے ہیں کہ ''ان سنتوں کے کلام میں بھی عبوری دور کی وہ اردو موجود ہے، جو اس کے عہد کے دوسرے شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔3

شری ودیا ساگر آنند نے اپنی نظم 'گورو نانک' (دیو جی کی بانی) میں گورو نانک دیو جی کی مدح کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔

''تمھاری بانی کا چرچا جو عام ہو جائے، تو اس کے سنتے ہی راون بھی رام ہو جائے تیرے گرنتھ کا آنند جہاں بسیرا ہے، اکال پرکھ کا واں سب کے دل میں ڈیرا ہے۔''

اس زبان میں بھی اردو اور پنجابی الفاظ کی گھلاوٹ دیکھتے ہی بنتی ہے۔

ڈاکٹر بانو سرتاج نے گورو نانک دیو جی کے ایک مشہور پد (نظم) کو اردو اور پنجابی زبان کی دِل آویز آمیزش کے ساتھ اس طرح سے پیش کیا ہے:

''فلک تھال ہے چاند سورج دیے ہیں

سامنے آتا ہے۔ دراصل یہ خاصیتیں صرف سکھوں کی ہی نہیں، بلکہ خطۂ پنجاب میں رہنے والے اور پنجاب سے باہر سکونت پذیر تمام پنجابیوں میں پائی جاتی ہیں:

اس کے رنگ روپ میں ایک ایسی آب وتاب ہے
کوئی پنجابی جہاں بھی ہے وہاں پنجاب ہے

آگے بھی کہتے ہیں ''پنجاب کی سرزمین فکر و جذبہ اور رومانیت کے لیے نہایت ذرخیز ہے۔ حوصلہ، ہمدردی، جاہ وجلال، خوفِ خدا، جذبۂ رہنمائی، آزادیِ خیال، خودداری اور خوش مزاجی پنجابیوں کی پہچان ہے.... دنیا کے مذہب میں سکھ مت شاید اکیلا ایسا مذہب ہے، جس کے گوروؤں نے اظہارِ خیال شعری بندشوں میں کیا ہے۔ چونکہ اشعار ذہنی جریدوں کے اوراق پر نقش ہو جاتے ہیں، اس لیے خیالات کی تبلیغ کے لیے بھی شاعری ایک مؤثر آلہ کار ہے۔ اردو کا چونکہ پنجاب اور پنجابی سے گہرا رشتہ ہے، اس لیے پنجابیوں، خاص طور پر سکھوں کا اردو زبان میں شعر کہنا ایک قدرتی امر ہے۔ سکھ طرزِ زندگی کے شعرا حضرات نے اس زبان کی نہ صرف نوک پلک درست کی ہے، بلکہ اس میں معیاری شعری اور ادبی اضافے کر کے ایک نمایاں اور اہم کام کیا ہے۔'' 11

اردو کی داغ بیل ڈالنے میں اول سکھ گورو اور سکھ مذہب کے بانی گورو نانک دیو جی کی نظموں کو نا قابلِ فراموش مانا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر نقوی کا بیان ہے ''اردو اور پنجاب کا ماں بیٹی کا رشتہ ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے 1928 میں اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' لکھ کر یہ ثابت کیا تھا کہ اردو کا مولد پنجاب کی دھرتی ہے۔''12

پنجابی قصوں کا اردو شاعری پر اثر:

پنجاب میں 'ہیر وارث' کا قصہ عوامی قصوں میں سب سے زیادہ مشہور و معروف رہا ہے۔ اس میں ایک طرف گاؤں کی ایک ازحد حسین محبوبہ 'ہیر' اور اس کے گبھرو جوان عاشق 'رانجھا' کے رومانی قصےَ کی شاندار عکاسی کی گئی ہے اور دوسری طرف گاہے بگاہے فلسفۂ زندگی کی بھی مفید باتوں کی تلقین کی گئی ہے۔

ہندی زبان کے ناول نگار اگیے کے شہرۂ آفاق ناول 'شیکھر: ایک جیونی' کے آغاز میں ہی یہ مقولہ درج ہے، 'ویدنا (درد) میں ایک شکتی ہوتی ہے، جو درِشٹی (نظر) دیتی ہے، جو یاتنا (اذیت) میں ہے، وہ درَشٹا (دیدور) ہوسکتا ہے۔''

برسوں تک پنجابی زبان کے اول الذکر قصے میں درج یہ شعر میرے ذہن میں پیشہ رہا ہے، اس میں حیات کے ہر دردناک مرحلے میں غیر ضروری طوالت کی بجائے اِختصار سے کام لینے کی نصیحت کی گئی ہے۔ آب زر سے لکھنے کے لائق حروف ورج ہیں:

''قِصہ لمآ بے درد دا گُجھ ناہیں، دردمنداں دی ماردی اے گل تھوڑی۔''

یہاں قصہ، بے درد، مند وغیرہ اگر عربی اور فارسی زبان کے اصل الفاظ ہیں، تو لمآ، دا، گُجھ، ناہیں، دی، ماردی، اے، گل یہ الفاظ پنجابی زبان کے اصل بنیادی الفاظ ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ بہت لمبی چوڑی بات اگر درد سے مبرا کوئی آدمی کرتا ہے، تو اس کا کچھ بھی اثر کبھی سامع پر نہیں پڑا کرتا ہے، جبکہ جس شخص کے دل میں درد بھرا ہوا ہوتا ہے، اور اس کی جو بھی بات دل سے نکلتی ہے، بقول اقبال وہ گہرا اور دیرپا اثر رکھا کرتی ہے۔ مذکورۂ بالا مصرع میں پنجابی اور اردو ان دونوں زبانوں کے الفاظ ہم آغوش نظر آتے ہیں۔

اسی طرح پنجابی زبان کے عوامی قصوں میں دوسرے نمبر پر 'سوہنی مہیوال' کا قِصہ مقبولِ عام رہا ہے۔

اردو کی داغ بیل ڈالنے میں اول سکھ گورو اور سکھ مذہب کے بانی گورو نانک دیو جی کی نظموں کو نا قابل فراموش مانا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر نقوی کا بیان ہے ''اردو اور پنجاب کا ماں بیٹی کا رشتہ ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے 1928 میں اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' لکھ کر یہ ثابت کیا تھا کہ اردو کا مولد پنجاب کی دھرتی ہے۔''

اس قصے پر بھی ہیر رانجھا کے قصے کی مانند کئی ہندی فلمیں بن چکی ہیں۔ اردو شاعروں نے اس قصےَ پر مبنی بھی متعدد اشعار کہے ہیں۔ مثلاً مرحوم گلوکار جگجیت سنگھ کے بے حد پسندیدہ پٹھان کوٹ (پنجاب) کے شاعر راجیند رناتھ رہبر کا یہ شعر ملاحظہ کریں: ''کھڑے ہیں کچآ گھڑا لے کے ہاتھ میں ہم بھی رندی کا زور بھی رہبر چناب جیسا ہے۔''13

ان کی نظم 'تیری خوشبو میں بسے خط' بے حد مقبول رہی ہے، بالخصوص اس نظم کا یہ شہرۂ آفاق شعر ہے۔ ''تیرے خط آج میں گنگا میں بہا آیا ہوں/ آگ بہتے ہوئے پانی میں لگا آیا ہوں۔'' اس نظم میں آگے یہ مصرع بھی لائق توجہ ہے۔ ''تیرے رومال، ترے خط، ترے 'چھلے' بھی گئے۔''14

یہاں 'چھلے' پنجابی زبان کا خالص لفظ ہے، جو کہ ہاتھ کی انگلی میں پہننے کا انگوٹھی جیسا زیور یا اس سے مشابہ ہے۔ اسی طرح پنجابی تہذیب کے مظاہر متعدد اشیا کے حوالے در حوالے اردو شاعری میں وقتاً فوقتاً دستیاب ہوتے رہتے ہیں۔ 'سوہنی مہیوال'' کے قصے سے متعلق دو خاص اشعار قابل غور ہیں۔ شعر ہے

کچے گھڑے نے جیت لی ندی چڑھی ہوئی
مضبوط کشتیوں کو کنارا نہیں ملا

سہ ماہی جریدہ 'ذہنِ جدید' کے مدیر اور معروف شاعر زبیر رِضوی کا شعر ہے:

یہ اس کے پیار کی باتیں فقط قصے پرانے ہیں
ورنہ کچے گھڑے پر کون دریا پار کرتا ہے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا اردو شاعری میں مقام رہا ہے۔ ان کے یہ اشعار قابلِ تعریف ہیں:

غزل سنی ہے سحر کی تو کیجیے اقرار
کہ اہلِ تیغ بھی اہلِ قلم بھی ہیں سرِ دار15
سرفروشوں کا وطن یہ سورماؤں کی زمیں
جس کے ہر ذرے پہ قرباں رفعتِ عرشِ بریں
جس کی مٹی زرفشاں ہے جس کا پانی انگبیں
جس کا ہر گبھرو بہادر جس کی ہر الہڑ حسیں
... یہ میرا پنجاب ہے، یہ میرا پنجاب ہے۔ 17

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے 'کلیاتِ سحر' کے 'پیش لفظ' کے آخر میں یہ الفاظ رقم کیے ہیں ''سرداروں میں یوں تو دوسرے بھی شاعر ہوئے ہیں، لیکن کنور صاحب کنور صاحب ہیں۔ ان کا کہا ہوا کس مزے کا شعر ہے ''عجیب طرفہ تماشہ ہے سحر بھی/ وہ شاعر ہے مگر سردار بھی ہے۔''17

پروفیسر آزاد گلاٹی نے بھی اپنی شاعری میں گاہے بہ گاہے اپنے وطن کی پنجابی ماٹی کی سوندھی مہک کو جذب کیا ہے

تن کا خالی برتن چھن سے چھنک اٹھا آزاد اچانک
ایک رات جب دے گئی اس پر اک خواہش کی جھانجھر دستک'18

پنجابی کے سیکڑوں شعرا میں پروفیسر موہن سنگھ، ساحر لدھیانوی اور امرتا پریتم کے بعد اردو شاعری میں قبر، کتاب، عشق، ورق، نور، آب، رب جیسے لاتعداد الفاظ کا کارواں تا حال رواں دواں ہے اور حتیٰ الامکان آگے بھی رہے گا۔

دیگر مذاہب سے سکھ مذہب کا اتحاد

''آدی گرنتھ' میں جہاں عربی، فارسی کے متعدد الفاظ کا استعمال کر کے مسلم مذہب کے ساتھ سکھ مذہب نے اپنی اپنی اہمیت دکھائی ہے، وہاں ہندو دیوتاؤں کے لیے بھی اپنی عقیدت کے ثبوت پیش کیے ہیں۔ بھائی گُر داس جی نہ صرف گورو ارجن دیو جی کے عزیز شاگرد تھے، بلکہ انھوں نے 'شری گورو گرنتھ صاحب' کو اپنے دستِ

مبارک سے مکمل کر کے ایک ماہر منشی، محرر ہونے پر بھی ایک تاریخی مہر چسپاں کر دی ہے۔ انھوں نے جنگوں کے 40 قصے تخلیق کیے ہیں، ان میں سکھ مذہب پر تو عمل کرنے کی تلقین دی گئی ہے، ساتھ ہی پہلی جنگ کے آخری پد میں ''واہ گورو'' کے مقدس الفاظ میں، 'وٗ' سے 'وِشنوٗ'، 'ہٗ' سے 'ہری'، 'گ' سے 'گوبند' اور 'رٗ' لفظ سے 'رام' نام والے چار ہندو دیوتاؤں سے ذکر سے اپنی قوم کے غیر فرقہ وارانہ رویے کے ساتھ ساتھ اپنے لا جواب شعری تخیل کی پرواز کا بھی ایک مستحکم ثبوت پیش کیا ہے۔

عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کی آمیزش : سکھ مذہب کے اول نعرۂ حق یا پیغام کو اگر اس کی پہچان تسلیم کریں تو سنت کبیر کے شری گورو گرنتھ صاحب میں درج اس سطر کے کل 8 الفاظ ہیں اور ان میں بھی 6 الفاظ صرف اردو زبان کے ہیں۔ ''اول اللہ نور اُپایا قدرت دے سب بندے۔'' ان میں اول، اللہ، نور، قدرت اور بندے عربی فارسی کے الفاظ ہیں، جو اردو میں مستعمل ہیں، اُپایا اور دے الفاظ اصل پنجابی زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جمیل جالبی نے 'تاریخ اردو ادب' میں 'شری گورو گرنتھ صاحب' کی بابت یہ تحقیق کی ہے کہ اس میں عربی اور فارسی زبانوں کے اردو لغت میں دستیاب ہونے والے الفاظ کی کل تعداد تقریباً 1345 ہے۔[19] اس میں کہیں تو عربی فارسی کے الفاظ ہو بہو اصل صورت میں قبول کیے گئے ہیں اور کہیں دوسرے درجے میں پنجابی زبان کی نوعیت کے مطابق ان کا اشتقاق کیا گیا ہے۔

پنجابی کے غیر منقلب الفاظ : اب اول زمرے کی مثالوں کے طور پر پہلے فقط گورو روی داس جی کے 'آدی گرنتھ' میں شامل بیگم پورہ والے مشہور پد سے ہی متعدد عربی فارسی کے الفاظ ملاحظہ کریں: بیگم، شہر، اندوہ، تشویش، خراج، مال، خوف، خطا، ترس، زوال، خوب، وطن، خیر، قائم، دائم، دوم، سوم، آب و دانہ، مشہور، غنی، معمور، محرم، محل وغیرہ کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسی مذہبی کتاب میں یہ دیگر اصل الفاظ بھی آ کر کاملاً جذب ہو گئے ہیں: اول، اللہ، نور، حکم، نماز، بندگی، تخت نشین، حق، عرض، صاحب، خصم، عشق، قبر، قہر، عورت، ترس، درخت، عالم، دنیا، پیدائش، مردار، غافل، حیوان، شیطان، آدم، دِل، قبض، قبضہ، روز، نمک حرام، حلال، اندیشہ، کم ترین، آمد، عیب، محبت، طریقت، مسکین، کرامات، غریب، سُنّت، جذبہ، قادر، قدرت، حکم، بندہ، درویش، دربار، جنسی، جہان، خاک، پاک، وغیرہ۔

پنجابی زبان کی صورت میں تبدیل الفاظ : اب دوسرے درجے کے اشتقاق شدہ الفاظ کی ایک مختصر فہرست پیش ہے:-

ناؤں (اصل لفظ نام)، بدناؤں (بدنام)، ندر، ندری (نذر)، خلاص (خالص)، مسکت (مشقت)، بھِست (بہشت)، رضائی (رِضا)، ہجُور (حضور)، وخت (وقت)، نیکیہ (نیکی)، بدیہ (بدی)، قادیہ (قاضیہ)، پڑدہ (پردہ)، اکتیار (اختیار)، گدران (گزران)، بخش (بخشش)، پات (تی) شاہی (بادشاہی)، اجرائیل (عزرائیل)، ہکمی (حکم)، کتیبہ (کُتب)، ارداس (عرضداشت) حوال (احوال)، پُرصلاط (پُل صراط)، سیل (سیر)، دوجک (دوزخ)

وغیرہ الفاظ پنجابی زبان کے توسط سے سکھ اور مسلم قوموں کی فراخ دلی و باہمی مستحکم رشتوں ناتوں اور خیالات کی ہم آہنگی کی دستاویزی شہادت پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح پنجابی زبان اور اس کے ساتھ اردو کی روز مرہ میں رچے بسے پنڈت میلا رام وفا، پنڈت رتن پنڈوروی، گلزار وغیرہ متعدد دیگر شعرا کی شاعری سے پنجابی زبان اور تہذیب وتمدن کو منعکس کرنے والے اشعار کے حوالے دیے جا سکتے ہیں۔ اردو اور پنجابی یہ دونوں زبانیں شاعری کے آغاز سے ہی گنگا جمنی تہذیب کی مظہر رہی ہیں اور اسی کے موجب ہندو سکھ اور مسلم تینوں مذاہب پیار و محبت کی ریشمیڈوری میں تا حال بندھے چلے آ رہے ہیں۔

حواشی :

1. کیفی پنڈت، پنڈت دتا تریہ کیفی، مکتبہ معین الادب، لاہور، سنہ 1950
2. ڈاکٹر ناشر نقوی، 'اردو، پنجاب اور سکھ شعرا' پبلی کیشن بیورو، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ، اول ایڈیشن، سنہ 1999 ص128
3. 'اردو، پنجاب اور سکھ شعرا'، پنجابی یونیورسٹی پبلی کیشنز بیورو، ص،48,49
4. 'قومی یک جہتی اور اردو شاعری' تحقیقی مقالے، ڈاکٹر بانو سرتاج، مقالہ 'اردو شاعری اور گرو نانک'، ص65۔
5. 'اردو، پنجاب اور سکھ شعرا'، پنجابی یونیورسٹی پبلی کیشنز بیورو، ص،49
6. 'نئے تناضر' ڈاکٹر وزیر آغا'، مضمون 'اردو اور پنجابی کا باہمی رشتہ'، انجمن ترقی اردو نئی دہلی، سنہ 1980۔
7. 'ادو، پنجاب اور سکھ شعرا'، ناشر نقوی، ایضاً، ص53
8. نئے تناظر: ڈاکٹر وزیر آغا، ایضاً، سنہ 1980
9. 'گرہن' افسانوی مجموعہ، 'پیش لفظ'، راجیندر سنگھ بیدی، حوالہ وزیر آغا، ص12۔
10. آزاد گلاٹی، 'اذکار'، طالب پریس سہارن پور، سنہ 1987، ص54۔
11. 'اردو، پنجاب اور سکھ شعرا'، مضمون 'کچھ ادب اور ادیب سے متعلق'، ڈاکٹر ست نام سنگھ خمار، 'ص 8،9
12. ایضاً، ص14
13. راجیندر ناتھ رہبر، شعری مجموعہ 'یاد آؤں گا'، درپن پبلی کیشنز، پٹھان کوٹ، سا اشاعت نمبر سنہ 2008، ص 27
14. ایضاً، ص 130
15. کلیاتِ سحر، مرتب کے ایل نارنگ ساقی، نظم 'پنجاب ڈے پر'، کنومہندر سنگھ بیدی کمیٹی نئی دہلی، پہلا ایڈیشن سنہ 199، ص 111
16. ایضاً، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ص.198
17. ایضاً، 'کلیاتِ سحر'، 'پیش لفظ'، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ص29
18. آزاد گلاٹی، مجموعہ 'جسموں کا بن باس'، پی کے پبلی کیشنز، نئی دہلی، اول ایڈیشن ص 93
19. جمیل جالبی، 'تاریخِ اردو ادب'، نئی دہلی، سنہ 1986، ص48

■

Dr. Krishan Bhavuk, 201-A, Guru Nanak Nagar, Street No. 18-K, PATIALA - 147003 (Punjab)

اردو پنجاب اور پنجابیت

کہکشاں فلک

پنجاب ہندوستان کا سرحدی صوبہ ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں زمینی راستے سے آنے والے فاتحین کے لیے سرہند بھی رہا ہے۔ ایشیا کے مختلف ممالک سے جو تہذیبیں ہندوستان میں آئیں ان کی ابتدائی آبیاری بھی پنجاب ہی میں ہوئی۔ پانچ دریاؤں کا صوبہ پنجاب، جس میں ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جہلم شامل ہیں ہر زمانے میں تہذیب وثقافت سے سیراب رہا ہے۔ اس خطے میں ایک طویل عرصے تک بولیوں اور زبانوں کے اختلاط اور ارتباط کے سبب جو نئی زبان وجود پذیر ہوئی وہ کبھی پنجابی کہلائی تو کبھی ہندوی۔ اسی زبان کا نام ہندی بھی ہوا، ریختہ بھی اور اب یہی زبان اردو کہلاتی ہے۔ اسی پس منظر کی روشنی میں معروف محقق محمود شیرانی نے اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کی پیدائش پنجاب ہی میں ہوئی ہے۔ شیرانی نے اپنے دعوے کی دلیل میں غزنوی عہد سے اپنے زمانے تک کے پنجاب کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور پنجابی واردو کے صرف ونحو کی یکسانیت، مصدر کا قاعدہ جس میں 'نا' کا استعمال ہوتا ہے جیسے کھانا، پینا وغیرہ، تذکیر وتانیث کے قواعد، اعلام واسما کا ضابطہ وغیرہ شامل ہیں، کے حوالے سے مدلل گفتگو کی ہے۔ شیرانی کے دلائل سے ہٹ کر دیکھا جائے تو اردو ادب میں نئے سنگِ میل بھی پنجاب ہی میں قائم ہوئے۔ مثلاً: اردو کا پہلا ناول 'ریاضِ دلربا' از منشی گمانی لعل (1832)، بارہ ماسے کی روایت افضل نارنولی، پہلا مزاحیہ شاعر جعفر زٹلی، اردو کی پہلی اور دوسری تنقیدی تصنیف 'آبِ حیات از محمد حسین آزاد (1867)، مقدمہ شعروشاعری از مولانا الطاف حسین حالی (1873)، انیسویں صدی عیسوی میں محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے انجمنِ پنجاب قائم کرکے اردو دنیا کو نیچرل اور موضوعاتی شاعری سے ہم آہنگ بھی پنجاب میں ہی رہ کر کیا۔ علامہ اقبال سے فیض اور ساحر لدھیانوی تک انقلابی اور حقیقت آشنا شاعری کا سلسلہ بھی پنجاب سے ہوا، تو دوسری طرف پریم چند سے پہلے 1873 میں امر سنگھ منصور نے 'جھوٹی پریت' اور 'حسن کی رسوائی' جیسے ناول اور متعدد افسانے لکھے۔ بعد کے زمانے میں فکشن کی روایت کو پنجاب کے راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، بلونت سنگھ اور ہمارے عہد کے جوگندر پال نے آگے بڑھایا۔ ان قلم کاروں کی کہانیوں سے اردو زبان وادب میں پنجاب اور پنجابیت کا دل دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ پنجاب اور پنجابیت اپنے میں ایک ثقافتی روایت ہے۔ جس کا تعارف راجندر سنگھ بیدی کے لفظوں میں یہ ہے:

''وہی تو ایک دیش ہے جس کی دھرتی سے آٹھوں پہر لوبان کی خوشبو اٹھتی ہے۔ اس کے دریا تو ایک طرف پوکھر بھی انوراگ سے واقف ہیں۔ جہاں کے مرد اکھڑ ہیں، عورتیں جھگڑ، وہ خود ہی اپنے قانون بناتے ہیں اور اگلے ہی پل بے بس ہوکر خود ہی انھیں توڑ دیتے ہیں اور پھر نئے قانون وضع کرنے کے لیے چل نکلتے ہیں۔ انھوں نے بہت دکھ دیکھا ہے۔ وہ کسی وقت بھی سونے کو مٹی میں رول دیتے ہیں اور پھر اسی مٹی کو کھنگال کر اس میں سے کندن پیدا کرلیتے ہیں۔ عجیب کیمیا گر ہیں وہ۔ پنجابی ہی ہے جو خود پر ہنس سکتا ہے۔ وہ اچھا دوست ہے اور بُرا دشمن۔ جہاں بھی لوگ بلند آواز سے ہنستے، قہقہہ لگاتے ہوئے سنائی دیں وہاں ضرور کوئی پنجابی ہوگا۔ وہ جو اندر ہے وہی باہر ہے۔ اس کے جیون کا رہسیہ ہی یہ ہے کہ کوئی رہسیہ نہیں۔ وہ ایک ایسا پودا ہے جو دنیا کی کسی بھی دھرتی پر پنپ سکتا ہے۔ پنجاب اور پنجابی کبھی ناش نہیں ہوسکتے۔ نہ معلوم انھوں نے کون سی امرکتھا سنی ہے جس میں وہ اونگھ بھی گئے اور پا بھی گئے پی بھی گئے اور چھلکا بھی گئے۔ زندگی کے رونے دھونے سے ان کی تپسیا پوری نہیں ہوتی۔ ہنسنے کھیلنے، کھانے اور پینے میں ان کا موکش ہے۔''

(افسانوی مجموعہ گرہن)

راجندر سنگھ بیدی کو پنجاب کی تہذیبی روح کا عکاس افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ خود بیدی نے اپنی اردو افسانہ نگاری میں لکھا ہے ''میرا ماحول پنجابی ہے اور میں پنجابی اردو لکھتا ہوں تو کوئی قصور نہیں کرتا بلکہ اپنے خلوص کا ثبوت دیتا ہوں۔''

ظاہر ہے کہ بیدی کے افسانوں میں پنجاب سے متعلق قبائلی، دیہی پسماندہ مزدور اور کسان کردار ہیں۔ ان سبھی کرداروں سے بیدی نے اپنی کہانیوں میں پنجابی معاشرے اور جغرافیے کے مطابق مکالمے ادا کرائے ہیں۔ مثلاً: 'ایک چادر میلی سی' میں جو قبائلی اور ناخواندہ عورتیں ہیں وہ پنجابی کے گیت اور جملے عام طور پر ادا کرتی ہیں۔ ''ویر آیا کھیل کے ... میں من پکاواں ویل کے'' ... ''کوٹھے اُتے گنّا، ویر میرا لمّاں'' ... ''بھابو میری پتلی ... جہدی نک مچھلی''۔

ان واقعات اور جملوں میں پنجابیت نمایاں نظر آتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے اپنی پوری افسانہ نگاری میں دانہ ودام سے گرہن تک، کوکھ جلی سے اپنے دکھ مجھے دے دو تک، مکتی بودھ سے ہاتھ ہمارے قلم ہوئے تک اور پھر ایک چادر میلی سی تک پنجابی طرزِ زندگی، معاشرت، رسومات اور توہمات سب کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ بیدی ہی کی طرح بلونت سنگھ نے اپنے افسانوں

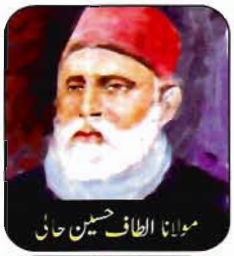

مولانا الطاف حسین حالی

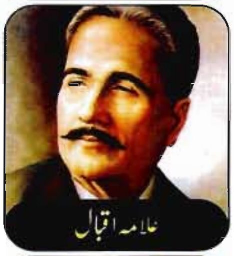

علامہ اقبال

فیض

ساحر لدھیانوی

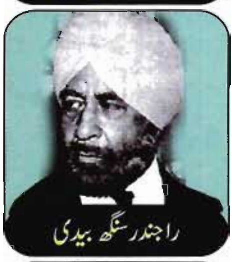

راجندر سنگھ بیدی

سعادت حسن منٹو

سے پنجاب اور پنجابیت کو فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کیا۔ بقول وقار عظیم: ''بلونت سنگھ اس میدان میں آئے تو ان کے افسانوں کو پڑھ کر یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم نے اب تک پنجاب کے دیہات کو یا تو دیکھا ہی نہیں تھا یا دیکھا تو بہت دور سے ہر زندگی کا ایک مخصوص ٹھیٹ پن جتنا زیادہ ہوگا اس کا اتنا ہی گہرا عکس لوگوں کی معاشرتی زندگی اور اور اخلاق زندگی سے بھی بڑھ کر ان کی ذہنی اور جذباتی زندگی پر دکھائی دے گا۔'' بلونت سنگھ کے افسانوی مجموعوں میں جگا، پنجاب کی کہانیاں، چلمن، پہلا پتھر اور ناولوں میں چک پیراں دا جسا، کالے کوس، راوی پار، دوا کال گڑھ وغیرہ اپنے عنوانوں سے ہی پنجابی کلچر کی تصویر نظر آتے ہیں۔ اسی طرح دیویندر ستیارتھی کا نام بھی اردو افسانہ نگاری میں بہت اہم ہے۔ ستیارتھی نے پنجاب کے کلچر کی جھلک خوب خوب پیش کی ہے۔ ستلج پھر بپھرا، ان داتا، اکنی، ٹکلی کھو گئی، دوراہا، بنسری بجتی رہی وغیرہ ہیں۔ ستیارتھی نے بھی اپنی کہانیوں میں پنجاب کے لوک گیتوں کو پوری فنی تکنیک کے ساتھ اردو سے متعارف کرایا ہے۔ مثلاً: ہرے رنگ کی گڑیا کہانی میں کچھ انڈونیشیائی لوگ پنجابی گیت سننے کی فرمائش کرتے ہیں اور پنجابی ساتھی گیت سناتے ہیں:

ہریا میں کیا کری جہاں تیرے نام
گھراں جو رُو بنائی لیندی کامے
ڈنگرے دی چھڈی آیاں وہارا
اج آؤ نانی منوے دے مامے
ربّا میں کئیاں کراں جہان تیرے نامے

پنجاب کے اہم ترین افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے افسانوں کی جڑیں پنجاب کی دھرتی سے جڑی ہوئی ہیں۔ بطورِ خاص 'تماشا' افسانہ میں امرتسر کا جلیاں والا باغ کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ منٹو کا 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' میں ایک پاگل کردار کچھ یوں پنجابی بولتا ہے: ''اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دال آف ..... واہے گورو جی دا خالصہ واہے گورو جی دی فتح .... جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔'' منٹو کی کہانیوں کے کردار جگہ جگہ پنجابی بولتے ہیں جو پنجابی ثقافت کے سفیر نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو افسانے کا سنہری دور پنجاب سے جڑا ہوا ہے اور اس میں پنجاب اور پنجابیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ فکشن کے علاوہ اردو شاعری کی طرف دیکھیں تو ہمیں ہر زمانے میں پنجاب اور پنجابیت کو موضوع بنا کر غزلوں کے اشعار اور نظمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ پنجاب کے لوک ادب کو شعرا حضرات نے خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ پنجاب کی عشقیہ داستانوں میں ہیر رانجھا، سسّی پنّو، مرزا صاحباں، پورن بھگت، روپ بسنت وغیرہ اہم ہیں جن کو اردو اور پنجابی شاعری میں موضوع بنایا گیا ہے۔ محبت خاں نے سسّی پنوں کی رومانی داستانوں کو 'اسرارِ محبت' کے عنوان سے مثنوی کے پیکر میں ڈھالا، روحانی داستانوں میں جپ جی صاحب (بابا گورونانک دیو جی کا پنجابی کلام) اور سکھ منی صاحب (گورو ارجن دیو جی کا کلام) کے رواں دواں منظوم ترجمے اردو میں بھی ہوئے ہیں جن میں خواجہ دِل محمد کے تراجم پنجابی کلچر کا حصہ بن چکے ہیں سیکڑوں گھروں

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو افسانے کا سنہری دور پنجاب سے جڑا ہوا ہے اور اس میں پنجاب اور پنجابیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ فکشن کے علاوہ اردو شاعری کی طرف دیکھیں تو ہمیں ہر زمانے میں پنجاب اور پنجابیت کو موضوع بنا کر غزلوں کے اشعار اور نظمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ پنجاب کے لوک ادب کو شعرا حضرات نے خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ پنجاب کی عشقیہ داستانوں میں ہیر رانجھا، سسّی پنّو، مرزا صاحباں، پورن بھگت، روپ بسنت وغیرہ اہم ہیں جن کو اردو اور پنجابی شاعری میں موضوع بنایا گیا ہے۔

میں روز ہی ان کا 'پاٹھ' ہوتا ہے۔ ہندوستانی ادب بلکہ صاف طور پر پنجابی کلچر، ہندی کلچر، ہندی اور اردو شاعری میں شاہ حسین کی کافیاں، وارث شاہ کی ہیریں، بلھے شاہ اور بابا فرید کا کلام پنجابی کلچر کی روح ہیں۔ ان کے علاوہ پنجابی شاعروں میں گورو نانک صاحب، گورو ارجن دیو صاحب، گورو تیغ بہادر صاحب، گورو گوبند سنگھ صاحب، خواجہ غلام فرید، ہاشم شاہ، غلام رسول، محمد بخش جیسے کلاسیکی شاعر اور ان کے بعد موہن سنگھ دیوانہ سے شِو بٹالوی تک کتنے ہی شاعر ہیں جن کے پنجابی کلام کی بنیاد پنجابی کلچر ہے۔

پنجاب کی عشقیہ داستانوں کے حوالے سے اردو کے نامور شعرا کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا
(انشاءاللہ خاں انشا)

ایک مٹیلے پھول کی خاطر کچھ شمشیریں جمع کرو
دِل رانجھا ہے اس کے لیے پنجاب کی ہیریں جمع کرو
(پریم وار برٹنی)

نظیر اکبرآبادی نے ککڑی کے لیے کہا ہے:

فرہاد کی نگاہیں، شیریں کی ہنسلیاں ہیں
مجنوں کی سرد آہیں، لیلیٰ کی انگلیاں ہیں
ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے
سیدھی ہے وہ تو یارو! رانجھے کی بانسری ہے

سوالِ وصل بھی تو ہے جوابِ ہجر بھی تو
چناب بھی تیرے اور گھڑے بھی تیرے ہیں
(پریم کمار نظر)

پیار کے دریا کے تیراکو! موجیں تند، گھڑے کچے ہیں
اور پھر ایک جنم کے بیری بہتا پانی، کچی مٹی
(بمل کرشن اشک)

ہر دکھ سکھ ہر چولہا چوکا سانجھا ہے
جو پنجابی ہے وہ خود میں رانجھا ہے
(ناشر نقوی)

پنجاب کے کلچر کا ایک بنیادی پہلو مذہبی رواداری یعنی ایک دوسرے کے مذہب اور عقیدے کی عزت کرنا ہے۔ اسی مزاج نے یہاں کی فضا میں جذباتی ہم آہنگی کی مہک سمو دی ہے۔ ادھر پنجابی کلچر کے عناصر میں لوک گیتوں کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ ان لوک گیتوں میں لوری، تھال، ماہیا، ڈھولا، ٹپا، دوہڑا، بولیاں، بھنگڑا، جگنی، جھومر، ککلی اور گھوڑی وغیرہ بھی ہیں جن کے بول اور انداز پنجاب کو انفرادیت دیتے ہیں۔ یہ گیت ہر عمر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ خوشی کے جذبات کا سب سے پہلا اظہار ہمیں لوری لوک گیت میں ملتا ہے۔ لوک گیت چاہے کسی بھی موقع پر کہا گیا ہو وہ ہمیشہ ہی تازہ رہتا ہے۔ بہر حال پنجاب کو گیت اور سنگیت کا صوبہ بھی کہا جاتا ہے اور گیان اور دھیان کی دھرتی بھی۔ پنجاب کے کلچر نے اردو زبان و ادب کو بھی مالا مال کیا ہے اور اردو کی گنگا جمنی تہذیب کو بھی فروغ دیا ہے۔ یہ سلسلہ کل بھی جاری تھا اور آج بھی جاری ہے۔

■

Kahkashan Falak, Dept of Urdu
Punjabi University, Patiala, (Punjab)

اُڑیا زبان و ادب اور اردو

کرامت علی کرامت

اُڑیا اور اردو دونوں زبانیں نوہند آریائی خاندانِ السنہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُڑیا صوبۂ اُڑیسہ کی سب سے اہم زبان ہے۔ بنگالی اور آسامی اس کی بہنیں کہلاتی ہیں۔ اس کے جنوب میں تیلگو زبان بولی جاتی ہے جو دراوِیڈین زبان ہے۔ یہ زبان تقریباً 80 ہزار مربع میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ ساتویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی عیسوی کے درمیان ماگدھی اَپ بھرنش تین شاخوں میں بٹ گئی۔ مغربی ماگدھی، وسطی ماگدھی اور مشرقی ماگدھی۔ رفتہ رفتہ مغربی ماگدھی سے بھوجپوری، وسطی ماگدھی سے میتھلی اور مگہی اور مشرقی ماگدھی سے آسامی، بنگالی اور اُڑیا بنیں۔ ایم ایم ہر پرشاد، شاستری نے نیپال سے بدھ مذہب کے چند گیتوں اور دوہوں کو دریافت کر کے 'بودھ گان و دوہا' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اُڑیا، بنگالی، آسامی اور ہندی کے محققوں نے اسی زبان کو اپنی اپنی زبان کا منبع ثابت کیا ہے۔ سید بشیر علی کاظمی نے پاکستان سے 'پراچین اردو' نامی ایک کتاب شائع کی ہے جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ ''بودھ گان و دوہا' کی زبان اردو کی بھی ابتدائی شکل ہے۔ غرض کہ اُڑیا اور اردو کا تہذیبی اور ثقافتی رشتہ اس زمانے سے قائم ہے جب کہ یہ دونوں زبانیں اپنے تشکیلی دور سے گزر رہی تھیں۔

بیمز اور گریرسن جیسے ماہرینِ لسانیات نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اُڑیا زبان میں ہند آریائی زبانوں کی کئی پرانی خصوصیات برقرار ہیں۔ صوتیات کے اعتبار سے اس زبان کی یہ خصوصیت نہایت دلچسپ ہے کہ اس کے ہر حرف پر ایک حرکت ہوتی ہے اور اس میں مخفف صوت رکن (लघु) اور طویل صوت رکن (गुरु) میں فرق نہیں ہوتا، بلکہ ہر حرف لگھو ہوتا ہے۔ اسے جس طرح ہجے کیا جاتا ہے، اُسی طرح بولا جاتا ہے۔ اس زبان میں خ، ذ، ز، ش، ض، ظ، ع، غ، ف، ق، و جیسی آوازیں پائی نہیں جاتیں۔ یہی سبب ہے کہ اُڑیا میں عربی اور فارسی کے جن الفاظ کو اپنایا گیا ہے، ان میں خ کو 'کھ' سے، ذ اور ز کو 'ج' سے ش کو 'س' سے، ض اور ظ کو بھی 'ج' سے، ع کو 'ا' سے، غ کو 'گ' سے، ف کو 'پھ' سے، ق کو 'ک' سے اور 'و' کو 'ب' سے بدل دیا جاتا ہے۔ ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، ن اور ل کا بکثرت استعمال اس زبان پر دراوِیڈی زبانوں کے اثرات کا پتہ دیتا ہے۔ اُڑیا کے افعال کے اخیر میں جو 'نتی'، 'نتو' استعمال ہوتے ہیں (مثلاً کرنتی بمعنی 'وہ لوگ کرتے ہیں' اور کرنتو بمعنی 'ان لوگوں کو کرنے دیجیے') ان کا سلسلہ ویدک سنسکرت سے جاملتا ہے۔ بنگالی کی طرح اُڑیا میں بھی 'ٹی' یا 'ٹا' جیسے articles کا استعمال ہوتا ہے جو ہندی یا اردو میں پایا نہیں جاتا۔ چھتیس گڑھی کی طرح اُڑیا میں بھی 'اے' یا 'مانے' کے اضافے سے الفاظ کا جمع بنایا جاتا ہے۔ مثلاً لوک (آدمی) کا جمع ہے 'لوکے' یا 'لوکہ مانے'۔

پروفیسر کنج بہاری ترپاٹھی نے ثابت کیا ہے کہ بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے قدیم اُڑیا کتبوں میں بھی اردو اور فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں اُس زمانے میں جگن ناتھ جی کے مندر میں جو روزنامچے لکھے جارہے تھے، ان میں بھی اردو اور فارسی کے الفاظ ملتے ہیں اُڑیسہ 1568 میں پہلی بار افغانوں کے زیر حکومت آیا اور 1590 میں مغلوں کی حکومت میں شامل ہوگیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُڑیسہ میں مسلمانوں کے دورِ حکومت سے بہت پہلے عوامی سطح پر یہاں اردو پہنچ چکی تھی جو اُڑیا زبان پر اثرانداز ہونے لگی تھی۔

اُڑیا زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں دراوِیڈین زبانوں مثلاً تامل، تیلگو اور ملیالم کے علاوہ اُڑیسہ کے آدی باسیوں کی زبانوں کے بھی چند الفاظ شامل ہوگئے ہیں۔ مثلاً کونی (چھوٹا)، پیلا (بچہ)، مونہ (سوئی کی نوک) جیسے الفاظ دراوِیڈین زبان سے آئے ہیں۔ 'کنڈھےئی یا' یعنی 'بغل گیر ہونا' مُنڈا نامی باسیوں کی بولی سے آیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اُڑیسہ کے اردو بولنے والوں کی روزمرہ کی زبان پر بھی اس لفظ کی بدلی ہوئی شکل 'کنڈھیانا' چڑھ گئی ہے۔

پروفیسر کنج بہاری ترپاٹھی نے ثابت کیا ہے کہ بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے قدیم اُڑیا کتبوں میں بھی اردو اور فارسی کے الفاظ پائے جاتے ہیں اُس زمانے میں جگن ناتھ جی کے مندر میں جو روزنامچے لکھے جارہے تھے، ان میں بھی اردو اور فارسی کے الفاظ ملتے ہیں اُڑیسہ 1568 میں پہلی بار افغانوں کے زیرِ حکومت آیا اور 1590 میں مغلوں کی حکومت میں شامل ہوگیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اُڑیسہ میں مسلمانوں کے دورِ حکومت سے بہت پہلے عوامی سطح پر یہاں اردو پہنچ چکی تھی جو اُڑیا زبان پر اثرانداز ہونے لگی تھی۔ سولہویں صدی کے آخری حصے سے اٹھارہویں صدی کے نصف حصے تک اُڑیسہ میں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔ اس عرصے میں فارسی، عربی، پشتو اور ترکی کے بے شمار الفاظ اُڑیا میں داخل ہوئے۔ 1803 سے آزادی تک اُڑیسہ انگریزوں کے زیرِ حکومت رہا جس دوران انگریزی کے علاوہ فرانسیسی اور پرتگالی کے بہت سے الفاظ اُڑیا زبان کے روزمرہ میں شامل ہوئے۔

راجہ مان سنگھ نے اُڑیسہ کو مغلیہ حکومت کے زیرِ نگیں کیا اور ٹوڈرمل نے یہاں کی زمین کی اراضی کا کارنامہ انجام دیا۔ اُڑیسہ میں 1751 میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی۔ 1751 سے یہاں مرہٹوں کی حکومت رہی۔ 1803 میں انگریزوں نے اُڑیسہ پر قبضہ جمالیا۔ لیکن مغلیہ دور سے لے کر 1840 (یعنی ملکۂ وکٹوریہ کے ابتدائی دور) تک فارسی زبان اُڑیسہ کی سرکاری زبان رہی۔ اس کے بعد اردو اور اُڑیا دونوں زبانوں میں عدالت، کچہری اور اراضی کے

کاروبار چلتے رہے۔

یہی سبب ہے کہ عدالت، کچہری اور سرکاری دفاتر سے متعلق فارسی الفاظ اُڑیا زبان کے اجزائے لاینفک بن گئے جو اب تک مستعمل ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً عدالت، وکیل، دفتر، قانون گو، تحصیل دار، داخل، خارج، بندوبست، قاضی، محرر، زمیندار، حاکم دلیل، قبالہ وغیرہ۔

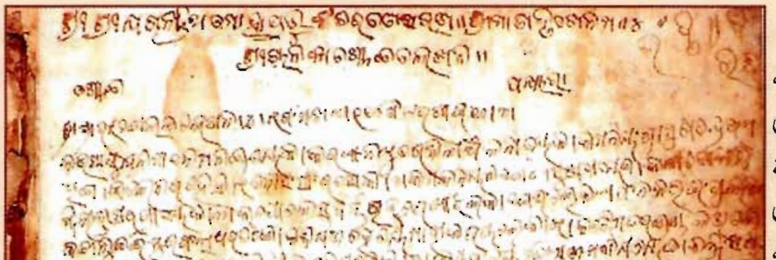

چونکہ زمانۂ قدیم سے اُڑیسہ میں ہندو اور مسلم کی اخوت مثالی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے اُڑیسہ کے خورد و نوش اور وضع قطع کے اعتبار سے اُڑیا کلچر پر اردو کلچر کے بہت گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا اُڑیا زبانوں میں ٹوپی، جامہ، پاجامہ، رومال، شال، تکیہ، چپل، شلوار وغیرہ کا استعمال عام ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں حلوہ، برفی، گلاب جامن، قلاقند، بریانی، پلاؤ قورمہ، شربت اور پھلوں میں انگور، بادام، پستہ، سیب، ناشپاتی، انار وغیرہ الفاظ (معمولی صوتیاتی تبدیلیوں کے ساتھ) اُڑیا میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اُڑیا کی ایک عام ڈکشنری میں کل چالیس ہزار الفاظ میں سے دو ہزار سے زیادہ اردو، فارسی اور عربی کے الفاظ ملتے ہیں۔ بعض اردو، فارسی اور عربی کے الفاظ اُڑیا زبان کے روزمرہ میں اس قدر گھل مل گئے ہیں کہ اس کا کسی کو اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ اُڑیا کے الفاظ نہیں ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

آرام، اصل، امانت، اشارہ، اشتہار، عزت (اِجّت)، اطلاع (اِتلا)، علاقہ، قضیہ (کجیا)، قمیص (کمیج)، حق (ہک)، قرض (کرج)، قلم (کلم)، کاغذ (کاگج)، کاروبار، قلی (کلی)، قیدی (کیدی)، خرچ (کھرچہ)، خالی (کھالی)، خوب (کھوب)، غریب (گریب)، جلدی، جاگیر، جاری، ظلم (جلم)، زنجیر (جنجیر)، تازہ (تاجہ)، درکار، درزی (درجی)، دستخط، دربار، دیوان، دوکان، داروغہ، دربان، دنیا، نقشہ (نکسہ)، نقد (نگد)، نرم، نواب (نباب)، نگاہ (نگھا)، پردہ، بازار (بجار)، باقی (باکی)، بخشش (بکھسس)، بلخ (بتک)، بقیہ (بکایا)، بہادر، بیمہ، بیمار (بے مار)، بے کار، مزدور (مجدور)، مضبوط (مجبوت)، مجلس، مزہ (مجا)، منظور (منجور)، منع (منا)، مرہم (مَلَم)، صابن، سال، سود (سودھ)، سیب (سیئو)، سودا، سہارا، صدر، حاضر (حاجر)، حفاظت (حاجت)، حساب، حقہ (حکہ)، حکم، حضور (حجور)، ہشیار (ہسیار)... وغیرہ۔

اوائل انیسویں صدی کے دستاویزات اور بندوبست کے کاغذات جو اُڑیا میں ملتے ہیں، ان میں فارسی ترکیبِ اضافت بھی پائی جاتی ہے، مثلاً موضعِ مذکور، سالِ گذشتہ، پرگنۂ التی، قلعۂ درپن، ضلعِ کٹک، صوبۂ اُڑیسہ وغیرہ۔

اُڑیا زبان میں رجواڑے کے علاقے کو 'گڑ جات' کہا جاتا ہے۔ اُڑیا لفظ 'گڑھ' کو فارسی طریقے پر جمع کرنے پر لفظ 'گڑ جات' بنا ہے۔

جس طرح اردو زبان نے اُڑیا زبان پر اپنے اثرات ڈالے ہیں، اسی طرح اُڑیا زبان نے بھی۔ یہاں کے اردو بولنے والوں پر اپنے اثرات مرتسم کیے ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

معیاری اردو: اکہتر، بہتر، تہتر، جوہتر

اُڑیا: اکستری، باستری، تیستری، چوستری

اُڑیسہ کی اردو بولی: اکستر، باستر، تیستر، چوستر

معیاری اردو: برآمدہ، زینہ، کیچڑ، گھٹنا، آنگن، دومنزلہ

اُڑیا: پنڈا، پاپاچو، پنکو، آنٹھو، اگوڑاں، دی مہلا

اُڑیسہ کی اردو بولی: پنڈا، پپاچ، پنک، آنٹھو، انگنا، دومحلّہ

سبزیوں کے تعلق سے چند مثالیں:

معیاری اردو: ٹماٹر، گوبھی، مرچ، لوکی، پیٹھا

اُڑیا: بیلاتی بائی گڑوں، کوبی، مریچہ، لاؤ، پاکی کھارو

اُڑیسہ کی اردو بولی: ولایتی بیگن، کوبی، مرچی پانی کدو، کونڈا

ثقافتی لین دین کے تحت بہت سے مسلمان ادیبوں نے اُڑیا میں کئی طبع زاد ادبی کتابیں لکھی ہیں اور اردو اور فارسی کی کئی گراں قدر کتابوں کو اُڑیا میں منتقل کیا ہے۔ اُسی طرح کئی اُڑیا کی شاہکار تصنیفات کو اردو میں ترجمہ کر کے اردو کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ یوں تو فہرست بہت طویل ہے، لیکن یہاں چند خاص خاص تصنیفات کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا۔

(1) بالیسر ضلع کے گڑپدا کے زمیندار عبدالمجید بھویاں اردو اور اُڑیا کے مشہور شاعر تھے۔ ان کا اردو نعتیہ دیوان نول کشور پریس سے شائع ہوا تھا۔ انھوں نے سعدی کے پندنامہ یا 'کریما' کا 'پربودھ باکیہ' یا 'ہتوپودیش' کے نام سے اُڑیا میں منظوم ترجمہ کیا تھا جو 1869 میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے اردو اور اُڑیا کو ملا کے غزل کہی تھی جو صنعت ذوالّلسانین کا نیا تجربہ تھا۔ ان کا یہ شعر اُڑیسہ میں بہت مشہور ہے:

حسن کا نور صنم ہے جو ترے تن میں بھرا
چاہیں دیبوٹی موتے چندرمکھی سورگ ترا

(دوسرے مصرع کا اردو ترجمہ ہے:

اے ماہ لقا، اے آسمان کے تارے، میری طرف بھی ایک نظر دیکھ)

(2) مولوی سید عمر علی نے میر حسن کی مثنوی 'سحرالبیان' کا 'پرنیہ منجری' کے نام سے اُڑیا میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔

(3) اشرف علی خاں اُڑیا کے سب سے اول اور سب سے اہم فکشن نگار فقیر موہن سیناپتی کے مشہور ناول 'ماموں' (پہلے ایڈیشن) کا پیش لفظ لکھا۔ یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں ہے۔ بعد میں یہ پیش لفظ 'فقیر موہن پری کرما' (1955) میں شامل ہوا۔ اشرف علی کی کتاب 'ادبھوت سکھائی' (1927) میں بالیسر پاجا تنتر پریس سے شائع ہوئی تھی۔

(4) عبدالعزیز عاشق اردو اور اُڑیا دونوں زبانوں میں لکھتے تھے اور اردو کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ انھوں نے قاسم علی لکھنوی کی نظم 'حیرت افزا' کا 'آسچر چرجیہ گھٹنا' کے نام سے منظوم ترجمہ کیا تھا جو 1902 میں شائع ہوا تھا۔ موصوف نے 1931 کے لگ بھگ 'گلِ صنوبر و کہانی' اور 1935 میں 'بدیا سندری اپنیاس' لکھی۔ موخرالذکر کا پلاٹ 1934 کے بہار کے زلزلے کے ارد گرد گھومتا ہے۔

(5) شیخ منصور نے قرآن شریف کا پہلی بار 'کوران و آلوک' کے نام سے اُڑیا میں ترجمہ کیا جو 1951 میں پرجاتنتر پریس، کٹک سے شائع ہوا۔

(6) مولوی رحمت علی نے 'سر محمد اقبال' کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا، وہ 1946 سے اُتکل یونیورسٹی کے میٹرک کے اُڑیا نصاب میں شامل تھا۔ اُڑیا کے قارئین کو اردو کے کسی شاعر سے روشناس کرانے کی یہ پہلی کوشش تھی۔

(7) اسمٰعیل آذر نے اُڑیا کے مزاح نگار فتورانند کے ساتھ مل کر مجتبیٰ حسین کے فکاہیہ مضامین کا اُڑیا میں ترجمہ کیا۔ موصوف کو کٹک بلا کر 'ہاسیہ رتن' کے خطاب سے نوازا گیا۔

اُڑیسہ میں اردو شعر و ادب کی روایت بہت مستحکم ہے جس کی تفصیل حفیظ اللہ نیولپوری کی ضخیم تصنیف 'اُڑیسہ میں اردو' (مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، 2001) میں موجود ہے۔ بس اتنا جاننا کافی ہوگا کہ 1660 سے 1667 کے درمیان عبدالقادر بیدل کا قیام کٹک میں تھا جہاں سے انھوں نے اردو اور فارسی میں شعر گوئی شروع کی۔ ہردے رام جودت جن کا ذکر نساخ، شورش وغیرہ کے تذکروں میں آتا ہے، کٹک ہی میں پیدا ہوئے۔ جسٹس سید امیر علی جو Spirit of Islam اور History of Saracens جیسی کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت یافتہ ہیں، ان کی جائے پیدائش کٹک ہے۔ اُڑیسہ میں انیسویں صدی کے تین صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں امین اللہ چرخی، عبدالمجید بھویاں اور معلم سمبل پوری جن کے شعری مجموعے زیورِ طباعت سے آراستہ ہوچکے ہیں۔

(8) شیخ مبین اللہ نے سید مظفر حسین برنی کی مشہور کتاب 'محبِّ وطن اقبال' کا 'دیش پریمی اقبال' کے نام سے ترجمہ کیا۔

جو 1988 میں اُڑیسہ اردو اکادمی کی جانب سے شائع ہوا۔

(9) ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری نے عبدالصمد کے مشہور ناول 'دو گز زمین' کا 'دوئی گج جمی' کے نام سے ترجمہ کیا ہے جسے ساہتیہ اکادمی، شاخ کولکاتا نے شائع کیا ہے۔

(10) قدرت علی قدرت کا اُڑیا شعری مجموعہ 'نچی نچترا' (2000) شائع ہوچکا ہے۔

انھوں نے اُڑیا نثر میں 'مہامانب حضرت محمدؐ' کے نام سے (2010) میں ایک ضخیم سیرت النبی لکھی ہے۔

(11) ڈاکٹر نسیمہ بیگم نے متعدد اردو افسانوں کا اُڑیا میں ترجمہ کیا ہے جو اُڑیا کے ادبی رسالے 'جھنکار' میں مسلسل چھپتے رہے ہیں۔

(12) اُڑیسہ اردو اکادمی نے (2004) میں اُڑیا-اردو-اُڑیا ڈکشنری شائع کی ہے۔

اُڑیسہ میں اردو شعر و ادب کی روایت بہت مستحکم ہے جس کی تفصیل حفیظ اللہ نیولپوری کی ضخیم تصنیف 'اُڑیسہ میں اردو' (مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، 2001) میں موجود ہے۔ بس اتنا جاننا کافی ہوگا کہ 1660 سے 1667 کے درمیان عبدالقادر بیدل کا قیام کٹک میں تھا جہاں سے انھوں نے اردو اور فارسی میں شعرگوئی شروع کی۔ ہردے رام جودت جن کا ذکر نساخ، شورش وغیرہ کے تذکروں میں آتا ہے، کٹک ہی میں پیدا ہوئے۔ جسٹس سید امیر علی جو Spirit of Islam اور History of Saracens جیسی کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت یافتہ ہیں، ان کی جائے پیدائش کٹک ہے۔ اُڑیسہ میں انیسویں صدی کے تین صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں امین اللہ چرخی، عبدالمجید بھویاں اور معلم سمبل پوری جن کے شعری مجموعے زیورِ طباعت سے آراستہ ہوچکے ہیں۔ بیسویں صدی کے سب سے اہم شاعر امجد نجمی اُڑیا شاعر رادھا ناتھ رائے اور گوپ بندھوداس کی شاعری سے متاثر ہوکر فطری، سیاسی، سماجی اور قومی نظمیں لکھنے لگے۔ بعد میں موصوف ترقی پسندی اور جدیدیت سے بھی متاثر ہوئے۔ اُڑیسہ کی نئی نسل نے امجد نجمی کی نظم گوئی سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ یوں تو امجد نجمی نے 'قلعۂ کٹک'، 'صبحِ جوہرا'، 'شامِ تلسی پور'، 'انی کٹ'، 'دسہرے میں' جیسی سرزمینِ اُڑیسہ سے متعلق متعدد نظمیں کہی ہیں، لیکن ان کی نظم 'چلیکا' کا ذکر اس لیے بار بار آتا ہے کہ یہ نظم رادھا ناتھ رائے کی مشہور اُڑیا نظم 'چلیکا' کی طرز پر کہی گئی ہے۔ راقم الحروف نے 'لفظوں کا آسمان' کے نام سے سیتا کانت مہاپاتر کی منتخب نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا جو نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی کی جانب سے 1984 میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کا 'تعارف' مالک رام نے لکھا تھا اور 'پیش لفظ' وزیر آغا نے۔ علاوہ ازیں راقم السطور نے سیتا کانت کی شعری تصنیف 'شبدر آکاش' کو 'لفظوں کا آکاش' کے نام سے ترجمہ کیا جو 2000 میں ساہتیہ اکادمی کی جانب سے شائع ہوا اور اس کتاب کے لیے راقم کو ساہتیہ اکادمی کی طرف سے ٹرانسلیشن ایوارڈ برائے 2004 سے نوازا گیا۔ اس ہیچ مداں کے علاوہ حفیظ اللہ نیولپوری، شیخ مبین اللہ اور نسیمہ بیگم نے اُڑیا زبان کے صفِ اول کے متعدد افسانوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ محمود بالیسری نے اپنی تصنیفات 'اُڑیسہ کی لوک کہانیاں' (1989)، 'اُڑیا ادب کی مختصر کہانی' (1999) اور 'ہندوستان کی تیرہ علاقائی زبانیں' (2012) کے ذریعے اردو کے تشنگانِ شوق کو اُڑیا زبان و ادب کے آبِ کوثر سے سیراب کیا ہے۔

اُڑیسہ کے دیگر جدید شاعروں کی طرح راقم الحروف نے بھی اپنی اردو شاعری میں اُڑیا شاعری کی روح کو جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ پندرہویں صدی کے پنچ سکھا دور کے شاعر جگن ناتھ داس کے ایک عارفانہ شعر سے متاثر ہوکر راقم نے یہ شعر کہا ہے:

ایک ہی آکاش کا سب آبگینوں میں ہے عکس
توڑ کر تم ایک کردو تو وہی ہے انعکاس

اسی طرح سیتا کانت مہاپاتر نے اپنی پوری نظم 'گھاس کے پھول' میں جو بات کہی ہے، میں نے غزل کے ذیل کے شعر میں ایجاز و اختصار کے ساتھ اُسی خیال کو یوں ادا کیا ہے:

کِھلا ہے گھاس کا اک پھول زرد موسم میں
بلاؤ نامہ نگاروں کو اس خبر کے لیے

غرض کہ گزشتہ کئی صدیوں سے اُڑیسہ میں اُڑیا اور اردو زبان و ادب ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہوئے دونوں زبانوں کے فنکاروں کو تخلیقِ شعر و ادب پر مہمیز کرتے رہے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی، اس ہم سفری اور ربطِ باہمی کا سلسلہ جاری رہے گا۔

■

Prof. Karamat Ali Karamat, .C/o Kamran Publications, Rahmat Building, Dewan Bazar, Cuttack - 753001 (Odisha)

تلگو زبان میں مستعمل اردو الفاظ

ستار ساحر

دنیا کی مختلف اقوام میں شیر وشکر ہوکر زندگی بسر کرنے کا واحد ذریعہ ایک دوسرے کی تہذیبی، تمدنی ومذہبی خصوصیات سے واقفیت ہے اور اس غرض کو پورا کرنے کا واحد ذریعہ زبان ہے کیونکہ کسی قوم کی زبان محض تبادلۂ خیال کا ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ اس کی تمدنی، تہذیبی اور مذہبی خصوصیات کا آئینہ بھی ہوتی ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے مل جل کر زندگی گزارنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فنونِ لطیفہ سے متعلق بے شمار شعبوں میں ایک دوسرے کے اثرات مرتب ہوئے بالخصوص زبان و ادب پر۔ دراصل مختلف تہذیبوں کے سنگم کا نتیجہ ہے کہ اردو شعر وادب نے پہلے دکن میں تو بعد میں دلی میں ارتقا کی منزلیں طے کیں۔ حقیقتاً ہندوستان پر 800 سال کے طویل عرصے پر محیط مسلمانوں کی حکومت پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی زبانوں کے ادب اور ان کے کلچر نے پورے ہندوستان کو ہر زاویے سے متاثر کیا ہے۔

دکن کی ریاستوں میں قطب شاہیوں کے عہد پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں شمال میں گوداوری تو جنوب میں گنگا بھدرا ندی جغرافیائی حدود متعین ہوئے۔ یعنی ریاست آندھرا پردیش کا زیادہ حصہ مسلمانوں کی حکمرانی میں آیا اور اس دور میں تلگو والوں کی تہذیب نے ایک نیا رخ اختیار کیا بیشتر ہندو اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کی بنا پر درباری امور میں سہولت کے لیے اپنی مادری زبان تلگو کے علاوہ اردو بھی سیکھتے رہے اور ان کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی اردو زبان سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی بھلے ہی اس کی شکل و صورت ہندوستانی یا دکھنی رہی ہو۔

اُس کے بعد آصف جاہی حکمرانوں میں نواب محبوب علی خاں (1890) کے زمانے میں عدالت کی کارروائیوں کو اردو زبان میں لکھنے کا حکم دیا گیا۔ زمینوں اور بندوبست سے متعلق کاموں میں بھی اردو زبان استعمال کی جانے لگی۔ 1894 میں قریوں کی سطح پر پٹیل اور پٹواریوں کے لیے عوام کی عرض داشتیں اور خطوط تلگو زبان میں تحریر کرنے کی گنجائش نکالی گئی تو تلگو زبان میں اردو کے الفاظ داخل ہوگئے۔ 1918 میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا اور اردو کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت حاصل ہوئی تو صوبۂ آندھرا پردیش میں اردو اور تلگو زبانوں کی قربت میں مزید اضافہ ہوا۔

ہر زبان میں الفاظ دو قسم کے ہوتے ہیں (1) دیسی یا ملکی Indigenous (2) پردیسی یا غیر ملکی Foreign۔ زبان میں نئے الفاظ کی شمولیت کی اصل وجہ Borrowing مستعار لینا ہے اسی لیے عموماً ایک زبان میں بات کرنے والے جب کسی جذبہ یا خیال کے اظہار کے لیے اپنی زبان میں الفاظ نہیں پاتے تو قریبی تعلق رکھنے والی زبان سے ان الفاظ کو قبول کر لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں حکمرانوں کی زبان کے الفاظ محکوموں کی زبان میں رواج پاتے ہیں۔ دراوڑی خاندان سے تعلق رکھنے والی تلگو زبان کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا کہ اُس نے قدیم دور سے ہی مختلف زبانوں کے الفاظ کی کثیر تعداد کو اپنی زبان میں شامل کر لیا۔ خاص طور پر اردو زبان کے الفاظ تلگو زبان بولنے والوں کی سماجی اور سیاسی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گئے۔ تلگو زبان میں استعمال ہونے والے اردو الفاظ کو 22 طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(1) انتظامی سطح پر تلگو زبان میں مستعمل اردو الفاظ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تلگو پر اردو کے اثرات کافی گہرے رہے ہیں غالباً اس لیے بھی کہ زبان پر اثرات کا آغاز اُس زمانے میں ہوا جب مسلمان حکمرانی کر رہے تھے اور درباری ودفتری معاملات اردو ہی میں انجام پاتے تھے یہاں ایک پہلو کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ تلگو زبان میں اردو کے یہ الفاظ بعض جگہ ہو بہو، تو کہیں تلگو زبان کے مزاج اور قواعد (صرفی ونحوی) کے مطابق نیز صوتی آہنگ اور اس کی ضروریات کے پیشِ نظر تھوڑے سے تغیر وتبدل کے ساتھ استعمال کیے جا رہے ہیں، مثلاً:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
خرچ	کھرچو	ضبط	جپتو
تعلقہ	تالوکا	ضلع	جلا
زمین دار	جمین داری	نواب	نوابو
نوکر	نوکرو		

البتہ' چندہ، چاکری، حوالہ اور حامی' جیسے اردو الفاظ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور یہ تلگو زبان میں بھی اردو تلفظ کے مطابق مستعمل ہیں۔

(2) عدالتی (قانونی سطح) معاملات میں جو اردو الفاظ تلگو زبان میں مستعمل ہیں ان میں چند قابل ذکر یہ ہیں:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
عدالت	عدالتو	خونی	کھونی
چوری	چوری	دعویٰ	دعویٰ
لوٹی/لوٹ	لوٹی	امینہ/امین	امینہ
وکیل	وکیلو		

(3) اشیا کے ناموں میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جس کا تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ مثال کے طور پر:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
عطر	اترو	قلم	کلم/کلمو
کاغذ	کاگتم		

(4) لباس سے متعلق اہم بات یہ ہے کہ تمام ہندوستانی عام حالات میں ایسا لباس زیب تن کرتے ہیں جس کو مجموعی طور پر کسی ایک مذہب کا لباس قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لباس سے تعلق رکھنے والے چند اردو الفاظ کا جو تلگو زبان میں مستعمل ہیں:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
قمیص	کمیچو	زری	جری
پاجامہ	پائجامہ	چڈی	چڈی
لہنگا	لنگا	لنگی	لنگی
لنگوٹ/لنگوٹ	لنگوٹا		

(5) صنعتی (تجارتی) امور میں اردو الفاظ کا استعمال واضح ہے کہ تلگو زبان میں کئی الفاظ جابجا نظر آتے ہیں مثلاً:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
دکان	دکانم	کرایہ	کرائی
خرید	کھریدو	چھٹا/چلر	چلرا
کوٹھی	کوٹھی	رسید	رسیدو

(6) زراعت پیشہ لوگ اپنی تلگو بول چال میں اردو کے بیشتر الفاظ بلا تکلف روانی سے استعمال کرتے ہیں گویا وہ تلگو زبان ہی کے ہیں، مثالیں:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
بنجر	بنجرو	محصول	محصولو

روپیہ	رسومو	گتا	گتا

(7) پیشے کی بات کیجیے تو لوگوں میں مختلف کام کرنے والے ہیں اور جیسا کام ویسا نام تو دستور زمانہ ہے اس سلسلہ میں بھی تلگو زبان میں اردو الفاظ کا استعمال ناگزیر رہا ہے، جیسے:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
قصائی/قسائی	کسائی	قلم کار/قلم کاری	کلم کاری
درزی	درجی	دائی/دایہ	دائما

(8) زیورات کے بعض نام اور تزئین و آرائش کے موقع پر استعمال میں آنے والی بیشتر اشیا کے لیے بھی تلگو زبان میں اردو الفاظ کا رواج ملتا ہے۔ مثالیں:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
جھمکا/جھمکے	جمکی	بندا/بندے	بندے
ٹیکا	ٹیکا		

(9) جذبات و کیفیات کے اظہار کے لیے بھی تلگو زبان میں اردو الفاظ کا استعمال ناگزیر رہا ہے تاکہ بہتر اور موثر انداز میں ادائیگی ہو۔ مثلاً:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
کیف	کیپو	نشہ/نشا	نشا
خراب	کھرابو	حامی	حامی
شمار	سومارو		

(10) ذات پات اور طبقات و فرقوں کی نشان دہی کے لیے اردو میں جو الفاظ مستعمل ہیں وہی تلگو زبان میں استعمال کیے جاتے ہیں اور انھیں سب آسانی سے سمجھ پاتے ہیں، جیسے:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
غلام	گولاموا/گلام	ترک	ترکا
فرنگی	پرنگی	بی بی	بی بی
محمدی	محمدی		

(11) فوجی معاملات میں چند مستعمل اردو الفاظ درج ذیل ہیں:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
سپاہی	سپائی	شکاری	شکاری
مجمع/پٹالم	پٹالمو		

(12) گھریلو زندگی کی ضروری اشیا پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ تلگو زبان اردو الفاظ سے اپنا دامن ہرگز بچا نہیں پائی۔ مثالیں:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
سامان	سامانو	کرسی	کرچی
پھنکا	پنکا	چمچہ	چمچا

(13) واستو کے معنی تعمیر مکان میں یہ طے کرنا کہ گھر کے دروازہ کا رخ کس سمت ہونا چاہیے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ باورچی خانہ، دیوان اور دیگر کمرے کہاں ہوں گے۔ عمارت میں جو چیزیں استعمال کی جاتی ہیں ان کے لیے بھی تلگو زبان میں اردو الفاظ مستعمل ہیں۔ مثال کے طور پر:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
کنکر	کنکرا	دروازہ	درواجا
گچ	گچو	کھڑکی	کٹی کی
رستہ	رستہ		

(14) مقام یا زمین سے متعلق بات چیت کے دوران مستعمل اردو الفاظ بھی تلگو زبان میں نظر آتے ہیں، مثلاً:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
جگہ	جاگا	جنگل	جنگل
بستی	بستی	بازار	باجارو/بجارو

(15) کھانے کی چیزیں بعض ایسی ہیں کہ ان کے لیے اردو کے جو الفاظ تلگو زبان میں استعمال کیے جاتے ہیں ان میں تلفظ کا وہ فرق بھی نظر نہیں آتا جو اس سے قبل کہیں محسوس ہوا۔ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
لڈو	لڈو	سموسا	سموسا
حلوا	حلوا	قلاقند	کلاکنڈہ
شکر	چکرا	مسالا	مسالا
چٹنی	چٹنی		

(16) زمانہ کی اطلاع کے لیے جو اردو الفاظ تلگو میں مستعمل ہیں ان کی مثالیں:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
روز	روجو	دور/حیام	حیام
سال	سالو		

(17) دین و مذہب کے معاملات یوں بھی نجی و ذاتی ہوتے ہیں اردو کو بیشتر صوبوں میں مسلمانوں نے مادری زبان کی حیثیت سے اختیار کرلیا ہے لہٰذا اردو اور مذہب اسلام کا رشتہ دیگر ہندوستانی زبانوں سے زیادہ گہرا ہے اس باہمی تعلق کی بنا پر دین و مذہب سے متعلق چیزوں کے لیے اردو میں مستعمل الفاظ تلگو زبان میں بھی بالکل اسی طرح استعمال میں آتے ہیں حتی کہ پورے تقدس کے ساتھ۔ مثلاً:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
قرآن	قرآن	انجمن	انجمنو
درگاہ	درگا	نماز	نماجو
فقیر	فکیرو	رمضان	رمجانو
افطار	افطارو		

(18) رسم و رواج کی ادائیگی کے موقعوں پر بھی اردو الفاظ، تلگو میں گفتگو کرنے والوں کی زبان پر آ ہی جاتے ہیں اور بے ساختہ۔ جیسے:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
شادی	شادی	پردہ	پردہ
گوشہ/گوشا	گوشا		

(19) ہتھیاروں کے لیے تلگو زبان میں مستعمل اردو کے چند الفاظ یہ ہیں:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
چاقو	چاکو	کٹار	کٹارو
بندوق	بندوکا	تمنچہ	تپاکی

(20) درختوں میں:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
کھوپرا	کوبری	پودینہ	پودینہ

(21) پھلوں میں:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
خربوزہ	کھربوجا	نارنجی	نارنجہ
کسمش	کشمش		

(22) اناج میں:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
دھنیا (کشنیز)	دَنیالو	بٹھانی	بٹانی

تلگو زبان میں مستعمل مذکورہ بائیس (22) طبقات پر مستعمل اردو الفاظ پر غور کریں تو واضح ہوگا کہ بے شمار الفاظ کے آخر میں ا، آ، ای اور او جیسی آوازوں کا اضافہ ہوا ہے جس کو تلگو زبان نے احتراماً اپنے خاص انداز میں اپنایا ہے۔ اردو ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں کے ساتھ بھی تلگو زبان نے یہی رویہ اختیار کیا ہے۔ ذیل میں مزید چند مثالیں درج ہیں:

اردو	تلگو	اردو	تلگو
برطرف	برطرپو	پھرانا	پھراانچو
بیزار	بیجارو	تاکید	تاکیدو
زبردست	جبردستو	چھتری	چتری
بھٹی	بٹی	تاکید	تاکیدو
پہرا	پہرا/پارا	چھٹی	چٹی/چیٹی
بقایا	بکائی	قسط	کستی

تلگو زبان میں اردو الفاظ کثیر تعداد میں مستعمل ہیں اور اس کی فہرست خاصی طویل ہے اس مقالے میں چند اہم الفاظ کی نشان دہی کی گئی ہے دراصل دونوں زبانوں پر باہمی اثرات اس قدر واضح ہیں کہ گردش روز و شب اس کو متاثر نہیں کرسکے گی۔

■

Prof. Sattar Sahir, Dept of Urdu, S.V University, Tirivpati - 517502 (AP)

اردو مراٹھی کے باہمی روابط

سید یحییٰ نشیط

مختلف قوموں کے باہمی ارتباط واختلاط اور آپسی میل جول سے ایک دوسرے کا تہذیبی اور معاشرتی لحاظ سے متاثر ہونا فطری عمل ہے۔ روابطِ باہمی کے ان اثرات کے نقوش فن وادب پر بڑے گہرے مرتسم ہوتے ہیں۔عملِ ارتسام کا یہ تواتر ادب کی تاریخ سازی کرتا ہے۔ اسے نیا موڑ دیتا ہے اور نئے رنگ وآہنگ سے آشنا کرتا ہے۔

اس ضمن میں جب ہم مہاراشٹر کی ادبی فضا میں اردو اور مراٹھی ادب وزبان کا جائزہ لیتے ہیں تو دونوں زبانوں کے فن پاروں کو ایک دوسرے کی ادبی تہذیب سے متاثر پاتے ہیں۔تہذیب کا یہ ارتباطی سلسلہ بڑے لمبے عرصے پر محیط ہے۔چنانچہ معلوم تاریخ کے مطابق مہاراشٹر میں مسلمانوں کی بود وباش اور تہذیب وتمدن کے آثار آٹھویں صدی عیسوی سے پائے جاتے ہیں۔ راشٹر کوٹا سلاطین کے دورِ حکومت میں 'چول' اور 'تھانہ' میں مسلمان بستیوں کی نشان دہی مسعودی اور یاقوت نے اپنی کتابوں میں کی ہے۔

اتحاد واشتراک کی بدولت یہاں کا ہندو مسلم کلچر ایک دوسرے کو متاثر کرتا رہا اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتا رہا۔ اس پر مستزاد یہاں کی روحانی تعلیم ،جس کے سوتے صوفی سنتوں کے اندرون سے پھوٹے، انھوں نے ظاہری رنگ ڈھنگ کو اجالنے کی بجائے باطن کو مجلیٰ کیا اور نفس کا تجزیہ کرتے رہے۔ان کی کومل وانی ،محبت واخوت اور ہمدردی کے جذبات عالیہ نے عوام الناس کو موہ لیا اور یہ بے تاج بادشاہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے لگے۔ چنانچہ ہندو سنتوں کے ساتھ ساتھ مسلمان صوفیوں نے بھی یہاں روحانیت کی تعلیم کو عام کیا۔اس کے لیے انھوں نے سماج میں رائج عوامی زبان کو اپنایا۔غرضکہ خسروانہ جاہ وجلال اور درویشانہ فقر وحال کے مابین یگانگت اور بھائی چارے کے ساتھ 'اردو' زبان وادب کی بھی نشو ونما ہوتی رہی۔ اس سازگار ماحول میں ہر دو زبانوں نے ایک دوسرے کے اثرات کو فراخ دلی سے قبول کیا اور اپنی ادبی روایات کو یہاں کی تہذیب وتمدن کے مطابق ڈھالنے کے عمداً جتن کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم اردو (دکنی) ادب میں مراٹھی تہذیب کی جھلکیاں عموماً ہر جگہ نظر آتی ہیں۔

دراصل زبان وادب کی نشو ونما اور اس کے فروغ و تشہیر میں ایسا ہی ماحول سازگار ہوتا ہے۔ سماج میں محبت واخوت کی اساس جب مضبوط ہو جاتی ہے تو تبادلۂ خیالات کو آزاد فضا ملتی ہے اور لوگ آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اظہارِ بیان کے لیے یہ ایسی زبان ہوتی ہے جس میں ایک دوسرے کے الفاظ غیر محسوس طریقے پر مستعار لیے جاتے ہیں لیکن بعد میں انھیں لوٹایا نہیں جاتا۔ اگر حکومت کی سرپرستی اور عوام میں مقبولیت بھی زبان کو حاصل ہو جائے تو اس کی ترقی و ترویج میں زبردست اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سقوط دیوگری کے بعد مسلم حکمرانوں کے ہمراہ عوام الناس کی کثیر تعداد نے دکن کی طرف مراجعت کی تو ان میں سے اکثر یہیں کے ہو رہے۔ یہ لوگ ترکی النسل مسلمان تھے،اس لیے دکن میں وارد ہونے کے بعد یہاں کی مقامی زبان مراٹھی میں مسلمان اور ترک ہم معنی الفاظ بن گئے۔ مراٹھی کے ہندو شعرا نے ان نو واردین کو 'ترک' کہہ کر مخاطب کیا۔سنت ایکناتھ کی نظم 'ہندو ترک سنواد' اس پر دال ہے۔ اسی طرح مسلمان صوفیوں اور شعرا نے بھی یہاں کی مقامی لفظیات کو بڑی فراخ دلی سے قبول کیا۔ نظامی کی مثنوی 'کدم راو پدم راؤ' میں مراٹھی الفاظ اور محاورات کی بہتات اس امر کی شہادت دیتے ہیں۔ دونوں زبانوں کے الفاظ کے لین دین کا یہ باہمی رواج مراٹھی کے سنت شاعر نامدیو(م 1350) کے زمانے سے پایا جاتا ہے، جو حضرت امیر خسرو کے معاصرین میں مانے جاتے ہیں۔ الفاظ کا یہ لین دین عادل شاہی دور میں خوب ترقی کر گیا تھا۔اسی زمانے سے مراٹھی اصنافِ ادب کی تقلید اردو میں ہونے لگی تھی لیکن نویں صدی ہجری کی ابتدا ہی میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اس روش پر چل پڑے تھے۔ 'شکار نامہ' جو ان سے منسوب نثری تصنیف ہے ،اس میں مراٹھی صنف بھاروڑ کی تقلید کی گئی ہے۔ بھاروڑ مراٹھی شاعری کی قدیم صنف ہے سنت شعرا نے رمز وابہام میں ویدانتی نکات کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کے لیے بھاروڑ کا سہارا لیا ہے۔ اس صنف میں رمز وابہام کی تہیں پے در پے ہوتی ہیں۔ تین چیزوں کا منفی اثبات اور چوتھی کا انکار۔ غرضکہ چاروں انکار سے حقیقت کو آشکار کیا جاتا ہے۔

بھاروڑ کی طرح 'کلغی طرہ' بھی ایک مراٹھی صنف شاعری ہے۔ یہ صنف مراٹھی میں نکڑ ناٹک کی مانند ہے۔دف اور یک تارے کی دھن پر شاعروں کے دو گروہ شعری اسلوب میں آپس میں سوال جواب کرتے ہیں جواب دینے میں جو گروہ ناکام ہو جاتا ہے اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور فاتح گروہ کا استقبال تالیاں بجا کر کیا جاتا ہے۔علاقۂ برار میں عید، بقرعید اور محرم کے مہینے میں کلغی طرے کا مقابلہ اردو شاعری میں ہوا کرتا تھا۔کھام گاؤں (ضلع بلڈانہ) کے امیر خان خنجر طرے کے شاعر تھے اور عبدالکریم شائق کلغی کے شاعر تھے۔ ان کی نوک جھونک سے سامعین محظوظ ہوتے تھے۔اب دھیرے دھیرے یہ چلن ختم ہوتا جا رہا ہے۔

'لاونی' مراٹھی شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ارضی عشق کی تمام تر لمسیاتی کیفیات کی ترجمانی اس صنف میں نہایت مؤثر انداز میں کی جاتی ہے۔ ساہو مہاراج کے معاصر شیخ سلطان مراٹھی کے زبردست لاونی کار گزرے ہیں۔ان کی لاونیوں میں 'پیاری' کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اس طرزِ خاص سے ہمیں اردو کے واسوخت گو شعرا انشا اور جرأت یاد آجاتے ہیں لیکن ان کی شاعری میں لمسیاتی کیفیات اور جذباتی پراگندگی کا بیان 'اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی' سے آگے نہیں بڑھتا، اس کے برعکس مراٹھی لاونی کی تمام تر خصوصیات علی عادل شاہ ثانی شاہی، قلی قطب شاہ اور ہاشمی کے یہاں وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں۔

'پواڑا' خالص مراٹھی صنف شاعری ہے۔ مراٹھی شعرا نے شیواجی کی فتوحات پر بہت سارے پواڑے گائے ہیں۔ حسن اتفاق کہ اس صنف میں نام کمانے والے اکثر شعرا مسلم رہے ہیں۔ان میں سگن بھاؤ، شاہ علی قادر، لہری حیدر اور امر شیخ کافی مشہور ہوئے۔ پواڑا ایک قسم کا رزمیہ ہی ہوتا ہے۔اس میں جنگ کے واقعات، ہیرو کے حالات ،اس کی شجاعت اور دلیری کو دف اور یک تارے کی دھن پر گایا جاتا ہے۔نظم کے درمیان بار بار نعرے بازی کی وجہ سے جوش اور ولولہ پیدا کیا جاتا ہے۔ دکنی اردو میں 'جنگ بہادر' کے عنوان سے 1820 میں ایک

پواڑا لکھا گیا تھا۔ اس پواڑے کا شاعر کم سواد اور مجہول الاسم ہے۔ نوائے ادب ممبئی کے 1955 کے شمارے میں اس کا تعارف کرایا گیا تھا۔ اس پواڑے میں پانی پت کی تیسری جنگ کے واقعات نظم ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور دیگر کئی موضوعات ہیں جن کے نقوش اردو ادب کے اوراق پر مرتسم ہوئے ہیں۔ چنانچہ دکن کے ایک غیر معروف بزرگ سید امین کا ایک رسالہ 'مجذوب السالکین' ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد میں موجود ہے۔ اس رسالے میں مصنف نے مراٹھی کے سنت شاعر گیانیشور، تکارام، ایکناتھ وغیرہ کے اقوال درج کیے ہیں۔ شاہ تراب چشتی کی ''من سمجھاون'' مراٹھی کے سنت رام داس کی مناچے شلوک سے متاثر ہوکر لکھی گئی تصنیف ہے۔ مراٹھی کے صوفی شاعر شاہ مرتضیٰ بہمنی (م 1650) نے 'پنچی کرن' کے عنوان سے مراٹھی اردو لغت ترتیب دی تھی۔ اس میں ادھیاتم سادھنا کی اصطلاحات کے عربی، فارسی اور اردو متبادلات دیے گئے تھے۔ مراٹھی ہی کے مشہور صوفی شیخ محمد نے اپنی مراٹھی تخلیقات میں دکنی زبان کا استعمال کرکے قرآن واحادیث کی کئی باتیں بیان کی ہیں۔ ان کی کتاب پن چیج مسلمانی میں کچھ اس قسم کے اشعار ملتے ہیں

دونوں انکھیاں کا اینچ دیکھنا
دوی بھاشا ورنیلا اینچی زانا

صوفی شعرا کی طرح مراٹھی کے سنت کویوں نے بھی دکنی اردو میں شاعری کی ہے۔ یہ لوگ تسبیح وزنار میں ایک ہی 'ریسماں' کے قائل تھے اور چراغ دیر اور شمع حرم میں ایک ہی نور کو جلوہ گر پاتے تھے۔ ایکناتھ مہاراج نے 'ہندو ترک سنواد' میں دونوں قوموں کو قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ ایکناتھ مہاراج نے دکنی میں نعتِ رسولؐ لکھ کر عاشقانِ رسول میں اپنا نام لکھوالیا ہے۔ علاقۂ برار میں بیسیوں سنت ہوئے ہیں، جنھوں نے اردو کی خدمات انجام دیں۔ مثلاً امراوتی ضلع کے ٹکڑو جی مہاراج عوام الناس سے کچھ اس طرح مخاطب ہوتے ہیں:

گر عشق ہے اللہ سے تو کفر کیا اسلام کیا
کچھ بھید ان کو ہے نہیں دکھ درد کیا آرام کیا
لاگی لگن جب مستکی، اپنے خدا کی راہ میں
تومال کیا دھن دھام ہے؟ ہے مست بے پرواہ میں

اردو زبان وادب پر مراٹھی ثقافت کے اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔ 'پھگڑی' مہاراشٹر کی مذہبی ثقافت میں ایک اہم مقام کی حامل ہے۔ ہندو عورتیں یہ کھیل ناگ پنچمی کے موقع پر کھیلتی ہیں۔ دو عورتیں اپنے اپنے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں دے کر گول گول گھومتی ہیں۔ اگر ہاتھ چھوٹ جائیں تو دور پھینکے جانے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ اردو میں اس قبیل کے 'پھگڑی نامے' بھی لکھے گئے ہیں۔ فرید، فقیر اللہ شاہ اور سید اصغر علی کے 'پھگڑی نامے' دکنی ادب میں مشہور ہیں۔ مراٹھی کے زاتے گیت (چکی کے گیت) کی طرز کے اردو میں 'چکی نامے' لکھے جانے کی روایت بھی ملتی ہے۔ مراٹھی میں مکتابائی، جنا بائی کے 'زاتے گیت' مشہور ہیں۔ اردو میں خواجہ بندہ نواز سے منسوب چکی نامہ سب سے قدیم مانا جاتا ہے۔ اس میں خواجہ صاحب نے اصلاح نسواں کے لیے اخلاقی درس دیا ہے۔ ان کے علاوہ میرانجی خدانما، اور فاروقی کے چکی نامے بھی مشہور ہیں۔ مراٹھی لوک ادب میں 'بھوپالی'، 'پالنا گیت' کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ اردو میں اسی قبیل کے 'لوری نامے' اور 'جھولنا نامے' لکھ کر اردو شعرا نے مراٹھی تہذیب کی رمق اپنے اشعار میں سمیٹ لی ہے۔ اردو میں جھولنا نامے لکھنے کی روایت سب سے پہلے شیخ بہاء الدین باجن کے یہاں ملتی ہے۔ علی محمد شیخ گامدھنی اور دکن میں شیخ محمود خوش دہاں اور غلام حسین ایلچ پوری نے بھی اس روایت کو اپنایا ہے۔ شمال میں نیاز بریلوی کے جھولنا نامے اور لوریاں مشہور ہیں۔

مراٹھی میں پنڈھر پور کے دیوتا پانڈو رنگ کی تعریف وتوصیف ہوئی ہے۔ ہندو شعرا کے ساتھ مراٹھی کے مسلم شعرا نے بھی اس عمل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ چنانچہ مراٹھی شاعر کمال کی دکنی میں ایک نظم 'پانڈورنگ' کی توصیف میں ملتی ہے۔ پانڈورنگ کی مدحت طرازی کا یہ سلسلہ عصرِ حاضر کے شاعر میراجی تک پہنچتا ہے۔

انھوں نے سنت تکارام کی مراٹھی نظم کے آزاد ترجمے میں پانڈورنگ کی مدح کی ہے۔ مراٹھی ثقافت کے یہ وہ اثرات ہیں جو اردو ادب پر بالراست پڑے ہیں۔

اردو میں مراٹھی الفاظ اور محاورات کا استعمال بھی ایک زمانے سے ہوتا رہا ہے، حتیٰ کہ میر کے یہاں بھی مجھے چند الفاظ ملے ہیں۔ رنگین کو تو باقاعدہ اس زبان میں درک حاصل تھا۔ حاتم کے یہاں لفظ 'پور'، سیلاب کے معنی میں یہیں سے آیا ہے۔ دکنی زبان میں تو وافر مقدار میں مراٹھی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے 'نکو' (نہیں)، 'ہو' (ہاں)، 'ان' (اور)، 'کاے کو' (کیوں)، 'کیا ہے کی' (پتہ نہیں) وغیرہ۔ صوبۂ مہاراشٹرا کی اردو میں افعال سے بنے بعض اسما کچھ اس طرح استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے گھبراہٹ سے گھبراٹ، مچلاہٹ سے مچلاٹ، مسکراہٹ سے مسکراٹ وغیرہ۔ واحد جمع کے طریقے میں جمع کے الفاظ میں 'زبر' سے پہلے آنے والا 'زیر' حذف کردیا جاتا ہے۔ مثلاً لڑکی سے لڑِکیاں دکنی اردو میں ''لڑکیاں بن جاتا ہے۔ اسی طرح مچھلیاں، مرغیاں، روٹیاں وغیرہ۔ مراٹھی محاورے بھی اردو میں استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے اجالا پاڑنا، آنگ میں آنا، مٹی دینا، دوراہی پھرانا، ہیجلا پاڑنا۔ بعض کہاوتیں بھی مراٹھی سے اردو میں آئی ہیں۔ مثلاً کاسواچی زھوپ، دور سے ڈونگر سہانے، ہاک نہ بونب، آبے لڈو جابے لڈو، دھیٹ کھائے میٹھ گریب کھائے گچاٹیا۔ ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ مراٹھی نے جس طرح اردو کے اثرات قبول کیے ہیں اسی طرح اردو نے بھی مراٹھی اثرات کو قبول کرنے میں پس وپیش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ دونوں بہنیں خندہ پیشانی سے ایک دوسرے کا ساتھ نبھاتے جا رہی ہیں۔ مراٹھی اور اردو ہر دو زبانیں ترجمہ کے ذریعہ بھی ایک دوسرے کو متعارف کرواتی رہی ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں مراٹھی کے کئی ادب پاروں کا اردو میں بڑے اہتمام سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ مراٹھی سے اردو میں ترجمہ کی گئیں بعض کتابوں کو تو ساہتیہ اکاڈمی کے انعامات سے بھی سرفراز کیا گیا ہے، مگر مراٹھی نے اس سلسلے میں زیادہ خلوص کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ مراٹھی کے ترجمہ ادب میں اردو کتابوں کی فہرست چند کتابوں سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ پھر بھی ان دونوں زبانوں میں مغائرت کی بجائے موانست ہی پائی جاتی ہے۔

بھاروڑ کی طرح 'کلغی طرہ' بھی ایک مراٹھی صنف شاعری ہے۔ یہ صنف مراٹھی میں نکڑ ناٹک کی مانند ہے۔ دف اور یک تارے کی دھن پر شاعروں کے دو گروہ شعری اسلوب میں آپس میں سوال جواب کرتے ہیں جواب دینے میں جو گروہ ناکام ہو جاتا ہے اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور فاتح گروہ کا استقبال تالیاں بجا کر کیا جاتا ہے۔ علاقۂ برار میں عید، بقرعید اور محرم کے مہینے میں کلغی طرے کا مقابلہ اردو شاعری میں ہوا کرتا تھا۔ کھام گائوں (ضلع بلڈانہ) کے امیر خان خنجر طرے کے شاعر تھے اور عبدالکریم شائق 'کلغی کے شاعر تھے۔ ان کی نوک جھونک سے سامعین محظوظ ہوتے تھے۔ اب دھیرے دھیرے یہ چلن ختم ہوتا جارہا ہے۔

■

Syed Yahya Nasheet
24, Kashana Kalgaon 445203, Yavatmal

بہار کی علاقائی زبانوں کا ادب اور اردو

قاسم خورشید

قدیم زمانے سے ہی بہار کے مختلف علاقوں میں عوامی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ جغرافیائی اور تہذیبی و ثقافتی فرق کی وجہ سے مختلف بولیوں کے لب و لہجے میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ بہار میں بولی جانے والی زبانوں اور بولیوں میں نمایاں طور میتھلی، انگیکا، بجیکا، مگہی اور بھوجپوری۔ یہ زبانیں اور بولیاں الگ الگ خطّوں میں استعمال ہوتی آئی ہیں۔ ان کی وجہ تسمیہ بھی اپنے مخصوص علاقوں کے نام پر ہے۔ یہ زبانیں اپنے عروج کے زمانے میں اکثر سرکاری استعمال میں بھی لائی جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان کی ترقی ہوئی اور ادبی تخلیقات بھی ہونے لگیں۔

بہار کے تمام علاقوں کے عوامی ادب میں کافی یکسانیت ہے کچھ مقامی عقائد، رسم و رواج اور خاندانی روایات ان کے ادب سے بھی واضح ہوتے رہے ہیں۔ عوامی قصّے، عوامی گیت اور ناچ گانے کا رواج پورے بہار میں ہے ان میں صرف لسانی حد تک تضادات ہو سکتے ہیں لیکن بقیہ تمام باتوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس بنیاد پر اگر دیکھا جائے تو بہار میں مختلف بولیوں اور زبانوں کو یوں دیکھا جا سکتا ہے۔

میتھلی زبان: بہاری بولیوں میں جو زبانیں شامل ہیں۔ ان میں میتھلی زبان نہایت اہم ہے۔ میتھلی دریائے گنگا کے شمال میں دربھنگہ اور اس کے اطراف میں بولی جاتی ہے۔ لسانی اعتبار سے میتھلی اور مگہی ایک دوسرے سے قریب ہیں جبکہ بھوجپوری ان دونوں سے قدرے مختلف ہے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی بھوجپوری کو میتھلی اور مگہی سے مختلف ایک علیحدہ زبان تصور کرتے ہیں۔

بہر حال بہار کی بولیوں میں میتھلی کو ایک اہم مقام حاصل ہے اور جیسا کہ پورے شمالی بہار کے بڑے حصّے کا نام میتھلی علاقہ ہے اس لیے اسی مناسبت سے اس علاقے میں بولی جانے والی زبان کا نام میتھلی رکھا گیا اس بولی نے اب زبان کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ یوں تو اس زبان کا رسم الخط دیوناگری ہے۔ لیکن ڈاکٹر ی چٹرجی کے مطابق ان کے علاوہ میتھلی برہمنوں کا ایک رسم الخط بھی ہے جسے میتھلی کہتے ہیں جو بنگالی رسم الخط سے ملتا جلتا ہے۔

میتھلی زبان کے اصل محرک میتھلی کے عظیم شاعر ودیاپتی ہیں انھوں نے ادب کے سرمایے میں بیش قیمت اضافہ کیا۔ ان کے نقش قدم پر چل کر بھوانی ناتھ، امرت کر، گج سنگھ، سنگھ بھوپتی، نزپ سنگھ، چندر گلا، کنس نرائن گوند کولی، جیوناتھ، سدا نند، بھیشم چتورنجھ، شیام سندر، ہری داس اور گنگا دھر وغیرہ شعرا نے اپنی بیش بہا خدمات سے میتھلی ادب کے ابتدائی سرمایے کو مالا مال کر دیا

میتھلی زبان کے دیگر اہم شعرا میں بھونیشور ناتھ بھون، بیدیہ ناتھ مشر، پاتری لال داس، بدری ناتھ جھا، منشی رگھونندن داس، سیتارام جھا، دینا ناتھ پاٹھک، بیدیہ ناتھ ملک، سرپندر جھا سمن، وشوناتھ جھا، اپندر ناتھ جھا، چندر بھان سنگھ، امریندر مشر، یوگیشور جھا، لوک پتی سنگھ، روپندر ناتھ ٹھاکر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ میتھلی کے ناول نگاروں اور کہانی کاروں میں ہری موہن جھا، سدھانشو شیکھر چودھری، اوماناتھ جھا، یوگا نند جھا، مایا نند مشر، راج کمل چودھری کلپنا شرن، سوم دیو، راج موہن جھا، گوند جھا، گنگیش گنجن، برج کشور ورما، دھمکیتو، شیلندر موہن جھا، اور نگیند رکمار وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مختصر یہ کہ جہاں دور قدیم اور دور وسطٰی سے میتھلی ادب صرف گیتوں تک محدود تھا اور ان میں موضوع کے تنوع کا فقدان تھا وہاں دور جدید اور خصوصاً آزادی کے بعد کے میتھلی ادب میں مختلف اصناف مروّج ہوئیں اور بیش قیمت تخلیقات منظر عام پر آئیں۔ میتھلی ادب روز افزوں ترقی سے ہمکنار ہو رہا ہے اس کی ترقیاتی رفتار ہنوز جاری و ساری ہے۔

مگہی: مگہی، ماگدھی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ماگدھی، مگدھ کی عوامی بولی تھی۔ ڈاکٹر گریرسن نے خالص مگہی اور پوربی مگہی کے نام سے اس کی دو شکل متعین کیے ہیں۔ پوربی مگہی علاقہ کے تحت کچھ ناگپوریا اور کرمالی علاقے کو تسلیم کیا گیا ہے۔ خالص مگہی پٹنہ اور گیا ضلعے، مونگیر کے دکھنی پچھمی حصّے ہزاری باغ ضلع کے اتری حصہ اور پلاموں ضلع کے تھوڑے سے پوربی حصے میں بولی جاتی ہے۔ سنگھ بھوم ضلع میں بھی کچھ لوگ خالص مگہی بولتے ہیں آج کی تاریخ میں مگہی بولنے والوں کی آبادی تقریباً پچھتر لاکھ ہے۔

مگہی زبان میں مطبوعہ ادب کی خاصی کمی ہے، حال کے دانش وروں نے اس طرف اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ اب تو کئی تحقیقی مقالے بھی مگہی ادب میں تیار ہو چکے ہیں۔ مگہی میں ادب عالیہ کی کمی خاص طور سے رہی ہے۔ اس لیے اس کے عوامی ادب میں ہی عوامی زندگی کی حقیقی عکاسی ہوتی ہے۔ اس کے عوامی گیت جذبات کی نزاکت اور شاعرانہ دلکشی کے نقطہ نظر سے اعلی درجے کے ہیں۔ بہار کی دیگر زبانوں کی طرح اس میں بھی تمام مواقع پر گائے جانے والے ہر قسم کے عوامی گیت دستیاب ہیں ان گیتوں میں موسم بہار کے جوش، برسات کے ہنڈولے، جدائی کا کرب، ماں باپ کی شفقت وغیرہ کے فطری جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

دادا ہو گیلئی بیٹی سیانی / ہمرا بر کھوج دہہ جی
نانا ہو گیلئی بیٹی سیانی / ہمرا بر کھوج دہہ جی
بیٹی ساتوں سلیہر بھلی جاہوں جی/تو ہرا بر بھلی جیتو جی
دادا ساتوں سلیہر بھلی گیلن جی / نانا ساتون سلیہر بھلی گیلن جی

ہمرا پرنہ مللن جی/گڑھ دو گڑھ دورے سونار
مانگو یکا جلے دار/گڑھ دو گڑھ دورے سونار
ناکو ہیسر جلے دار/گڑھ دو، گڑھ دورے سونار
ناکو بیسر جلے دار/گڑھ دو، گڑھ دورے سونار
کانو جھومک جلے دار/گڑھ دو، گڑھ دورے سونار
پاؤں پائل جلے دار/ پہنوں پہنوں جی دلہن
لینے آیا ہے پیکار/ جن کی لڑکی ہے دو چار
ان کی بک گئی موٹر کار/ جن کا لڑکا ہے دو چار
ان کی کھل گئی کاروبار/ دیکھو دیکھو رے سنسار
تیلک ہوتی ہے بیکار

اسی طرح یہ رنگ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ہرے ہرے مڑوے تلے ہردی تم لایو بنے
ہردی سے اپٹن لہر دار جھما جھم رے بنے
لاڈو تمھاری تبے وار جھما جھم رے بنے
ہرے ہرے مڑوے تلے مہدی تم لایو بنے
لالی سے اپٹن لہر وار جھما جھم رے بنے
گوری تمھاری تبے دار جھما جھم رے بنے

کہا گیا ہے کہ یہ گیت تحریری نہیں ہیں بلکہ یہ بولی کی سطح پر گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں کے بول ایک

گاؤں کے نہیں ہیں بلکہ یہ کئی گاؤں میں جو ایک دوسرے سے پچاسوں میل کے فاصلے پر واقع ہیں گائے جاتے ہیں لیکن ان گیتوں کو سن کر یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں اردو روپ نکھرا ہوا ہے۔ مگدھ کی غیر مسلم خواتین بھی گیت اور جھومر گاتی ہیں۔ جیٹھ اور چیت کے موقع پر جو گیت وہ گاتی ہیں یا ہولی اور چتیار جو مرد گاتے ہیں ان کی شعریات دوسری ہوتی ہیں ان میں اردو کا مزاج تقریباً ناپید ہوتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں خالص مگہیت ہوتی ہے۔ اس فرق سے اس امر کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ ایک علاقہ ہونے کے باوجود دو قوموں کے تہذیبی اور فکری سرمائے مختلف ہوسکتے ہیں لہٰذا اظہار کے وسائل میں بھی فرق ہو جاتا ہے۔ حسن و جمال اور پرواز تخیل اردو کی طرح مگہی میں بھی موجود ہے اس لیے مگہی اردو بھی ادبی چاشنی رکھتی ہے۔

بھوجپوری: یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ بھوجپوری زبان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ شاہ آباد ضلع میں ڈمراؤں کے قریب 'بھوجپور' نام کا ایک گاؤں ہے جس کی بنیاد پر اس زبان کا نام بھوجپوری رکھا گیا۔ قدیم زمانے میں بھوجپور اجین کے چھتری راجاؤں کی راجدھانی تھی۔ آج بھی اس نام کا پرگنہ ہے۔ ڈاکٹر پرسن کے مطابق بھوجپوری کا رقبہ بہار اور اتر پردیش کے ضلعوں میں تقریباً پچاس ہزار مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔

بہار میں بھوجپوری شاہ آباد، سارن، چمپارن، پلاموں اور رانچی (غیر منقسم بہار) کے کچھ حصّوں میں اور اتر پردیش کے مرزا (چنار) بنارس، غازی پور، بلیا، اعظم گڑھ، جونپور، گورکھپور، دیوریا اور بستی ضلع میں بولی جاتی ہے۔ صرف بہار میں بھوجپوری زبان بولنے والوں کی تعداد تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ ہے۔ ان کے علاوہ اس علاقے کے بہت سے لوگ مختلف مقامات پر جا کر بس گئے ہیں، جو آپس میں بھوجپوری زبان بولتے ہیں۔ ان کی تعداد اس آنکڑے میں شامل نہیں ہے۔ اس طرح بہار، اتر پردیش اور دیگر مقامات پر جا کر بسے ہوئے بھوجپوری زبان بولنے والوں کی تعداد تقریباً پونے چار کروڑ ہے۔

بھوجپوری کا قدیم تحریری ادب بہت ہی کم دستیاب ہوتا ہے۔ لیکن گزشتہ دو دہائی میں بھوجپوری میں جتنا تحقیقی کام ہوا ہے وہ راجستھانی کو چھوڑ کر ہندی کی کسی بھی دیگر بولیوں میں نہیں ہے۔ بھوجپوری ایک بہادر قوم کی عملی زبان ہے۔

عوامی زبان اور ادب کے نقطۂ نظر سے بھوجپوری بہت خوشحال ہے۔ بھوجپوری عوامی گیت نرم اور دل گداز ہوتے ہیں۔ اس کی روایت بھی قدیم ہے۔ اس کے کئی گیت ایسے ہیں جو برہمنی ادبیات پر مبنی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بھوجپوری شادی کا گیت:

سانجھ کے اگلی انجوریا اے بابا
سکوا او گے لا بھنسر اے
سوروج کیرنیا ہمرا لاگل اے بابا
گور بدن کمھلائے اے
کاہے کے بابا اے تموا تنتی وا
کاہے کے چھترا ورے ہب اے
آجو کے رتیا بابا تو ہرے مڑوہا
پہنے سُنتر بر ساتھ آئے
کٹورن کٹورن دودھوا پیاولو
پتوا سے زیادہ دُلار اے

مختصر یہ کہ جہاں دور قدیم اور دوروسطیٰ سے میتھلی ادب صرف گیتو ں تک محدود تھا اور ان میں موضوع کے تنوع کا فقدان تھا وہاں دور جدید اور خصوصاً آزادی کے بعد کے میتھلی ادب میں مختلف اصناف مروّج ہوئیں اور بیش قیمت تخلیقات منظر عام پر آئیں۔ میتھلی ادب روز افزوں ترقی سے ہمکنار ہو رہا ہے اس کی ترقیاتی رفتار ہنوز جاری و ساری ہے۔

بیٹی کہتی ہے: ''شام کو انجوریا سے مراد چاند کی روشنی ہے اور سحر کے وقت اختر سحر اُگتا ہے۔ سورج کی کرنیں مجھے لگ رہی ہیں جس سے میرا گورا بدن کمھلا رہا ہے''

والد نے پوچھا: ''بیٹی اگر تم کہتی تو میں تنبو یعنی خیمہ لگوا دیتا یا چھتری ہی بنوا دیتا''

بیٹی نے جواب دیا: ''والد صاحب اب کس لیے تنبو تنوائیں گے یا چھتری بنوائیں گے میں تو صرف آج کی رات آپ کے منڈپ پر ہوں۔ صبح کو سویرے ہی اپنے خوبصورت ور کے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

والد نے کہا: ''بیٹی کس لیے میں نے کٹورے میں دودھ بھر کر پلایا اور کس لیے بیٹے سے زیادہ پیار کیا؟ بیٹی تم نے دودھ کا بدلہ نہیں دیا اور تم سندر (خوبصورت) ور کے ساتھ جا رہی ہو۔

مختصر یہ کہ بھوجپوری عوامی ادب کے انتخاب اور تحقیقی کاموں کی طرف دانش وروں کی توجہ مبذول ہوتی ہے اور متعدد دانش وراس علمی کام میں سنجیدگی اور لگن کے ساتھ مصروف ہیں۔

انگیکا: اس کو کچھ لوگ بھاگلپوری بھی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر گریرسن نے بھاگلپور کی بولی کا نام 'چھکا چھکی' لکھا ہے۔ اکثر پورے بھاگلپور کمشنری کی بولی میں بہت یکسانیت ہے کچھ علاقوں کی بولیوں میں صرف آواز سے متعلق کچھ تضادات پائے جاتے ہیں لیکن وہ بہت ہی باریک فرق ہے۔ پوری کمشنری کے لوگ چاہے وہ کسی گوشے کے ہوں۔ آپس میں آسانی سے اپنی اپنی بولی بول سکتے ہیں لیکن میتھلی زبان بولنے والوں کے ساتھ یہ اسی شکل میں ممکن نہیں ہے۔

انگیکا بولی بھاگلپور، مونگیر، پورنیہ، سنتھال پرگنہ اور سہرسا وغیرہ ضلعوں میں بولی جاتی ہے۔ اس زبان/ بولی کے بولنے والوں کی آبادی بارہ لاکھ کے قریب ہے۔ پورنیہ کے پوربی علاقے میں انگیکا دوسری علاقائی زبانوں میں ضم بھی ہوئی ہے۔ ہندوستانی ادبیات میں جب علاقائی ادب کو ناگزیر تصور کیا جاتا ہے تو پھنیشور ناتھ رینو کے ناول 'میلا آنچل' یا ان کی کہانیوں 'مارے گئے گلفام'، 'تیسری قسم'، 'ٹھیس' وغیرہ کا ذکر ناگزیر ہوا کرتا ہے۔ ان کا علاقہ بھی پورنیہ ارریہ سے ہی متعلق ہے۔

بہر کیف انگیکا کی بنیاد اور اصل بہت ہی قدیم ہے جو آٹھویں صدی سے گیارہویں صدی تک کی وکرم شیلا کی علمی زبانوں میں ملتی ہے۔ قدیم بودھ ادب للت وستر کے دسویں باب میں 'رنگ' رسم الخط کا بیان ہوا ہے۔ اس لیے ممکن ہے اس کی اپنی ایک آزاد زبان بھی رہی ہوگی۔ جس کی بگڑی ہوئی یا بدلی ہوئی شکل یہاں کی رائج بولیاں ہیں انگیکا میں مطبوعہ ادب کی کمی رہی ہے اس لیے اس کا عوامی ادب ہی وسیع اور خوشحالی ہے۔ یہاں کے عوامی ادب پر یہاں کے حسین قدرتی مناظر کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ عوامی ادب کے تمام حصوں کی درجہ بندی پہلے ہی کی جا چکی ہے اور اسی درجہ بندی کے تحت انگیکا کا عوامی ادب بھی آتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک عوامی گیت ملاحظہ ہو:

''چندا جے اُگتی جھلاملی رہے دئیا
روگی کئے چھیت نہیں ہو دیئے
کتھی سانجھ جھنپتے چندوارے دنیا
کتھی یا ہی ہم جھنتے وے آٹھوں انگ
بدری جھنپتے تی چندوارے دیا
پٹوکان ہی جھنپتے وے آٹھوں انگ

اس گیت کا مطلب یہ جھلمل چاندنی بکھرتا ہوا چاند اگ گیا اور وہ اگ کر کہیں چھپ نہ جائے کس چیز سے چاند کا مکھڑا ڈھک جائے گا۔ اور کس چیز سے ہمارے

آٹھوں حصے ؟ بادل سے چاند تک جائے گا۔اور کپڑوں سے ہمارے جسم کے آٹھوں حصے ۔

مختصر یہ کہ انگیکا زبان کا سرمایہ کافی قدیم، وقیع اور وسیع ہے جس کی عصری اہمیت وافادیت سے ہم انکار نہیں کرسکتے۔

وجیکا: وجّی حکمران جماعت کی زبان تھی۔ڈاکٹر گریرسن نے اس علاقے کی بولی کو مغربی میتھلی یا میتھلی بھوجپوری کہا ہے۔عظیم پنڈت راہل سانکرتیان جیسے دانش وروں نے واجیوں کی بولی کو سمجھ کر اس بولی کا نام وجیکا رکھا ہے۔یہ بولی میتھلی زبان سے بالکل ہی مختلف ہے۔

ورجی جماعت کی سرحد کا تعین کرتے ہوئے شری ہیم چندر رائے چودھری نے پچھم میں گنڈک ندی سے لے کر پورب میں کوشی اور مہانندا ندی تک اور اتر میں نیپال کی پہاڑی سے لے کر دکھن میں گنگا ندی تک قرار دیا ہے۔

لیکن یہ علاقہ بہت ہی وسیع معلوم ہوتا ہے۔ پنڈت راہل سانکرتیان نے وجّی ملک کے تحت چمپارن، مظفر پور اور دربھنگہ ضلع کا زیادہ تر حصہ اور سارن ضلع مرزا پور، پرسا، سونپور کے تھانے اور کچھ علاقوں کو بھی مانا ہے۔ زبان کے نقطہ نظر سے وجیکا کے تحت پورا مظفر پور، چمپارن کا پوربی حصہ جس میں گھوڑا ساہن، ڈھاکہ، تپاہی، مدھوبن تھانہ، پپرا اور کیسریہ تھانہ کے نصف سے زیادہ علاقے آتے ہیں۔اس کی پچھمی سرحد کا کام بہت دور تک بوڑھی گنڈک ندی کرتی ہے۔اس زبان کے علاقوں میں دربھنگہ اور سمستی پور ضلع کے بعض حصے بھی شامل ہیں۔اس پورے علاقے کی بولی میں کچھ آواز سے متعلق فرق کو چھوڑ کر کلی یکسانیت پائی جاتی ہے۔وجیکا کا علاقہ تقریباً چوالیس سو (4400) مربع میل میں پھیلا ہوا ہے اور اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً چھیاسٹھ لاکھ ہے۔

دیگر بہاری زبانوں کی طرح وجیکا کا عوامی ادب بھی کافی خوشحال ہے جو میتھلی اور بھوجپوری سے کسی طرح کم معیاری نہیں ہے۔ بیٹی کی شادی کے موقع کا ایک گیت مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔ جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ ساس نے کورے ندیاں میں امرت کا جامن دے کر دہی جمایا۔اسی دہی سے منڈپ پر ہون کیا گیا۔ جس کے دھوئیں سے دلہا مات کھا گیا۔اور روٹھ کر برات سے چل پڑا۔اس کی ساس نے اسے مناتے ہوئے پھر کوہبر میں لوٹنے کی درخواست کی اور یہ تسلی بھی دی کہ میں آنچل سے بینیا ڈلا دوں گی جس سے تمھیں دھواں نہیں لگنے پائے گا:

کورے ندیواں ساسو دھیا ہے جملو
امرت نولو جورن ہے
بوہی جے دریا سے ہموا کرولو
دھنواں اکاش لگی جائے ہے
بوہی دھنوئے مائل دلہا کون دلہا
روسی چلل بریات ہے۔

ظاہر ہے کہ اردو ادب پر بھی فضا آفرینی یا حقیقت نگاری کے پیش نظر ان زبانوں کی ادبیات نے کافی متاثر کیا ہے۔اسی لیے بہار میں اردو ادب کا ایسا سرمایہ بھی وقیع ہے جن پر مقامی بولیوں کے اثرات واضح ہیں۔اختر اورینوی کے ایک افسانے جس میں ایک مسلم کو نکلے والے کی زبان یوں پیش کی گئی ہے:

بھائی عیدو! سچ ہے۔دنیا پھانی ہے
پاک پروردگار کُر آن حدیث
میں فرمائین ہیں
روجہ نماز کرو
ہر حال میں سکر بھیجو اور چوری مت کرو
حک حلال کھاؤ۔راہ گیر عورت پر نجر نہ کرو
اور ای بھی فرمائین ہیں کہ اپنے کھاوند کا پھرمانبرداری کرو۔''

اسی طرح شکیلہ اختر کے ایک افسانہ ''ڈائن'' سے چند جملے ملاحظہ ہوں:

''بی بی مچھلی کے دام
اگارہ آنا پیسہ اور پہلے کے سوا گورو پیہ؟
ہائے رام ہائے بس تین آنے!
اور سوا گورو پیہ کدھر گیل۔''

یہ جملے مچھوائن بڑھیا کی زبان سے ادا ہوئے ہیں ان میں مگہیت پورے طور پر نمایاں ہے۔شکیلہ نے اس افسانے میں 'ٹھو' کہیں استعمال نہیں کیا ہے۔مگر 'گو' کئی بار آیا ہے۔یہ 'گو' اور 'ٹھو' تقریباً ہم معنی ہیں۔

سہیل عظیم آبادی نے بھی اپنے متعدد افسانوں جیسے 'الاؤ' اور 'چوکیدار' وغیرہ میں مقامی بولی کے الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔

اسی طرح بہار میں پوری تخلیقی شدت کے ساتھ شعر وادب کے سرمائے کا تحفظ علاقائی بولیوں اور زبانوں نے بھی کیا ہے۔فکشن میں بھی فضا آفرینی یا کرداروں کی وضاحت کے لیے گیتوں، محاوروں، مکالموں، ضرب الامثال وغیرہ کا بھی نہایت فطری انداز میں استعمال ملتا ہے۔محمد محسن (انوکھی مسکراہٹ، لذت آزار)، شین مظفر پوری (انمول)، انور عظیم (بنیائن)، گربچن سنگھ (رات، منزل، مسکراہٹ)، احمد یوسف (پرندہ ایک نگارخانے کا، عبدالرحیم ٹی اسٹال)، شفیع جاوید (اپی ٹاف)، جابر حسین (آلوم لا جاوا، ٹال کی مرنی)، علی حیدر ملک (تیسری آنکھ)، وہاب اشرفی (مٹی کا مادھو)، حسین الحق (لخت لخت)، شوکت حیات (رانی باغ، بیچ کا آدمی)، شبیر احمد (گرہ ناخن گرہ)، شفق (ٹوٹے لمحوں کا دکھ)، عبدالصمد (سمجھوتی، پیوندکاری)، انیس رفیع (ذوالنون)، ذکیہ مشہدی (بڑا نہیں مری، مٹھی بھر گھاس)، شموئل احمد (بہرام کا گھر، سنگھاردان) قاسم خورشید (باگھ دادا، کنّی کا راجکمار)، تسنیم کوثر (ملیچھ، دونین)، افروز اشرفی (کارزار، کھوئی ہوئی خوشبو)، کے ساتھ لگ بھگ تمام فکشن نگاروں نے یہاں کی تہذیب وثقافت کے مقامی رنگ وآہنگ کو پیش کرنے کی کوششیں کی ہیں۔

شاعری کے حوالے سے مزید یہ کہنا ناگزیر ہے کہ جدید تحقیق کے مطابق کلیم عاجز ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں بھاکھا کے الفاظ کثرت سے آئے ہیں۔خود کلیم عاجز کو اس بات کی شکایت ہے کہ میرے ناقدین نے مجھے مقلد میر تک پہنچا دیا لیکن لسانی سطح پر میرے کلام میں ان الفاظ کو تلاش نہیں کیا جو خالص مگہی اور بھاکھا کے الفاظ ہیں مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو
رکھنا ہے کہیں پاؤں تو رکھو ہو کہیں پاؤں
چلنا ذرا آیا ہے تو اترائے چلو ہو
اپنی تو کہے جائے ہے سنتا نہیں عاجز
دیوانہ ہے دیوانے سے کیا بات کرو ہو

کلیم عاجز کے ان اشعار میں الفاظ کی ترکیب پر غور فرمائیے۔مثلاً چھینٹ، کروہو، رکھوہو، کہے جائے ہے، یہ ایسے الفاظ جو اردو پر بھاکھا کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔

کلیم عاجز نے ایک خصوصی ملاقات میں مقامی بولیوں کے استعمال پر تفصیلی گفتگو کی تھی جو لوگ بہار کے اس علاقے سے واقف ہیں جہاں کاکو، بی بی پور، دسنہ تلہاڑہ وغیرہ ہے۔ وہاں کی بولی فطری طور پر تہذیبی سرشت کا حصہ ہے اور وہ تخلیقی ادب میں نہ صرف یہ کہ مستعمل ہے بلکہ ہمارے معیاری ادبی سرمائے کا حصہ بھی ہے۔ چونکہ یہاں کی مقامی بولیاں اب ہمارے ادبی شہ پارے کا حصہ بن چکی ہیں اس لیے بہار کے تخلیق کاروں کو گلوبل سطح پر نا قابل فراموش تصور کیا جاتا ہے۔

■

Quasim Khursheed, Head (Languages), SCERT Bihar, Mahendru, Patna-800006

گجرال کمیٹی کی رپورٹ اور سردار جعفری

لئیق صلاح

حیدرآباد میں اقبال صدی تقاریب کے سلسلے میں سردار جعفری کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جعفری صاحب نے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی تھی۔ اس سیمینار میں ایک صاحب نے بڑے تلخ لہجے میں صدرِ اجلاس سے سوال کیا کہ کسی زمانے میں آپ اقبال کے مخالف تھے، اور آج اُسی اجلاس کی صدارت کا فریضہ ادا کررہے ہیں؟ موصوف کے اس استفہام کے ساتھ ہی محفل کا رنگ بدل گیا۔ لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ منتظمین جلسہ الگ پریشان کہ مہمان کے ساتھ اس طرح کا سلوک، ان کے اجلاس کی بدنامی کا باعث نہ ہوجائے۔ شک وشبے کا ازالہ کرنا ضروری ہے لیکن حدِ ادب میں رہ کر، کسی کی کھینچائی کیے بغیر ہو تو یقیناً وہ قابلِ گرفت نہیں۔ ناظمِ اجلاس نے فوری مائک ہاتھ میں لیا تا کہ معذرت چاہیں۔

لیکن جعفری صاحب نے انھیں منع کیا اور خود انھوں نے مائک سنبھالا اور نہایت تحمل کے ساتھ جواب دیا کہ بے شک آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ ایک زمانے میں یعنی ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں، میں نے جذباتی انداز میں اقبال سے اختلاف کیا۔ غالباً 1945 کے بعد کی میری تحریریں آپ کی نظر سے نہیں گزریں، جن میں، میں نے اپنے خیال کی تردید کی ہے۔

'ترقی پسند ادب' کے تعلق سے اُن کی جو تصنیف ہے وہ اس تحریک کے سمجھنے میں بہت ہی معاون ثابت ہوئی ہے۔ ان کی تقریر بھی بڑی دلچسپ ہوا کرتی تھی۔ اس دور کی اپنی سرگرمیوں کے بیان میں، ایک فلسفی کی طرح خشک نہیں، بلکہ مرنجانِ مرنج محسوس ہوتے ہیں۔

سردار جعفری کا ایک اہم کارنامہ گجرال کمیٹی کی سفارشات کا جائزہ اور حکومت سے ان پر عمل آوری کا مطالبہ تھا اس تعلق سے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی، جس میں یونین ایجوکیشنل سکریٹری، ڈپٹی سکریٹری محکمہ تعلیم کے علاوہ مرکزی حکومت کے عہدہ دار شامل تھے جنھوں نے میٹنگوں میں شرکت کی اور مختلف محکموں اور اداروں کے نقاط نظر کو پیش کیا۔ مرکزی حکومت کے علاوہ ریاستی حکومتوں سے بھی اعانت کی درخواست کی گئی تھی تا کہ کمیٹی کے سرکاری اور غیرسرکاری عہدہ داروں، نمائندوں، تنظیموں سے ملاقات اور ربط کا اہتمام ہوسکے جس کی بنا پر مسائل کا تجزیہ ہو، اور ان کے حل کی صحیح سمت کا تعین کرسکیں۔

سردار جعفری اس جانچ کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ انھوں نے یہ رپورٹ 18 ستمبر 1990 کو وزیرِ مملکت برائے تعلیم وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند کی خدمت میں پیش کی تھی۔ انھوں نے نہ صرف گجرال کمیٹی کی سفارشات سے متعلق مختلف مسائل کا جامع انداز میں جائزہ لیا تھا، بلکہ اپنی رپورٹ میں مستقبل کے لائحہ عمل کو پیش کرتے ہوئے قابلِ عمل تجویز بھی پیش کی تھی۔

سردار جعفری نے گجرال کمیٹی کی سفارشات کی توصیف وتائید کرتے ہوئے حکومت ہند کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ سفارشات پر عمل آوری نہ ہونے کی وجوہات کیا ہیں؟ انھوں نے اس بات کا انکشاف کیا کہ سفارشات پر عمل آوری کے لیے قانونی یا سرکاری منظوری کا ہونا ضروری ہے۔ سوءِ اتفاق کمیٹی اس اعانت سے محروم رہی جس کی بنا پر کمیٹی کو اپنی سفارشات کو روبہ عمل لانے کے لیے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے انفرادی رویوں اور فیصلوں پر انحصار کرنا پڑا۔ اس جائزہ کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی کہ سفارشات کے استحکام کے لیے، مرکزی کابینہ ہر سفارش پر اپنے فیصلے صادر کرے، جو جامع قراردادوں کی شکل میں ہوں اور مزید توثیق کے لیے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش کرکے اس طرح گجرال کمیٹی کی تمام سفارشات کو یقینی طور پر فوری قابلِ عمل قرار دیا جائے۔

گجرال کمیٹی کی تشکیل، حکومت ہند کی ایک قرارداد مورخہ 5 مئی 1972 کو بذریعہ فروغ اردو عمل میں آئی تھی جس کا لب لباب یہ تھا کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے اقدامات کیے جائیں اور اردو بولنے والوں کے لیے تعلیمی، تہذیبی اور انتظامی امور میں خاطر خواہ مناسب سہولتیں فراہم کرنے کے لیے حکومت کے آگے تجاویز پیش کی جائیں۔ 8 مئی 1975 کو گجرال کمیٹی کی یہ رپورٹ وزارت تعلیم کی خدمت میں پیش کی گئی، جو 269 صفحات اور 187 سفارشات پر مشتمل اور بے شمار مسائل پر مبنی تھی۔

اس کمیٹی کی سفارشات میں درجہ ذیل امور شامل تھے:

اس لسانی فارمولے میں ترمیم، سرکاری مقاصد کے لیے اردو کا استعمال، اردو لسانی اقلیتوں کو مناسب تحفظات فراہم کرنا، اردو کا بحیثیت ذریعہ تعلیم استعمال، اردو اساتذہ کی تربیت، اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام، یونیورسٹیوں میں اردو مراسلاتی کورس جاری کرنا، اردو صحافت وادب کا فروغ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اردو کی نشریات میں اضافہ اور ترقی اردو بیورو کا استحکام۔

15 فروری 1990 کو حکومت ہند نے ماہرین کی ایک کمیٹی بنائی اور علی سردار جعفری کو اس کا چیئرمین بنایا۔ انھوں نے سفارشات پر مرکزی حکومت کی عمل آوری کا جائزہ تفصیلی طور پر لیا۔ موصوف نے اپنی کمیٹی کے اراکین کے ہمراہ این پی ای آر سی کے چیئرمین سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے، ان امور کا اظہار کیا:

''اردو ایک قومی زبان ہے، جو ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ یہیں پروان چڑھی اور آج بھی بلا لحاظ مذہب و ملت اور بلا تفریق رنگ ونسل ملک میں سب ہی طبقوں کے لوگ بولتے ہیں۔ یہ پوری قوم کا سرمایہ ہے اور اس کا ایک بین ریاستی کردار بھی ہے۔ انھوں نے اسی قرارداد کا بطور خاص حوالہ دیا جس کے ذریعے این پی ای آر سی کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ جو اس بات پر زور دیتی ہے کہ ذات پات، مذہبی تعصب اور بھید بھاؤ کی منافرت کے خلاف، مستقل جدوجہد کی جائے۔ انھوں نے اس بات کی وکالت کی کہ اردو کے مسئلے کو سنسکرت سے نہیں جوڑنا چاہیے جو کہ سب ہی زبانوں اور سندھی کی بھی ماں ہے۔ یہ ایک ہمشیر زبان ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگرچہ سہ لسانی فارمولا قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے وضع کیا گیا تھا مگر اس کا نفاذ ناقص تھا جو اردو سیکھنے کے خواہش مندوں کے لیے سدِراہ بنا۔ اب جب کہ سارے تعلیمی نظام پر نظرثانی کی جارہی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ یہ میٹنگ نہ تو پہلی ہوگی اور نہ آخری بلکہ قومی سطح پر تشکیل دی گئیں دو

کمیٹیوں میں تبادلہ خیالات کا سلسلہ جاری رہے گا۔

سردار جعفری نے زبانوں کے مابین خاص کر دو ہمشیر زبانوں اردو اور ہندی کے درمیان رفاقت اور وسیع النظری کا نیا جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا تاکہ وہ ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ مالا مال کرسکیں کیونکہ دونوں ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہوئی ہیں اور ان دونوں کی جڑیں بھی مشترک ہیں۔

گجرال کمیٹی کی جملہ سفارشات 19 تھیں، جن کا تعلق تعلیم و تدریس کے علاوہ انتظامیہ سے بھی تھا۔ اس امر کا جائزہ لیا گیا کہ سفارشات پر عمل آوری کس حد تک ہوئی ہے؟ مثلاً اسمبلیوں اور انتخابات میں اردو کے استعمال کے تعلق سے جانچ کی گئی تو پتہ چلا کہ بعض ریاستیں سفارشات پر عمل پیرا ہیں، لیکن دوسری جگہ یہ عملی صورت میں موجود نہیں ہیں۔ یعنی تمام ریاستوں میں یکسانیت نہیں پائی جاتی ہے۔ جیسے آندھرا پردیش میں بل اردو میں پیش کیے جاتے ہیں اور تقاریر کو اردو میں ریکارڈ کیا جاتا ہے، مگر دوسری ریاستوں میں نہیں۔ اسی طرح ووٹروں کی فہرستیں سوائے مہاراشٹر اور دلی کے کہیں بھی اردو میں شائع نہیں ہوتیں۔ محکمہ ڈاک و تار کے مختلف فارمس کی چھپائی بھی اردو میں نہیں ہوتی (جہاں اردو بولنے والے اکثریت میں ہیں) (اس سفارش پر بھی عمل نہیں ہوا۔ محکمہ ڈاک و تار کے سائن بورڈ سوائے آندھرا کے کہیں بھی اردو میں نہیں۔ تعلیم اور نشر و اشاعت کے سلسلے میں جو کوتاہیاں ہوئیں انھیں بھی منظر عام پر لایا گیا اور اس امر کا اظہار کیا گیا کہ رہنمایانہ خطوط میں یکسانیت کا ہونا ضروری ہے۔ نئی قومی تعلیمی پالیسی میں اردو کے لیے خصوصی گنجائش فراہم کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس پر نظر ثانی کی درخواست کی گئی۔ سہ لسانی فارمولے میں ترمیم کرکے اردو کو شامل کرنے اور ملک کے تعلیمی نظام میں اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی سفارش کی گئی۔ علاوہ ازیں تحقیقی اداروں کا قیام ایک شمال اور دوسرا جنوب میں ہو، پوسٹ گریجویشن سطح پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا، قوانین اور ضابطوں کے اردو ترجموں کی سفارش کی گئی۔

جہاں اردو جاننے والے زیادہ ہیں، وہاں پروڈیوسرس اور اسسٹنٹ پروڈیوسرس اردو میں ترقیاتی فیچرس اور قومی پروگرام کے سلسلے میں جزوی طور پر عمل درآمد ہوا۔ لیکن قومی پروگراموں میں اردو ڈرامے اور فیچرس کو زیادہ سے زیادہ شامل کرنے کے تعلق سے سفارش پر بھی، عمل میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ ریاستی اکادمیوں کا بھی فرداً فرداً جائزہ لیا گیا اور ان کی کارکردگی اور مالی مسائل کی نشان دہی کی گئی۔

سرکاری سطح پر اردو کے چلن کے تعلق سے بھی معلومات حاصل کی گئیں۔ مثلاً درخواستوں، عرض داشتوں، بلوں، عدالتوں میں دستاویزات کا رجسٹریشن، سرکاری قواعد و ضوابط اور اعلان ناموں، سرکاری احکام اور گشتی مراسلے، گزٹ، سڑکوں پر سنگ میل اور دفاتر پر محکموں کے ناموں کی تختیاں، اردو اسٹاف (افسر، مترجم اور ٹائپسٹ) رائے دہندگان کا فہرست وغیرہ کے سلسلے میں اردو کا چلن کس حد تک ہے؟ اور نہ ہونے کی صورت میں سفارش کا حوالہ دیتے ہوئے، عمل پیرا ہونے کی درخواست کی گئی۔

مذکورہ بالا بیانات سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ سردار جعفری ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ وہ تحقیقی، تنقیدی، تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کی خدمت ایک اور محاذ سے بھی کرنا ضروری سمجھتے تھے جس کی موجودہ دور میں اشد ضرورت ہے۔ زبان و ادب صرف تحقیق، تنقید اور تخلیق یا ادبی اجلاسوں، کانفرنسوں، مذاکروں اور مشاعروں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتے۔ ایک اور سمت بھی بطورِ خاص توجہ کرنی چاہیے، اور وہ محاذ ہے تحریک کا بقول فیض:

مسجد سے میکدہ سے تیری بزم جام سے
آواز دے رہا ہوں میں کس کس مقام سے

کا ہونا ضروری ہے۔

سردار جعفری جس طرح ترقی پسند تحریک کو بام عروج پر پہنچانے میں سرگرم عمل رہے۔ اُسی طرح اپنے آخری دور میں مجاہد برائے اردو تحریک کا رول بھی بڑی خوب صورتی سے نبھایا۔ جہاں اُن کی یاد میں جلسوں کا انعقاد کیا جاتا ہے بالخصوص اشاعتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اُن سب کے ساتھ اُن کے اس پیغام محبت کو دور، دور تک پہنچانا اور اس کی برقراری و استحکام کی ممکنہ سعی کرنا چاہیے۔ میری دانست میں اس کے بغیر ان کا خراج عقیدت تشنہ رہے گا۔

نومبر 1999 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے جو سہ روزہ سمینار دہلی میں منعقد ہوا تھا جس کا جناب اندر کمار گجرال سابق وزیر اعظم نے افتتاح کیا تھا اور دیگر اکابرین میں جناب دانیال لطیفی، جناب طاہر محمود اور جناب بلال نازکی کے علاوہ جناب سردار جعفری نے بھی شرکت کی تھی۔ پہلے دن کا Keynote Address اُن ہی کا تھا۔ بعد کے ایک اور اجلاس کی صدارت بھی انھوں نے کی تھی۔

جعفری صاحب نے ان اجلاسوں میں جن خیالات کا اظہار کیا، وہ بطور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو تحفظ، ترقی اور تعلیم کے نقطۂ نظر سے حقوق حاصل کرنے ہیں۔ ملک کی ترقی میں حصہ لینے کے لیے تحصیل علم ضروری ہے۔ آزادی کے 50 سال بعد 20 زبانیں ایک ساتھ ترقی کر رہی ہیں۔ کتابوں کے ترجمے ایک سے دوسری زبانوں میں ہو رہے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی اور نیشنل بک ٹرسٹ جیسے اداروں کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اردو بیرونِ ملک پہنچ گئی ہے۔ امریکہ انگلینڈ، خلیجی ممالک اور ہندوستان میں اسے ایک مشترکہ زبان بنانا چاہیے تاکہ اردو ادب وسیع تر حلقے میں پہنچے۔

دیوناگری میں اردو ادب کی جو کتابیں شائع ہوئیں ان کے لیے کچھ تجویزیں بھی پیش کیں۔ مثلاً شعرا کے تخلص کے ساتھ علامت (ـــ) کا استعمال ضروری ہے۔ جیسے میر، غالب اور اقبال۔ دوسرا یہ کہ خوب صورت چیز، بندی نکال دی گئی ہے جس کی وجہ سے تلفظ کی ادائیگی ٹھیک سے نہیں ہو پاتی ہے۔ مثال کے طور پر 'جعفری' کو 'زعفری'، 'غالب' کو 'گالب'، 'غزل' کو 'گزل' کہا جاتا ہے اور 'دیوانِ غالب' کو 'دیوانہ غالب' لکھا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبانیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ترقی کرتی ہیں۔ فارسی اور سنسکرت الفاظ کے استعمال میں تناسب و توازن کا خیال رکھا جائے۔ مثلاً اقبال نے 'دل' کی بجائے 'من' استعمال کیا ہے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

اردو میں تت بھو اور تت سم کا استعمال کئی طریقوں سے کیا گیا ہے۔ رات، راتوں رات، رات کی رات وغیرہ۔

اقبال کی طرح بعض ہندی ادیبوں اور شاعروں نے 'نظر' کے لیے سنسکرت لفظ 'درشٹی' استعمال کرنے کے بجائے ترجیح 'نظر' کو دی ہے۔ گروگرنتھ میں بہت سارے الفاظ فارسی اور عربی کے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ زبان کو تفریح طبع کا ذریعہ نہ سمجھیں، اس کا رشتہ عصری ٹکنالوجی سے جوڑیں۔ دوسری زبانوں کے ادبا، و شعرا سے تعلقات بنائے رکھنے کی تلقین کی اور بتلایا کہ بعض غیر اردو داں، اردو میں تقریر کرتے ہیں۔ اردو زبان کے بارے میں مزید معلومات بہم پہنچاتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ ایک ہندوستانی زبان ہے۔ سیکڑوں بولیوں میں سے ایک نے ترقی کی اور وہ کھڑی بولی کہلائی، زبان مختلف علوم کو سمیٹتی ہے۔

اردو اور ہندی Dialect کا جھگڑا انگریزوں کا کھڑا کیا ہوا ہے اور تحریک آزادی میں اردو ادب کا جو Contribution ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

■

Dr Laiq Salah, *Ex. Member of National Council for Promotion of Urdu Language, Delhi)*
354, Mahmod Bagh, Asif Nagar,
Hyderabad - 500028 (AP)

خالد ندیم

اختر حسین رائے پوری کا اسلوب

بیسویں صدی کے ربع دوم میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری (12 جون 1912-، 2 جون 1992) ایک افسانہ نگار، نقاد، مترجم کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے، البتہ قیامِ پاکستان کے بعد ان کی ادبی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں، تاوقتیکہ مذکورہ صدی کے ربع چہارم کے آغاز میں انھوں نے گردِراہ کے نام سے خودنوشت لکھ کر ایک بار پھر ادبی اُفق پر چھا گئے۔

زیرِ نظر سطور میں ان کے افسانوں، تنقید، ترجمے یا آپ بیتی میں ان کے اسلوب کا جائزہ لیا جائے گا۔ ان کا اسلوب اپنے معاصرین کے مقابلے میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے، کیونکہ انھوں نے ترقی پسندی اور رومانیت کے متصادم دَور میں دونوں کی خصوصیات کو باہم ملا کر ایک منفرد اسلوب دریافت کیا۔ یہی امتزاجی کیفیت ان کے اسلوب کا خاصہ شمار کی جاسکتی ہے۔

اختر حسین کا اسلوب اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ ان کے مدِ نظر محض ادبی حسن اور فنی چابکدستی ہی نہیں، بلکہ اجتماعی زندگی میں تبدیلی کا خواب بھی تھا۔ انھوں نے اپنے اسلوب کی تعمیر اس طرح کی کہ وہ مقاصد کے حصول میں ادب کے راستے سے نہ ہٹ جائے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک مشکل کام تھا۔ اختر کی کامیابی کا راز اس میں ہے کہ انھوں نے مقصدیت اور ترقی پسندی کو کسی فیشن کے زیرِ اثر نہیں، بلکہ اپنے ذوق اور میلانِ طبع کے پیشِ نظر قبول کیا تھا۔

اختر نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز خطابت، رومانیت اور انشائے لطیف سے کیا[1]، جس سے اختر کے افسانوں کا طرزِ نگارش مضمون اور مقالہ نگاری سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور ان کے افسانے اصولِ افسانہ نگاری سے ذرا بھٹکے ہوئے نظر آتے ہیں[2]، لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے، ان کا اسلوب زیادہ ہموار اور امتزاجی وصف کا حامل ہوتا گیا۔ اس میں ہیجان اور جھنجلاہٹ کی جگہ ٹھہراؤ اور استدلال کی جگہ بنتی گئی۔ ایک عنصر، جو ابتدا سے آخر تک ان کے اسلوب کا جزو رہا، وہ انشائے لطیف کا جادو ہے۔ ان کی زبان میں ایسا جادو ہے، جو ایک ہی جھلک میں پڑھنے والے کو ہمیشہ کے لیے مسخر کر لیتا ہے۔ انھوں نے جس کامیابی سے اردو اور ہندی کے میل سے اپنے لیے ایک اچھوتا اور دلفریب اسلوبِ بیان ڈھونڈ نکالا، وہ ہمارے ادب کے لیے باعثِ فخر ہے۔[3]

اپنے پہلے مجموعے کی تمہید میں اختر لکھتے ہیں کہ ان اَوراق میں تخیل اور مشاہدے کے جو نقوش پیش کیے گئے ہیں، ان میں اَور کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن ایک چیز ضرور ہے، وہ ہے: خلوص اور شدتِ احساس۔[4] اختر کا یہ بھی کہنا ہے کہ پہلے باب میں سب کچھ سرگوشیوں اور اشاروں میں کہا گیا ہے۔ الفاظ کی زبان سطحی ہوتی ہے، وہ دُوررَس نہیں۔ اُفق پر جو دھندلے دھندلے درخت نظر آتے ہیں، ان کی تصویر بہت مبہم خطوں میں بنائی جاتی ہے۔[5] ان کے ہاں یہ احساس پوری طرح بیدار دِکھائی دیتا ہے کہ قاری بہت سی باتیں براہِ راست اظہار کے بغیر بھی سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

'محبت' میں خیال کی رَو کی تکنیک میں ادبِ لطیف طرز کی سات تحریروں کو کسی نوع بھی افسانے کا نام نہیں دیا جاسکتا،[6] تاہم اختر کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں، جو صاف صاف کہی جاتی ہیں، کچھ اشاروں میں اور کچھ خاموشی میں۔[7]

اس خیال کو پیشِ نظر رکھیں تو 'خیال کی رَو' کی تکنیک اپنانا ان افسانوں کی ہیت کے لیے از حد ضروری قرار پاتا ہے۔ خیال کی رَو میں شعریت کا شائبہ ہوتا ہے اور سرگوشی میں نثرِ لطیف کا ذائقہ۔ اپنے افسانوں میں شعرِ منثور کا جواز پیش کرتے ہوئے اختر کا کہنا ہے کہ شعرِ منثور شاعری

کی سب سے مشکل صنف ہے۔ نظم ایک نہر ہے، جس کی آزو بازو بحر اور موسیقی کی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں، مگر نثر کی شاعری آزاد پہاڑی ندی ہے۔ صرف تخیل کی رنگینی میں موسیقی کا جادو بھرنا بہت دُشوار ہے۔ اگر لوگ اس صنف کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے تو اس سے ان کی کم مائیگی کا ثبوت ملتا ہے، نہ کہ یہ صنف بذاتِ خود ناقص ہو جاتی ہے۔[8]

نثر لطیف اور شعر منثور کے حوالے سے اختر کے دو افسانے بالخصوص 'سمندر' اور 'میرے خوابوں کا مندر' اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ اپنے دَور میں یہ لب و لہجہ کس قدر قبل از وقت محسوس ہوتا ہوگا۔ پہلے 'سمندر' سے اقتباسات:

یہ کشتی میرے دل کی طرح مضطرب ہے، یہ ستارے میرے جذبات کی مانند لرزاں ہیں، یہ چاند میرے مستقبل کی طرح دھندلا ہے......سمندر کی وسعت کو ساحل قید میں رکھنا چاہتا ہے، کہر چاند کی ضیا کا رہزن بن گیا ہے اور مَیں آپ اپنی بیچارگی کا اسیر بن رہا ہوں۔[9]

سمندر! تیرا وجود خدا کے آگے انسان کو سربسجود کرنے کے لیے کافی ہے......دلِ بے قرار! تیرا مستقل اضطراب قدرت کے خلاف دعوتِ جہاد ہے۔[10]

اور اب 'میرے خوابوں کا مندر' سے اقتباس:

خوابوں کی دنیا میں بدگمانی گناہ ہے، وسوسہ کفر ہے۔ میرے محبوب! ساحل پر کھڑا ہو کر نہ سوچ کہ قدرت ہماری بساط کو الٹ دے گی، نہ سوچ کہ گناہوں کی دنیا سے تجھے کچھ لگاؤ ہے، پابندی کو ذمہ داری نہ سمجھ۔ میرے دیس میں آ، جہاں آزادی پابندی سے آشنا ہونے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ وہاں، جہاں انسان اپنی بلندی سے گھبرا کر پھر پستی کی طرف مائل ہونا چاہتا ہے......کتنا دلفریب ہے میرے خوابوں کا مندر، لیکن کتنا دل فگار ہے وہ تیرے بغیر۔ میری رانی! کیا تو اس مندر میں نہ آئے گی۔[11]

اس اسلوب کے محرک کے طور پر ادیب سہیل ٹیگور کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں، اختر بنگلہ زبان پر اپنی مادری زبان سے کم دسترس نہیں رکھتے تھے، اس واسطے انھیں گرودیو کی تخلیقاتِ نظم و نثر کے بروقت مطالعے کا موقع ملتا تھا، دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ گرودیو کا شعری مزاج سرتاسر subjective تھا، جس سے اختر کے تخلیقی مزاج کی بڑی مطابقت تھی۔[12]

یہ اردو افسانے کا وہ دَور تھا، جب افسانے میں آغاز، درمیانی سفر اور انجام کا التزام رکھا جاتا تھا۔ صراطِ مستقیم پر چلتی ہوئی کہانی اپنا سفر کرداروں کی مدد سے طے کرتی تھی، لیکن اختر نے اسلوب اور ہیئت دونوں لحاظ سے انحراف کیا ہے۔

یوں تو اختر کے افسانے بیانیہ اسلوب کے حامل ہیں، مگر انھوں نے علامت نگاری، انشائے لطیف اور خیال کی رَو کے استعمال سے نیا بنا دیا ہے۔ ان کا یہ افسانوی اسلوب پون صدی بعد بھی تروتازہ ہے اور اس اسلوب سے ملتے جلتے انداز میں نیا افسانہ تخلیق ہو رہا ہے۔

اختر مغربی حقیقت نگاری سے بھی متاثر دِکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں اس کی جابجا جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ وہ زندگی کو اسی تجزیاتی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، جو مغربی ادب کی حقیقت نگاری کا خاصہ متصور ہوتی ہے۔ وہ محض حالات کی تصویر کشی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس تصویر کے پس منظر کو بھی نمایاں

طوائف کا ادارہ، جسے مردوں نے اپنی عیاشی کے لیے ترتیب دیا ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ اپنی ہم جنسوں کے لیے عورتوں کے دلوں میں رحم اور ہمدردی کے جذبات ہوتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عورت ہوتے ہوئے بھی وہ معاشرے کی دھتکاری ہوئی ان لاچار اور مجبور عورتوں سے مردوں کی نسبت زیادہ نفرت کرتی ہیں۔ اختر نے عورتوں کے اس طرزِ فکر پر نہایت بلیغ طنز کیا ہے

کرتے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر محمد صادق کے خیال میں 'میرا گھر'، 'دیوان خانہ'، 'جسم کی پکار'، 'مجھے جانے دو'، 'بیزاری' اور 'مرگھٹ' اختر کے وہ افسانے ہیں، جو اپنے عہد کی صداقتوں کے مظہر قرار دیے جاسکتے ہیں۔[13]

اختر کے افسانوی اسلوب کو دلکشی عطا کرنے میں ان کی حسِ مزاح کا بھی اہم کردار ہے۔ ان کی بعض تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ طنز و مزاح سے انھیں کافی مناسبت ضرور تھی، چنانچہ اگر وہ اس طرف توجہ دیتے تو یقیناً ایک اچھے مزاح نگار تصور کیے جاتے۔ یہ ایک مشکل فن ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیائے ادب میں بہت کم فنکار اسے کامیابی سے نبھا سکے ہیں۔ اختر نے فن کے اس پہلو میں جو چابکدستی دکھائی ہے، وہ تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔[14]

طوائف کا ادارہ، جسے مردوں نے اپنی عیاشی کے لیے ترتیب دیا ہے، چاہیے تو یہ تھا کہ اپنی ہم جنسوں کے لیے عورتوں کے دلوں میں رحم اور ہمدردی کے جذبات ہوتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عورت ہوتے ہوئے بھی وہ معاشرے کی دھتکاری ہوئی ان لاچار اور مجبور عورتوں سے مردوں کی نسبت زیادہ نفرت کرتی ہیں۔ اختر نے عورتوں کے اس طرزِ فکر پر نہایت بلیغ طنز کیا ہے، لکھتے ہیں:

ٹریم پر شریف زادیوں اور موٹروں پر امیرزادیوں کے کھیپ کے کھیپ گزرا کرتے تھے۔ ان سستی طوائفوں پر نظر پڑتے ہی وہ توبہ استغفار کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔ 'یہ بدبخت، نسوانیت کی کلنک، خدا انھیں غارت کرے۔ چند ٹکوں کے لیے، شراب کی ایک بوتل کے لیے یا سگریٹ کی ایک ڈبیا کے لیے یہ اپنا تن ہرایرے غیرے کے سپرد کر دیتی ہیں اور ہم ......؟' پھر وہ اپنے شوہروں کو یاد کرنے لگتی تھیں، جنھوں نے انھیں اونچی حویلیاں، ریشمی ساریاں اور چھ چھ بچے عطا کیے تھے۔[15]

اسلوب میں طنز و مزاح کی چاشنی کے ساتھ ساتھ کسی تحریر میں ابلاغ کی رفتار کو تیز کرنے میں تشبیہات نہایت کارگر ثابت ہوتی ہیں اور اختر اس فن سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں جابجا تشبیہات سے کام لے کر قاری کے لیے تفہیم کے راستے آسان کر دیے ہیں۔ چند افسانوں سے ان کے جہانِ تشبیہات کا جائزہ لیتے ہیں:

مَیں کئی بار دیکھ چکا تھا کہ عشق کی انگلیاں جب پہلے پہل بوسے کے مضراب سے ربابِ حسن کے تاروں کو چھیڑتی ہیں تو کیسے راگ پیدا ہوتے ہیں۔ ایڑی سے چوٹی تک تھرتھری سی پیدا ہوتی ہے، جیسے کسی نے بجلی کا تار رکھ دیا ہو، جیسے تتلی پھول پر بیٹھی ہو اور اس کے رنگین پر پنکھڑیوں پر چپک گئے ہوں، جیسے بھونرا کنول کے پھول پر بیٹھا ہو، پتیاں سکڑ گئی ہوں اور وہ باہر نکلنا چاہتا ہو کہ دوبارہ گرفتار ہو ......ایک بے پیے کی مستی......وہ پہلا پیار......مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ آخری بوسہ کیا ہوتا ہے۔ جیسے محبوب کی لاش سے کوئی لپٹ جائے اور یہ سوچے کہ میری التجا اس کی آنکھ کھول دے گی۔ جیسے خواب سے جاگ کر کوئی پھر آنکھیں بند کر لے، اس توقع پر کہ مَیں پھر اُس جہانِ جمیل کی سیر کر سکوں گا۔ جیسے کوئی بچہ کھلونوں کو توڑ کر رونے لگے کہ اس کے آنسو ان ٹکڑوں کو یکجا کر دیں گے۔[16]

دُور ندی کا دھارا کسی گھائل پرندے کی طرح کراہ رہا تھا۔[17]

ماں کا پیٹ، چھوٹے سے پیمانے پر ریل کا ڈبہ ہی

ہے۔ بھائی، بہن مسافروں کی طرح کچھ وقت کے لیے اس میں جمع ہوتے ہیں اور پھر اپنے اپنے اسٹیشن پر اتر کر ہنگامۂ ہستی میں گم ہو جاتے ہیں۔[18]

درخت کی طرح انسان بھی ایک خاص مٹی کا عادی ہوتا ہے اور اگر اس کی جڑ کھود دی جائے تو وہ مرجھا جاتا ہے۔[19]

جب وہ اس کے سائے تلے آ کر کھڑی ہوئی تو وہ اسی طرح متحیر ہوگئی، جیسے کہر آلود شمال کا انسان گرم ممالک کی دھوپ میں۔[20]

ایک نقاد کی حیثیت عام طور پر ایک اسلوب ساز ادیب کی سی نہیں ہوتی، لیکن اختر بیک وقت افسانہ نگار، مضمون نگار اور نقاد تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ سنسکرت، ہندی، بنگالی، اردو، فارسی، گجراتی، انگریزی اور فرانسیسی پر دسترس رکھتے تھے، لہٰذا ان کے اسلوب میں ان زبانوں اور ان کے تہذیبی عناصر کا در آنا کوئی اَن ہونی بات نہیں۔ ان کا اسلوب گل ہائے رنگ رنگ سے نچوڑے ہوئے رَس سے تیار کیا ہوا شہد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اختر کی تنقیدی کاوشیں ایک طرف اپنے نقطہ نظر سے ماقبل تنقیدی فیصلوں کو متاثر کر رہی تھیں، جبکہ ان کا اسلوب اپنی دلکشی کے باعث عام قارئین کے دلوں پر بھی اپنے نقش مرتسم کر رہا تھا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے اسلوب میں سراسر دل آویزی ہی تھی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں لہجے کی تلخی کم ہوتے ہوئے بالکل معدوم ہوگئی۔ ان کے ابتدائی مضمون 'ادب اور زندگی' میں زبان و بیان پر ان کے نظریات کی شدت کا غلبہ تھا، لیکن بعد ازاں ان کی تحریر میں نظریات کی حدت اسلوب کی نرمی میں گم ہوتی گئی۔ ان کی خودنوشت میں تنقیدی نکات کی کثیر تعداد موجود ہے، لیکن مجال ہے، جو کہیں لہجے کی گرمی یا جملے کا کھردراپن محسوس ہو۔

اختر کے تنقیدی اسلوب پر کہیں کہیں افسانوی نثر کی پرچھائیں سی پڑنے لگتی ہے، مثال کے طور پر 'بنگال کا باغی شاعر: نذرالاسلام' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، عراق کا میدانِ کارزار دِن بھر گرم رہ چکا تھا اور اب خدا خدا کر کے رات ہوئی ہے۔ ہر طرف سناٹا اور اندھیرا ہے، کبھی کبھی ہوائی جہاز دشمن کی ٹوہ لینے کے لیے نیچے روشنی پھینکتے ہیں۔ دفعتاً بندوقوں کی آواز اور بموں کی شورش سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ خندقوں میں سپاہی غفلت کی نیند سونے لگتے ہیں، مگر کسی خندق میں ایک سپاہی جاگ رہا ہے۔ دن بھر مورچے پر وہ بڑی مستعدی سے لڑتا رہا ہے اور تھکان سے اس کے بند بند ڈھیلے پڑ چکے ہیں۔ پھر بھی اس کی آنکھوں سے نیند کالے کوسوں دُور کیوں ہے؟ اس بے کلی اور بے چینی کی وجہ کیا ہے؟ اسے خود نہیں معلوم۔ تھوڑی دُوری پر شط العرب کا دھارا تیزی سے بہہ رہا ہے۔ سپاہی نذرالاسلام صرف یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے دل میں کچھ جذبات موجزن ہیں اور الفاظ کا جامہ پہننا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے اس نے شاعری کی باقاعدہ مشق نہیں کی تھی اور بحر و قوافی کے گروں سے ناواقف تھا، لیکن یہ وہ عالم ہے، جسے شاعر 'الہام' سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ اندھیرے میں پنسل سے کاغذ پر لکھنے لگتا ہے اور صبح ان جملوں کو دیکھ کر اس کی حیرت و استعجاب کی حد نہیں

ایک نقاد کی حیثیت عام طور پر ایک اسلوب ساز ادیب کی سی نہیں ہوتی، لیکن اختر بیک وقت افسانہ نگار، مضمون نگار اور نقاد تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ سنسکرت، ہندی، بنگالی، اردو، فارسی، گجراتی، انگریزی اور فرانسیسی پر دسترس رکھتے تھے، لہٰذا ان کے اسلوب میں ان زبانوں اور ان کے تہذیبی عناصر کا در آنا کوئی اَن ہونی بات نہیں۔ ان کا اسلوب گل ہائے رنگ رنگ سے نچوڑے ہوئے رَس سے تیار کیا ہوا شہد ہے۔

رہتی، بلا ارادہ اس نے ایک نظم لکھ ڈالی۔[21]

مظفر علی سید رقم طراز ہیں کہ اختر کی تنقیدی نثر پر کسی اَور نقاد کی نسبت حالی کی سلاست اور متانت کا خاصا اثر دکھائی دیتا ہے، بلکہ عزیز احمد نے تو اُن کے یہاں 'قبل از بلوغ جذباتیت کا مظاہرہ' دیکھا ہے اور ان کی تنقید کو جس 'مضحکہ خیز حد تک دہشت پسندی کا شکار' بتایا ہے تو یہ مبینہ خصوصیات ان کے اسلوبِ تحریر کا حصہ ہرگز نہیں کہی جا سکتیں۔ آپ ان کی تنقیدی آرا کو کتنا بھی انتہا پسندانہ کیوں نہ کہیں، اس میں وہ 'جوشِ جہاد' نہیں ملے گا، جس کی شکایت شمس الرحمٰن فاروقی نے کی ہے۔ لگتا ہے کہ زمانۂ تعلیم اور ابتدائی صحافیانہ مصروفیات کے دوران جو وقت انھوں نے کلکتے میں گزارا، اس میں انھوں نے بنگالی دہشت پسندوں کی پیشہ ورانہ قاتلوں جیسی 'سرد خونی' کا خوب مشاہدہ کیا ہوگا اور وہیں سے انھوں نے تنقید کا ایسا انداز سیکھا ہوگا، جس میں سہج سبھاؤ کے ساتھ کشتوں کے پشتے لگائے جا سکیں۔ یوں تو ان سے پہلے یگانہ چنگیزی ہو چکے تھے اور کلیم الدین احمد تشریف لانے والے تھے، لیکن جس طرح وہ تاریخی طور پر ان دونوں کے درمیان واقع ہیں، اسی طرح ان کا اسلوبِ تنقید اور ان کی بیدردی دونوں کا نقطۂ اتصال معلوم ہوتی ہے۔[22]

اردو زبان کی اس ترویج کو اُس وقت انقلابات نے بُری طرح روک دیا اور دونوں ممالک اپنی اپنی زبانوں کو سینے سے چمٹائے اپنے اپنے ملکوں میں اس کی ترقی و فروغ کے سامان کرنے لگے، لیکن دنیا کی ہوا بدلنے میں نصف صدی سے زیادہ مدت صرف نہیں ہوئی اور دیارِ غیر میں بسنے والے برِ عظیم کے باشندوں نے ایک تاریخی فیصلہ دیا، جس کے نتیجے میں اردو کو مٹانے اور ہندی کے فروغ کی تمام تر کوششیں اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکیں۔ ایسے حالات میں اردو کا دامن پہلے سے بھی زیادہ وسیع ہو گیا اور اب اردو ممالک اور مذاہب کی حدود سے باہر کھلی فضا میں سانس لے رہی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کی اردو...... عربی اور فارسی زدہ ہوگی اور نہ ہی سنسکرت زدہ، بلکہ وہ برِ عظیم کی علاقائی زبانوں سے سیراب ہوتی ہوئی ترقی کی انتہائی منازل طے کرتی جائے گی اور لسانی اموات کے اس دَور میں یہ اُن چند زبانوں میں شمار ہوگی، جو مستقبل میں داخل ہو سکیں گی۔

یہ ساری صورتِ حال بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اختر نے جس 'ہندوستانی' کا خواب دیکھا اور بعد میں جس کی شکستگی سے وہ دل شکستہ ہوئے، وہ خواب اب اپنی تعبیر پانے کو ہے۔ برِ عظیم کے باشندوں کے اس تاریخی فیصلے نے 'ہندوستانی' کو اردو کے روپ میں پالیا ہے اور وہ سبھی مل کر اس کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ ایسے میں اختر کے تراجم ایک بار پھر اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔

اختر کے تراجم کے مقام و مرتبے کی جانچ پرکھ کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ان کے بعد جن مترجمین نے بھی ان موضوعات کو ہاتھ لگایا، اختر سے مستفیض ہوئے بغیر قدم آگے نہ بڑھا سکے۔ نذرالاسلام کی نظمیں ہوں یا کالی داس کا ناٹک شکنتلا، گورکی کی آپ بیتی ہو یا پرل ایس بک کا ناول پیاری زمین، غرض ہر ترجمے میں اختر کے تخلیقی جوہر بھرپور انداز میں نمودار ہوئے ہیں۔

اختر نے تراجم میں جس اسلوب کو برتا ہے، اس میں لسانی تشکیل کا ایک ایسا سلسلہ بھی جاری و ساری ہے، جس کے نتیجے میں خیال کی منتقلی کے ساتھ ساتھ شاعری کی اصل روح بھی اردو زبان میں در آئی ہے۔ اختر نے ابلاغ کو یقینی بنانے کے لیے بعض تازہ و بلیغ جمالیاتی تراکیب

سے بھی کام لیا ہے۔ قاضی نذرالاسلام کی نظم 'کوئی زنجیر ہلاتا ہے' سے ایک اقتباس دیکھیے، جس میں ایسی کئی تراکیب ترجمے کی قدر و قیمت میں اضافہ کر رہی ہیں:

اوشمس گہریز! وہ پھونکوں سے تیرے چراغ کو بجھانا چاہتا ہے۔

اے خالق جدید! تیرے اشارے پر کس عزم و استقلال سے اسی راہ پر چل رہا ہے......

فقط تیری آواز کو مَیں نے سنا ہے اور اس کے آگے سر جھکا دیا ہے۔ جب جب تُو نے مجھے پکارا ہے، تجھے یہی جواب ملا ہے کہ ہاں ہاں، مَیں ثابت قدم ہوں، مَیں اٹل ہوں، مَیں اَچل ہوں۔

جب جب دشمن نے تیرے آئینہ جبیں پر لنگ کا ٹیکہ لگایا ہے، مَیں نے اپنے خون سے اسے دھوڈالا ہے۔

اس مایاندی کو ہم کب پار کریں گے؟ فریب و دجل کے اس ریگستان سے ہم کب نکلیں گے۔ کب ہم صداقت و راحت کے ساحل کو دیکھ سکیں گے؟

ناخدائے انقلاب! معبودِ شباب!

کچھ تجھے بھی اس کا حال معلوم ہے؟

او برق گفتار! اس شہرِ خموشاں میں آ، اور ہمیں زندگی کا سبق پڑھا۔[23]

محض آٹھ مصرعوں میں شمس گہریز، مایاندی، فریب و دجل کا ریگستان، ناخدائے انقلاب، معبودِ شباب اور برق گفتار جیسی اَنمول تراکیب کی موجودگی سے علم ہوتا ہے کہ بلاشبہ اختر کے ان تراجم سے اردو زبان کے دامن میں وسعت پیدا ہوئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس سے اختر کی تخلیقی اُپج کی نشاندہی بھی ہوتی ہے، جس سے ترجمے کو ادب میں ثانوی حیثیت دینے والوں کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوگی۔

کتاب خودنوشت پر مبنی ہو، خاکہ نگاری پر یا سفر نامہ نگاری پر، موضوع سے پہلے قاری کی توجہ کتاب کی جس خوبی یا خامی کی طرف مبذول ہوتی ہے، وہ اس کا اسلوب ہے۔ کتنی ہی اعلیٰ موضوعات کی حامل کتابیں محض اپنے اسلوب کی گراں باری کے سبب پہلی قرأت کی مسافت بھی طے نہیں کر پاتیں اور کتنی ہی کتابیں اپنے مشکوک تحقیقی معیار کے باوجود فقط اپنے اسلوب کی شیرینی کے باعث ابدی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔

گردِ راہ ایک ایسی خودنوشت ہے، جو موضوع و اسلوب، دونوں اعتبار سے اعلیٰ مقام و مرتبے کی حامل ہے۔ بار بار کی قرأت کے بعد بھی اس کا سحر کم نہیں ہوتا۔ انجم اعظمی کے نزدیک، اس سحر انگیزی کی ایک وجہ تحریر کی دلکشی ہے۔ تحریر کی شگفتگی اور دلکشی کا سبب زبان کی سادگی، بیان کا اختصار اور رمزیت کا حسن ہے۔ نازک مقامات سے گزرتے ہوئے انھوں نے رمز و اشارہ اور تلمیح کا سہارا لیا ہے[24]، کیونکہ بقول سحر انصاری، اختر کی قوتِ مشاہدہ اور استنباط بہت موثر ہے، (اس لیے) وہ متوازن انداز میں بڑی سے بڑی اور گہری سے گہری بات کو ادیبانہ سطح پر پیش کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔[25]

شبنم رومانی اور احمد ندیم قاسمی، اختر کے شاندار اسلوب کے آثار کی تلاش میں ان کی اوّلین تصانیف تک پہنچتے ہیں۔ شبنم رومانی کے خیال میں، اختر کی تحریر ویسے بھی اتنی شگفتہ اور مربوط ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو پڑھوانے کی زبردست قوت رکھتی ہے۔ 'ادب اور زندگی' سے لے کر گردِ راہ تک انھوں نے علم و دانش کے بہت سے معرکے سر کیے ہیں، لیکن گردِ راہ میں ان کا اسلوبِ تحریر اپنے عروج پر نظر آتا ہے اور فقرے کے فقرے ایسے ہیں، جو اقوالِ زرّیں کا درجہ رکھتے ہیں[26] اور قاسمی صاحب کے نزدیک، ان کے عہد شباب کی تحریروں کی روانی، گہرائی، سلاست و بلاغت میں ان کے مشاہدے اور تجربے کے تنوع نے جو موتی ٹانک دیے ہیں، وہ آپ ہی اپنا جواب ہیں۔[27]

> **اردو زبان کی اس ترویج کو اُس وقت انقلابات نے بُری طرح روک دیا اور دونوں ممالک اپنی اپنی زبانوں کو سینے سے چمٹائے اپنے اپنے ملکوں میں اس کی ترقی و فروغ کے سامان کرنے لگے، لیکن دنیا کی ہَوا بدلنے میں نصف صدی سے زیادہ مدت صرف نہیں ہوئی اور دیارِ غیر میں بسنے والے برعظیم کے باشندوں نے ایک تاریخی فیصلہ دیا، جس کے نتیجے میں اردو کو مٹانے اور ہندی کے فروغ کی تمام تر کوششیں اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکیں۔**

اگرچہ سحر انصاری نے اختر کی نثر پر جدید فرانسیسی نثر نگاروں کے اسلوب کا حوالہ دیا ہے[28]، تاہم ڈاکٹر جمیل جالبی کے نقطہ نظر کے مطابق گردِ راہ میں ایک ایسا اسلوب ابھرا ہے، جو اختر کی شناخت بن جاتا ہے اور جو لہجے کے دھیمے پن، لفظوں کی کفایت کے ساتھ استعمال کرنے کے ہنر، مشاہدات و تجربات کو ناپ تول کر بیان کرنے کی خصوصیت اور صاف ذہن کے ساتھ اپنی بات پوری طرح پڑھنے والوں کو پہنچانے کے شعوری عمل سے وجود میں آیا ہے۔[29]

حواشی اور حوالے:

1. ڈاکٹر انوار احمد، اردو افسانہ: تحقیق و تنقید، ص28
2. ڈاکٹر اعجاز حسین، مختصر تاریخِ ادبِ اردو، ص256
3. ظہور الحسن ڈار، 'اختر حسین رائے پوری: ایک جائزہ'، مطبوعہ افکار، نذرِ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ص201
4. ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، محبت اور نفرت، ص4
5. ایضاً، ص5
6. عتیق احمد، 'اختر حسین رائے پوری کی افسانہ نگاری'، مطبوعہ افکار، نذرِ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ص165
7. ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، محبت اور نفرت، ص5
8. ایضاً، ص5-6
9. ایضاً، ص81-82
10. ایضاً، ص86
11. ایضاً، ص91
12. ادیب سہیل، '.....'، اوراق، ص232
13. ڈاکٹر محمد صادق، '.....'، ترقی پسند افسانے کے پچاس سال، ص362
14. ظہور الحسن ڈار، محولہ بالا، ص202
15. ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، محبت اور نفرت، ص180
16. ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، محبت اور نفرت، ص70
17. ایضاً، ص214
18. ایضاً، ص222
19. ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، زندگی کا میلہ، ص32
20. ایضاً، ص34
21. ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، ص206-207
22. مظفر علی سید، 'اختر حسین رائے پوری: ناقد بطور پیش رو'، مطبوعہ افکار، نذرِ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ص147
23. پیام شباب، ص65-67
24. انجم اعظمی، 'ایک عہد آفریں کتاب'، مطبوعہ افکار، نذرِ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ص223
25. سحر انصاری، 'گردِ راہ: ایک جائزہ'، مطبوعہ افکار، کراچی، اپریل 1984
26. شبنم رومانی، 'اردو ادب کے قطب جنوبی: اختر حسین رائے پوری'، مطبوعہ روزنامہ مشرق، کراچی، 27 جون 1984
27. احمد ندیم قاسمی، 'ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری: گردِ راہ کی روشنی میں'، مطبوعہ افکار، نذرِ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ص82
28. سحر انصاری، محولہ بالا
29. ڈاکٹر جمیل جالبی، 'گردِ راہ: ایک منفرد کتاب'، مطبوعہ افکار، نذرِ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ص215

■

Dr. Khalid Nadeem, Asst. Prof . Dept of Urdu, Sargodha University, Sargodha (Pakistan)

جموں و کشمیر میں اردو تحقیق

مشتاق احمد وانی

تحقیق کے لغوی معنی حقیقت کی تلاش یا کھوج کے ہیں۔ یہ کائنات اور اس کی ہر شے انسان سے تحقیق کا تقاضا کرتی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے تحقیق کا جذبہ انسان کی زندگی میں کارفرما رہا ہے کیونکہ مظاہر فطرت کی تمام پوشیدہ طاقتوں کو جاننے، اُن سے فیضیاب ہونے اور خوب سے خوب تر کی جستجو اور کرید کا جذبہ فطری طور پر انسان کی سرشت میں موجود ہے۔

> **تحقیقی کام کرنے والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیاجاسکتا ہے ۔ پہلا گروہ اُن افراد کا ہے جو تحقیق جیسے ایماندارانہ اور منصفانہ فریضے کو انفرادی حیثیت سے انجام دیتے ہیں ۔ عشق اورہوس کی تفریق کو وہ بہتر جانتے ہیں۔ تحقیق اُن کے نزدیک علمی فریضے کا درجہ رکھتی ہے ۔ وہ شہرت اوردولت کی خاطر تحقیق نہیں کرتے مگر ایسے مخلصین کی تعداد بہت کم ہے ۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو علمی وادبی دانشگاہوں میں اُستاد کے عہدے پر فائز ہیں ۔ ان کی دوہری ذمے داری ہے کہ وہ بذات خود بہترین تحقیقی کارنامے انجام دیں، دوسرے اپنی زیر نگرانی طلبہ کو منتخبہ موضوعات پر اتنی زیادہ محنت کروائیں کہ ریسر چ اسکالر موضوع کے ساتھ صحیح انصاف کرسکے ۔**

جہاں تک اُردو ادبی تحقیق کی عمر کا تعلق ہے وہ تقریباً دوسو برس کے عرصے کو محیط ہے مگر اس کے باوجود اسے جن ممتاز محققوں نے انتہائی محنت ولگن اور ایماندارانہ جذبے کے تحت ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر اُستوار کر کے حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا کے مصداق بنایا۔ اُن میں سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق اور تقسیم ہند کے بعد مسعود حسن خان رضوی ادیب، مولانا امتیاز علی خان عرشی، قاضی عبدالودود، گیان چند جین، پروفیسر گوپی چند نارنگ، رشید حسن خان، مالک رام، اسلم فرخی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، محمود الٰہی، نور الحسن ہاشمی، سیدہ جعفر اور وحید قریشی اُردو تحقیق میں ایسے معتبر نام ہیں جنھوں نے تحقیق کے اُصول اور طریقۂ کار مرتب کر کے اسے باضابطہ طور پر ایک سائنسی علم بنا دیا۔ ان محققین کے بعد جن لوگوں نے اُردو تحقیق میں اپنا نام و مقام پیدا کیا۔ اُن میں نور الحسن نقوی، نذیر احمد، مختار الدین احمد، پروفیسر قمر رئیس ، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر عابد پیشاوری، پروفیسر عبدالستار دلوی، کالی داس گپتا رضا، پروفیسر تنویر احمد علوی، پروفیسر منظر اعظمی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر برج پریمی، ڈاکٹر اکبر حیدری، محمد یوسف ٹینگ، عبدالغنی، شیخ لداخی اور پروفیسر ظہور الدین جیسے محققین کے اسمائے گرامی خاصی اہمیت کے حامل ہیں کہ جنھوں نے اُردو تحقیق کو نہ صرف نئی جہتوں سے آشنا کیا بلکہ اسے اعتبار و معیار اور وقار بھی بخشا۔

تحقیق نہایت مشکل عمل ہے۔ ادبی تحقیق میں موضوع کا انتخاب سے لے کر مواد کی فراہمی، حوالوں کے معتبر اور غیر معتبر کی پہچان اور صحیح معلومات اخذ کرنے یا چھان پھٹک کے بعد مقالے کی تسوید ایسے دشوار گزار مراحل ہیں کہ جو بغیر اصول تحقیق کی پیروی کے طے نہیں کیے جاسکتے۔ محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تحقیق بلاشبہ ایک کٹھن، صبر آزما اور محنت و دِقت طلب کام ہے۔ بقول نارائن دت:

''درحقیقت ادبی و تحقیقی مقالہ لکھنا جانفشانی کا کام ہے۔سب سے پہلے موضوع کے مطابق مقالے کا خاکہ تیار کرنا ہوتا ہے اور پھر اس خاکے کے مطابق مواد اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد گہرے مطالعے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے پھر کہیں جا کر مقالے کو ترتیب دی جاسکتی ہے۔ یہ کام کافی محنت ولگن مانگتا ہے اور اس کام کو صرف اُردو زبان و ادب سے عشق کی حد تک محبت کرنے والے فن کار ہی انجام دے سکتے ہیں۔

(محکمہ السنہ پنجاب کی جانب سے لکھوائے گئے تحقیقی مقالات'' مشمولہ 'پروازِ ادب' (بھاشا وبھاگ پنجاب پٹیالہ۔شمارہ نومبر، دسمبر 1999، ص 41)

تحقیقی کام کرنے والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ پہلا گروہ اُن افراد کا ہے جو تحقیق جیسے ایماندارانہ اور منصفانہ فریضے کو انفرادی حیثیت سے انجام دیتے ہیں۔ عشق اور ہوس کی تفریق کو وہ بہتر جانتے ہیں۔ تحقیق اُن کے نزدیک علمی فریضے کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ شہرت اور دولت کی خاطر تحقیق نہیں کرتے مگر ایسے مخلصین کی تعداد بہت کم ہے۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو علمی و ادبی دانشگاہوں میں اُستاد کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی دوہری ذمے داری ہے کہ وہ بذاتِ خود بہترین تحقیقی کارنامے انجام دیں، دوسرے اپنی زیر نگرانی طلبہ کو منتخبہ موضوعات پر اتنی زیادہ محنت کروائیں کہ ریسرچ اسکالر موضوع کے ساتھ صحیح انصاف کر سکے۔

جموں و کشمیر میں اُردو تحقیق کے اوّلین نقوش ہمیں محمد الدین فوق مرحوم کی بعض تحریروں میں ملتے ہیں۔ یہ دُرست ہے کہ فوق کی تحقیق کا اصل دائرہ تاریخ ہے۔مگر

اُن کے کئی تذکرے ایسے ہیں جن کا تعلق براہِ راست ادبی تحقیق کے ساتھ ہے۔ مثلاً یادرفتگاں، تذکرہ علمائے لاہور، اور تذکرہ اخبار نویساں۔ فوق کی یہ تمام تصانیف تحقیقی نوعیت کی ہیں۔

محمد عمر نورالٰہی دو ادب نواز دوستوں نے مشترکہ نام سے 'ناٹک ساگر' جیسی معرکتہ الآرا تصنیف بطور یادگار چھوڑی ہے۔ جو 1924 میں پہلی مرتبہ لاہور سے شائع ہوئی۔ مذکورہ کتاب ڈرامانگاری کے فن اوراس کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں حقائق کی بازیافت اور واقعات کی صحت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ مصنّفین نے بڑی جگرسوزی کے ساتھ مواد اکٹھا کیا ہے۔

حبیب کیفوی نے 'کشمیر میں اُردو' کے عنوان سے ادبی حلقوں میں بحثیت محقق اپنی شناخت قائم کی۔ مذکورہ کتاب میں فاضل مصنف 'کوہستان جموں کا ایک عوامی شاعر داس علی' کشمیر میں عیسائی مشنریوں کی آمد، تعلیم کی ابتدا، جموں میں محرم کی مجلسیں، نظیرا کبرآبادی کی مقبولیت، جموں میں ناٹک کمپنی کا قیام اور اُردو کی ترویج، کشمیر میں ہندوستان کے سیاحوں کی آمد ورفت، اُردو کشمیری کے مشترک الفاظ، صوبہ جموں کی تحصیل بھمبر میں فوجی دربار اور حکام کی اُردو میں تقریریں، انگریز ریکروٹنگ افسر میجر ٹنکرڈ کی اُردو میں تقریر، ڈاکٹر دیوان بدری ناتھ ریکروٹنگ سکریٹری کی تقریر اور مشیر مال چوہدری خوشی محمد ناظر کی تقریر، جیسے ذیلی عنوانات کے تحت 'کشمیر میں اُردو' سے متعلق مواد کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ تمام تاریخی اور لسانی حقائق واضح طور پر قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ مصنف نے اگرچہ اس کتاب کا نام 'کشمیر میں اُردو' تجویز کیا ہے۔ مگر اس میں جموں میں اُردو کی نشو ونما کا بھی تفصیلی ذکر موجود ہے۔

عبدالاحد آزاد کی گراں مایہ تصنیف 'کشمیری زبان اورشاعری' کو بھی ادبی تحقیق کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ تین جلدوں پہ مشتمل یہ ضخیم تحقیقی مقالہ اگر چہ اُن کی حیات میں زیورطباعت سے آراستہ ہوکر منظرعام پر نہیں آیا لیکن آزادی کے بعد 1959 میں جموں وکشمیر کلچرل اکادمی نے اسے اہتمام سے تین جلدوں میں شائع کیا۔ 'کشمیری زبان اور شاعری' عبدالاحد آزاد کا ایک ایسا جامع اور قابل قدر تحقیقی کارنامہ ہے جس میں لل دید سے مہجور کے عہد تک تقریباً تمام معروف اور غیر معروف شعرا کا ذکر معتبر ماخذ اور حوالوں سے ملتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ مذکورہ تحقیقی مقالہ کسی بھی انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں ہے۔

1947 کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق کے میدان میں جن محققوں نے اپنے تحقیقی کارناموں سے ادبی تحقیق کو وقار بخشا اُن میں ڈاکٹر اکبر حیدری، پروفیسر حامدی کاشمیری، محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر برج پریمی، پروفیسر ظہور الدین، محمد زماں آزردہ، گیان چند جین، پروفیسر شیام لعل کالرا عابد پیشاوری، منظر اعظمی، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر بشیر احمد نحوی، ڈاکٹر نذیر احمد ملک، ڈاکٹر مجید مضمر (مرحوم) اور ڈاکٹر فرید پربتی (مرحوم) کے علاوہ اور بھی کچھ نام ہیں جنھوں نے

جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق کے حوالے سے آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی ایک اہم نام ہے. اُن کا اہم تحقیقی مقالہ 'سعادت حسن منٹو : حیات اور کارنامے' ہے کہ جس میں انھوں نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ منٹو کی حیات اور اُن کی علمی وادبی سرگرمیوں کو تحقیق کے طریقۂ کار کے مطابق ایک عمدہ مقالہ تحریر کیا ہے۔

تحقیق وتنقید کے رشتے کو مستحکم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ محمد یوسف ٹینگ کے علاوہ ان تمام محققین کا تعلق جموں اور کشمیر یونیورسٹی کے اُردو شعبے سے رہا ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کا شمار جموں وکشمیر کے اہم محققین میں ہوتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر محقق تھے جن کی تحقیقی تصانیف کی کل تعداد 70 ہے۔ انھوں نے محققانہ جگر کاوی سے میر تقی میر، اقبال اور انیس کے علاوہ مرثیہ، تذکرہ اور کلاسیکی شعروادب کے بے شمار دفینوں کا انکشاف کیا جو گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ اُن کے کئی تحقیقی کارنامے اُردو ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔

پروفیسر حامدی کاشمیری ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں۔ ناول، افسانہ اور جدید حسیات اور تقاضوں سے تعلق رکھنے والی شاعری میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ وہ اگر چہ اکتشافی تنقید کے بنیادگزار ہیں لیکن ان کی چند کتابیں براہِ راست تحقیقی نوعیت کی ہیں مثلاً جدید اُردو نظم پر یورپی اثرات 'غالب کے تخلیقی سرچشمے' اور 'کارگہہ شیشہ گری' (میر کا مطالعہ) ان کی تحقیق کے عمدہ نمونے ہیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری بین الاقوامی سطح کے شہرت یافتہ ادیب اور شاعر ہیں کہ جن کی تحقیقی وتنقیدی سرگرمیاں برابر جاری ہیں۔

کشمیر کی تاریخ، تہذیب، ادب اور ثقافت کو جس ادبی شخصیت نے اردو کے ذریعے متعارف کرایا وہ محمد یوسف ٹینگ ہیں۔ انھیں اپنے مادر وطن کشمیر سے بے پناہ محبت ہے اس لیے اُن کی تحقیقی کتب میں کشمیر اور کشمیری شعر وادب کا پورا منظرنامہ درآیا ہے۔ ایک طویل عرصے تک ریاستی کلچرل اکادمی میں منتظم کی حیثیت سے کام کرتے رہے کہ جہاں انھوں نے 'شیرازہ' اور 'ہمارا ادب' جیسے اُردو کے رسائل کو اپنی مدیرانہ صلاحیتوں سے وقار بخشا۔ میر، غالب، اقبال، ناصر کاظمی، منٹو اور کشمیری ادبیات کے حوالے سے رسول میر، مہجور، لل دید، شیخ العالم اور عبدالاحد آزاد وغیرہ پر اُن کے مضامین بصیرت افروز ہیں۔ گزشتہ برسوں کے دوران محمد یوسف ٹینگ کے تحقیقی مضامین کے جو مجموعے منظر عام پر آکر قارئین سے داد وتحسین وصول کر چکے ہیں اُن میں 'شناخت، جستہ جستہ، شش رنگ' اور 'کشمیر قلم' بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے شیخ نورالدین ولیؒ جیسے صوفی شعرا سے لے کر للہ عارفہ اور شمس فقیر پر تحقیقی مقالے لکھے ہیں۔ ان تمام تحقیقی مضامین سے موصوف کی تحقیق سے دلچسپی اور ان کے علمی وادبی شعور کی کارفرمائی کا پتا چلتا ہے۔

جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق کے حوالے سے آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی ایک اہم نام ہے۔ اُن کا اہم تحقیقی مقالہ 'سعادت حسن منٹو : حیات اور کارنامے' ہے کہ جس میں انھوں نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ منٹو کی حیات اور اُن کی علمی وادبی سرگرمیوں کو تحقیق کے طریقۂ کار کے مطابق ایک عمدہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی کا مذکورہ مقالہ نہایت جامع، مستند ہونے کے ساتھ ساتھ منٹویات کے سلسلے میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ برج پریمی کی 'کشمیر کے مضامین'، 'جلوۂ صدرنگ'، 'ذوق نظر' اور 'جموں وکشمیر میں اُردو کی نشو ونما' جیسی تحقیقی کتابیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ انھیں ادبی تحقیق سے گہرا شغف تھا اور اس کے تقاضوں کو وہ بخوبی جانتے تھے۔

صوبہ جموں سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ظہور الدین نے تحقیق وتنقید کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ رہنے کی وجہ سے انھوں نے نہ صرف ذہین اسکالروں سے اپنی نگرانی میں نئے موضوعات پر

بہترین تحقیقی مقالے لکھوائے بلکہ خود بھی قابل تحسین تحقیقی کام کیا۔ 'بیسویں صدی کے اُردو ادب پر انگریزی کے ادبی رُجحانات'، 'صوبہ جموں میں اُردو زبان وادب کی ترقی'، 'جدید اُردو ڈراما' اور 'کہانی کا ارتقا' اپنے موضوع مواد اور زبان وبیان کے اعتبار سے تحقیقی تصانیف ہیں۔ دلائل وشواہد کے معاملے میں پروفیسر ظہورالدین نہایت احتیاط برتنے کے روادار ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے پروفیسر محمد زماں آزردہ کا تحقیقی مقالہ 'مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے' تحقیقی مقالات کی بھیڑ میں ایک اہم مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہاں ان محققوں کا ذکر کرنا بھی لازمی معلوم ہوتا ہے کہ جو اگرچہ ریاست جموں وکشمیر کے باشندے نہیں تھے مگر وہ جموں وکشمیر یونیورسٹی کے اُردو شعبے یا اقبال انسٹی ٹیوٹ میں بحثیت پروفیسر کام کرتے رہے۔ اُن مقتدر ادبی شخصیات میں پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر شیام لعل کالرا، منظر اعظمی، پروفیسر عبدالقادر سروری، محی الدین قادری زور، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر محمد حسن نے اُردو تحقیق کو جو وقار بخشا وہ یہاں کی اُردو ادبی تاریخ کے لیے باعث صد افتخار ہے۔ پروفیسر گیان چند جین جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے بانی تھے۔ وہ ایک طویل عرصے تک اس شعبے سے وابستہ رہے۔ یہاں رہتے ہوئے انھوں نے جو سب سے اہم تحقیقی کام کیا وہ 'تفسیر غالب' ہے۔ یہ ایک ضخیم مقالہ ہے جس میں غالب اور غالبیات سے متعلق بڑی صراحت ووضاحت کے ساتھ پوری معلومات درج ہے۔ پروفیسر شیام لعل کالرا عابد پیشاوری کا تحقیقی مقالہ 'انشاء اللہ خان انشا دہلوی: حیات، شخصیت اور کارنامے' اس لحاظ سے نہایت اہم اور مثالی مقالہ ہے کہ اس میں تحقیق کے اصولوں کی خاص پابندی کی گئی ہے۔ عابد پیشاوری نے انشاء اللہ خاں انشا سے متعلق بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کے بعد جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ بصیرت افروز ہیں انھوں نے نہ صرف مستند مآخذ سے مواد حاصل کیا ہے بلکہ دوسرے شواہد کی روشنی میں بھی ان کی چھان پھٹک کی ہے۔ ڈاکٹر منظر اعظمی نے اُردو میں تمثیل نگاری اور 'سب رس کا تنقیدی جائزہ' جیسے تحقیقی مقالے لکھ کر اُردو تحقیق کو فروغ بخشا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہے جہاں انھوں نے 'کشمیر میں اردو' جیسا تاریخ ساز تحقیقی مقالہ لکھا جسے نہایت اہتمام کے ساتھ جموں وکشمیر کلچرل اکادمی نے شائع کیا۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے 'غالب کی جمالیات' آل احمد سرور نے 'اقبال اور تصوف' اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے جموں یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں رہتے ہوئے اقبال اور اقبالیات سے متعلق بہترین تحقیقی کام کیا۔ اس سلسلے میں اُن کی تحقیقی تصانیف میں اقبال اور کشمیر' اقبال اور مغربی مفکرین' محمد اقبال ایک ادبی سوانح، اور 'نشانِ منزل' ادبی تحقیق میں خاصی اہمیت

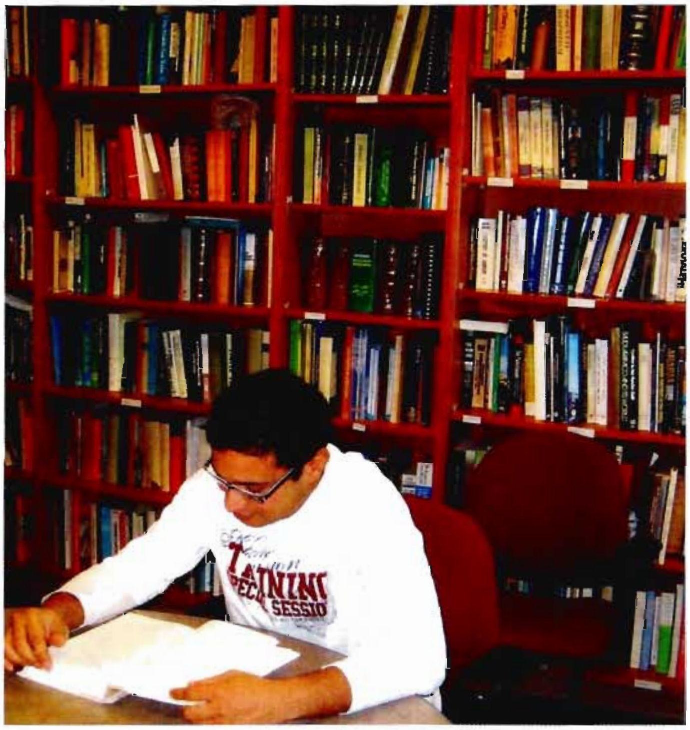

وافادیت کی حامل ہیں۔ پروفیسر قدوس جاوید شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ شعبے میں رہتے ہوئے انھوں نے اپنی نگرانی میں اُردو تنقید میں اقبال شناسی' داستانی روایت اور اُردو ناول' اُردو افسانے میں حقیقت نگاری' اُردو تنقید پر سماجی وتہذیبی اثرات'، 'اُردو غزل میں ہندوستانی موسیقی کے عناصر' اُردو افسانے کے فروغ میں سکھوں کا رول' اکبر حیدری: حیات اور کارنامے' اور 'اُردو غزل جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک' ایسے اہم موضوعات ہیں جن پر ذہین اور سنجیدہ اسکالروں سے تحقیقی مقالات لکھوائے نیز انھوں نے بذاتِ خود اقبال کی تخلیقیت اور 'اقبال کی جمالیات' پر قابل قدر کتابیں لکھیں۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی کا تعلق اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر سے ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے بعد اگر کسی شخص کو اقبال اور اقبالیات سے والہانہ عشق ہے تو وہ بشیر احمد نحوی ہیں۔ انھیں حافظ کلام اقبال ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ چھبیس کتابوں کے مصنف ہیں۔ 'مسائل تصوف اور اقبال' کے علاوہ 'اقبال افکار واحوال' ان کی اہم تحقیقی کتب ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد ملک حال ہی میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ تحقیق وتنقید اُن کا خاص ادبی میدان ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کی نگرانی میں انھوں نے 'اردو رسم الخط ارتقا اور جائزہ' کے عنوان سے ایک عمدہ تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ پروفیسر مجید مضمر (مرحوم) کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر رہ چکے ہیں۔ 'اُردو افسانے میں علامت نگاری' اُن کا تحقیقی مقالہ ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے اس مقالے میں انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اُن تمام حقائق کی نشاندہی کی ہے جو افسانے میں علامت نگاری سے تعلق رکھتے ہیں۔ مذکورہ مقالے کو پڑھتے ہوئے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ محقق نے جانفشانی اور ادبی ذوق کی بنیاد پر ایک اچھا مقالہ لکھ ڈالا ہے۔ ڈاکٹر منصور احمد منصور بھی کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں کام کر رہے ہیں ان کا تحقیقی مقالہ 'اُردو افسانے میں تہذیبی عناصر' یقیناً ایک بہترین مقالہ ہے۔ جس کی قرأت سے قاری نہ صرف معلومات حاصل کرتا ہے۔ بلکہ زبان وبیان کی دلکشی سے بھی محظوظ ہوتا ہے۔

جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد، منظر اعظمی، پروفیسر ظہورالدین اور پروفیسر شیام لعل کالرا عابد پیشاوری جیسے ذہین اور محنتی اساتذہ نے اُردو تحقیق کا جو اعتبار ومعیار قائم کیا تھا وہ اُن کے بعد قائم نہیں رہ پایا۔

ریاست جموں وکشمیر کے علمی وادبی اداروں سے شائع ہونے والے رسائل وجرائد میں جو تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں وہ معیاری اور تسلی بخش ہوتے ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے 'بازیافت' نام کا رسالہ شائع ہوتا ہے۔ جس میں تحقیقی وتنقیدی نوعیت کے مضامین چھپتے ہیں۔ جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر ظہورالدین

نے اپنی مساعیِ جمیلہ سے 'تسلسل' نام کا ششماہی رسالہ جاری کروایا تھا جو فی الحال زندہ ہے۔ اس میں اساتذہ اور طلبہ کے تحقیقی مضامین چھپتے ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی کا اقبالیات کا شعبہ 'اقبال انسٹی ٹیوٹ' نہایت فعال ہے۔ اس شعبے کی تمام ادبی و تحقیقی سرگرمیاں ہر سال مجلّہ 'اقبالیات' میں شائع ہوتی ہیں جہاں تک مضامین کا تعلق ہے وہ اقبال کے فکر و فن اور ان کی حیات و شخصیت کے نئے پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے تحت اب تک تقریباً چالیس سے زائد طلبہ وطالبات تحقیق کر چکے ہیں۔

جموں وکشمیر کلچرل اکادمی کی جانب سے اردو کا ایک موقر و معیاری رسالہ 'شیرازہ' تقریباً پانچ دہائیوں سے شائع ہو رہا ہے۔ شروع میں اس جریدے کی ادارت کے فرائض محترم جناب محمد یوسف ٹینگ نے انجام دیئے اور بہت کم مدت میں انھوں نے اسے ملک کے مقتدر رسائل کی فہرست میں شامل کرایا۔ ٹینگ صاحب کی ادارت میں 'شیرازہ' میں ریاستی اور غیر ریاستی محققوں اور نقادوں کی معیاری ادبی نگارشات شائع ہوتی تھیں۔ آج کل محمد اشرف ٹاک کی ادارت میں یہ جریدہ شائع ہوتا ہے۔ یہ بات باعث مسرت ہے کہ انھوں نے بھی اس جریدے کے معیار کا خاص خیال رکھا ہے۔ سلیم سالک شیرازہ (اُردو) کے معاون مدیر ہیں۔ ماضی قریب میں شیرازہ کے چند یادگاری شخصیات نمبر شائع کیے گئے ہیں جن میں حامدی کاشمیری نمبر، غلام رسول سنتوش نمبر، شمیم احمد شمیم نمبر، پشکرناتھ نمبر، عمر مجید نمبر، یٰسین بیگ نمبر، محمد یوسف ٹینگ نمبر، فرید پربتی نمبر، ہمعصر شاعری نمبر اور آٹھ جلدوں پہ مشتمل جموں وکشمیر اور لداخ (تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں) شامل ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر کا محکمۂ اطلاعات بھی اُردو کا ایک ماہنامہ 'تعمیر' کے نام سے شائع کرتا ہے۔ 1951 میں یہ رسالہ جاری کیا گیا تھا جس کی ادارت کے فرائض معروف سیاستداں، دانشور اور ادیب شمیم احمد شمیم نے انجام دیے تھے، ان کے بعد محترم جناب یوسف ٹینگ اور غلام نبی بابا کے علاوہ خالد بشیر کی ادارت میں بھی ماہنامہ 'تعمیر' شائع ہوتا رہا۔ اس رسالے کے کئی خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے۔ مثلاً مہجور نمبر، آزاد نمبر، پریم چند نمبر اور جموں وکشمیر ادب نمبر قابل ذکر ہیں۔ ان سرکاری رسائل و جرائد کے علاوہ غیر سرکاری رسائل میں۔ ماہنامہ 'حکیم الامت' (سرینگر) سہ ماہی 'بزم ادب' (کشمیر) ماہنامہ 'لفظ لفظ' اور تقریباً نو ماہ سے ایک سہ ماہی رسالہ 'تفہیم' ضلع راجوری سے شائع ہوتا ہے۔ حکیم الامت، کے مدیر ظفر حیدری ہیں۔ 'بزم ادب' کا ہر شمارہ تقریباً ڈھائی سو صفحات پہ مشتمل ہوتا ہے۔ ابن اسماعیل اس خالص ادبی جریدے کے مدیر ہیں تقریباً دس برس سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

جموں وکشمیر یونیورسٹی کے اُردو شعبے کے علاوہ بہت سے ایسے نام ہیں جو نہ صرف اُردو تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ انھوں نے چند اہم موضوعات پہ اچھے تحقیقی مضامین اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں ریاست جموں وکشمیر کے معروف ادیب اور لداخ کی تاریخ اور تہذیب وتمدن پر گہری نظر رکھنے والے عبدالغنی شیخ لداخی کا نام سرفہرست ہے۔

ماہنامہ 'لفظ لفظ' کے مدیر زاہد مختیار ہیں جبکہ سہ ماہی رسالہ 'تفہیم' کے مدیران خالد کرار اور عمر فرحت ہیں۔ ان تمام رسائل وجرائد میں نہ صرف ریاستی بلکہ بیرون ریاست کے قلمکاروں کے تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ ان رسائل وجرائد کے علاوہ روزنامہ 'کشمیر عظمیٰ' (جو بیک وقت جموں اور کشمیر سے شائع ہوتا ہے) اور 'اڑان' (جموں) میں بھی مقامی اور غیر مقامی قلمکاروں کی تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی نگارشات ہر ہفتے باقاعدگی سے شائع ہوتی ہیں۔

جموں وکشمیر یونیورسٹی کے اُردو شعبے کے علاوہ بہت سے ایسے نام ہیں جو نہ صرف اُردو تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ انھوں نے چند اہم موضوعات پہ اچھے تحقیقی مضامین اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں ریاست جموں وکشمیر کے معروف ادیب اور لداخ کی تاریخ اور تہذیب وتمدن پر گہری نظر رکھنے والے عبدالغنی شیخ لداخی کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے لداخ تہذیب و ثقافت ''لداخ...... محققوں اور سیاحوں کی نظر میں 'لداخ، آزادی کے بعد' قلم، قلم کار اور کتاب' اور 'اسلام اور سائنس' جیسی تحقیقی کتابیں لکھ کر اُردو تحقیق میں اپنا ایک خاص مقام بنایا ان کے علاوہ ولی محمد بٹ اسیر کشتواڑی نے نہایت محققانہ جگر کاوی سے 'ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت' تصویر ضلع ڈوڈہ' اور 'تاریخ اشاعتِ اسلام' جیسی قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ ٹی آر رینا نے میلارام وفا کی شاعری اور ان کی ادبی خدمات پہ اچھا کام کیا ہے۔ انھوں نے حال ہی میں رشید حسن خان کے خطوط کو مرتب کر کے شائع کرایا ہے۔ ان کے علاوہ ایک طویل فہرست ہے۔ راقم الحروف کا تحقیقی مقالہ 'تقسیم کے بعد اُردو ناول میں تہذیبی بحران' کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے 2002 میں شائع کیا۔ 452 صفحات پر مشتمل یہ مقالہ ساڑھے چار برس کی مسلسل محنت ولگن کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ 780 صفحات پر مشتمل ایک اور ضخیم تحقیقی مقالہ ' اُردو ادب میں تانیثیت' (Feminism in urdu literature) کو بھی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے اسی سال مارچ 2013 میں چھاپا ہے۔ یہ مقالہ اس ناچیز کی دس سالہ عرق ریزی کے بعد زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق کی صورتِ حال بہت حد تک اطمینان بخش نہیں ہے۔ یہاں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو تحقیق جیسے کٹھن، صبر آزما اور دیانتدارانہ علمی فریضے کو تحقیقی اصولوں کے مطابق انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہاں راقم الحروف کے اس بیان سے ہر کوئی اتفاق کرے گا کہ جب تک یونیورسٹیوں میں تحقیق اور بالخصوص ادبی تحقیق کے لیے محنتی، ہونہار، ذہین اور باصلاحیت طالب علموں کا انتخاب نہ کیا جائے گا۔ تب تک ادبی تحقیق کا معیار ہرگز بلند نہ ہوگا۔ بصورتِ دیگر تحقیق کے نام پر ہزاروں صفحات تو سامنے آئیں گے لیکن سوائے توارد، سرقہ اور ہو بہو نقل یا سوائے اقتباسات کے مجموعوں کے اور کچھ نہیں ہوگا۔

■

Dr. Mushtaq Ahmed Wani,Lane No.3 House No.7, Firdousabaad Sunjwan, Jammu Tawi-180011

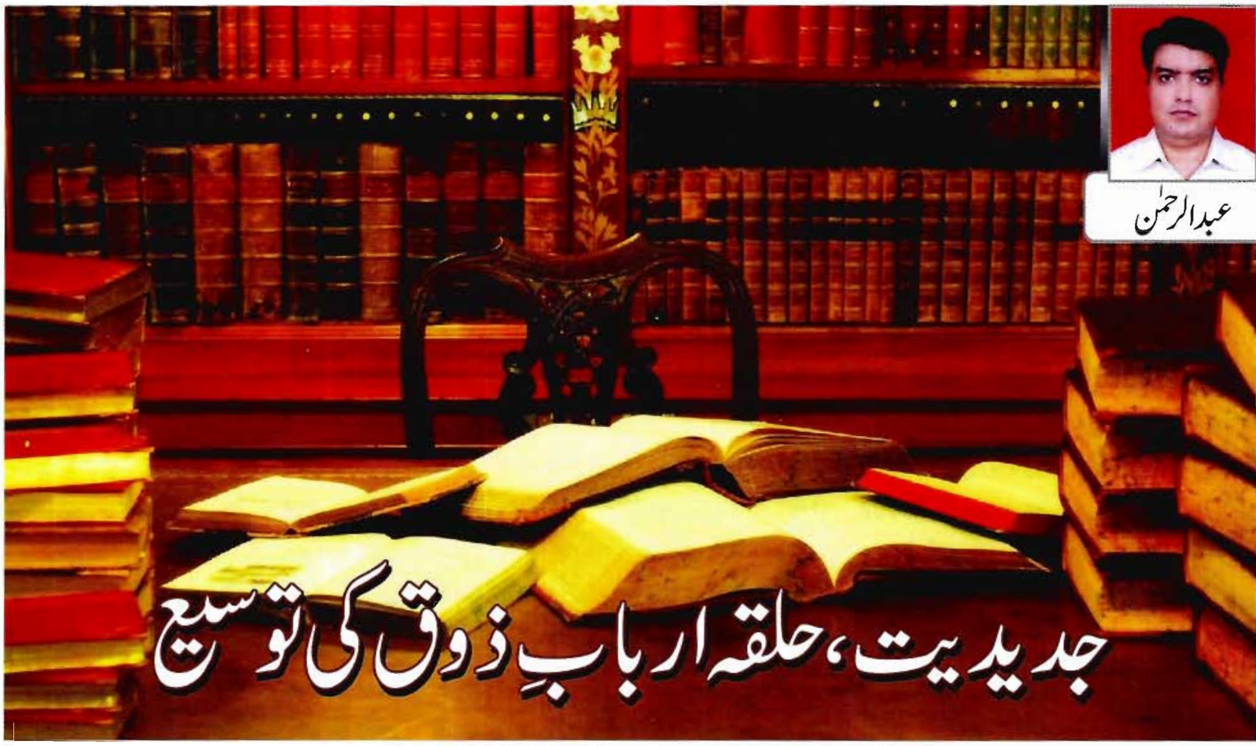

جدیدیت، حلقہ اربابِ ذوق کی توسیع

حلقہ ارباب ذوق کے شعری نظریے کا اثر جدید اردو شاعری پر بہت گہرے طور پر ہوا۔ حلقے کے زیر اثر جدید شعرا نے اپنے انفرادی احساس کو مختلف رنگوں میں پیش کیا اور اس سلسلے میں مختلف قسم کی ہیئت و اسلوب سے شعری اظہار کو وسعت دی۔ نیز مختلف علامتوں کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کی بھرپور ترجمانی کی کیونکہ اپنے احساسات و جذبات کی ترجمانی کے لیے انھیں وہ چیز حاصل ہوگئی تھی جس کی ایجاد میراجی اور راشد کے علاوہ حلقہ ارباب ذوق کے دیگر شاعروں نے کی تھی۔ حلقہ ارباب ذوق نے جدید شعرا کو اپنی ذات کے اظہار کی پیشکش کا پورا حق دیا تھا جو کہ ترقی پسند تحریک سے منسلک شعرا کے لیے ممکن نہ تھا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے جدید شاعروں پر حلقہ ارباب ذوق کے شعرا بالخصوص میراجی اور راشد کے فکری وفنی اثرات کی وضاحت یوں کی ہے:

''حلقہ ارباب ذوق کے توسط سے میراجی کا اثر نئے شعرا خصوصاً حلقے سے متاثر شعرا پر زیادہ رہا۔ لیکن موضوعات کی وسعت اور آفاقیت کے لحاظ سے ن م راشد، میراجی سے آگے رہے... حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی اجتہادی جسارت سے ہوائے ندرت کے تازہ جھونکوں کے لیے فن کے دریچے وا کیے اور اس طرح سے اردو شعر و ادب کو نئے سانچوں، طرز احساس کی جدت اور علامتوں کی انوکھی اثر انگیزی سے روشناس کرایا۔

(ڈاکٹر شمیم حنفی: نئی شعری روایت، ص68)

جبکہ ڈاکٹر انور سدید کے خیال کے مطابق:

''آزادی کے بعد اردو ادب میں جو بھی تحریکیں پیدا ہوئیں ان میں بیشتر کا سرچشمہ حلقہ ارباب ذوق کی تحریک سے متعلق ہے۔''

(انور سدید: اردو ادب کی تحریکیں، ص36)

جدید شعرا اپنے تجربوں کے اظہار کے لیے فکری و فنی آزادی کے خواہاں تھے۔ انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ نہ تو افادی اور مقصدی شاعری کا حالی کا منشور ان کے لیے موزوں ہے اور نہ ہی ترقی پسند تحریک کے فکری وفنی احکامات ان کے کام کی چیز ہے۔ نئے شعرا اپنے پیش رووں سے الگ کردار ادا کرنا چاہتے تھے جس کے لیے حلقہ ارباب ذوق کی شکل میں اسٹیج پہلے ہی سے تیار ہو چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ حلقے کی طرز شاعری جدید شاعروں کے لیے منزل کی حیثیت تو نہیں رکھتی تاہم ان کے لیے مشعل راہ ضرور تھی۔

اردو ادب کا شعور رکھنے والا ہر فرد یہ جانتا ہے کہ حلقہ ارباب ذوق کے شعرا نے داخلی سوز و گداز، اندرونی ربط، نجی علامتوں کے استعمال اور آزاد تلازمۂ خیال کے ذریعے ہیئت اور پیرایہ اظہار میں انوکھے تجربے کیے اور ان کی اس جدت کا گہرا اثر اردو شاعری پر پڑا۔ حلقے سے منسلک شاعروں نے مغرب کے زیر اثر نظم نگاری کا جدید تصور اخذ کیا۔ نظم کے موضوعات تو باقی رہے مگر کسی خیال، جذبہ و احساس کو ارتقائی شکل میں پیش کیا گیا۔

حلقہ ارباب کے شاعروں نے جدید شاعری کے جس تصور کا رواج پیدا کیا، بعد میں آنے والی نسل کے شعرا نے اسے اپنایا اور مزید رنگ و روغن عطا کیا۔ حلقے سے بالواسطہ طور پر متاثر ہونے والی نئی شاعری میں ایک طرف اگر بہتر زندگی، سماجی مساوات، معاشی انصاف جیسی اقدار ہیں تو دوسری طرف موضوعات کی ندرت، روزمرہ کی زندگیوں کی عکاسی اور ہیئتی تجربوں کی اہمیت کا احساس بھی دکھائی دیتا ہے۔ نیز حلقے والوں نے ادیبوں اور شاعروں کو سیاسی اور اخلاقی آمریت سے نجات دلائی اور ادبا و شعرا کو ان نظریہ سازوں کے غلبے سے بچالیا جو انسانی کمزریوں سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنے مخصوص سیاسی نظریات کا غلام بنانا چاہتے تھے۔ ادبی تنقیدوں میں آزادانہ روش اور بے باکی جیسی روایات کا استحکام بھی حلقہ ارباب ذوق کا مرہون منت ہے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں عالمی سطح پر انسان کو جن نفسیاتی اور جذباتی مسائل سے دوچار ہونا پڑا، ان کی بہترین عکاسی بھی حلقے والوں نے ہی کی ہے جس کا بعد میں جدید شاعروں نے بھی اثر قبول کیا۔ کوئی بھی چیز یک دم سے وجود میں نہیں آجاتی بلکہ اس کے پس منظر میں کئی محرکات ہوتے ہیں۔ لہٰذا نئی شاعری یا دوسرے لفظوں میں جدیدیت کی شاعری نے بھی آب و دانہ اپنی سابقہ تحریکوں اور رجحانوں سے ہی حاصل کیا جن میں حلقہ ارباب ذوق کا رجحان خاص طور سے شامل ہے۔

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادبی دنیا میں بھی ایک چراغ سے دوسرے چراغ جلتے ہیں جس کے نتیجے میں نئے تجربوں کا آنا بعید از قیاس نہیں۔ خاص کر ایسے عہد اور ماحول میں جہاں زندگی پر آشوب ہو ، جہاں انسان زندگی کی مایوس فضا میں اپنی خوشی سے نہیں جی رہا ہو بلکہ جینے کے لیے مجبور کیا گیا ہو، جہاں انسان تنگ دستی و حسرت، یاس و حرماں نصیبی ، پامال حسرتوں اور تنگ حالی کے تانوں بانوں میں الجھ کر رہ گیا ہو۔ ایسے میں ان حالات سے اپنا دامن بچانا بہت مشکل ہے۔ شاعر بھی معاشرے کا ہی ایک فرد ہوتا ہے لہٰذا کوئی شاعر ان دشوار گزار راستوں سے بچ کر نکل نہیں سکتا۔

ادبی دنیا میں اسلوب کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور حلقہ ارباب ذوق کے زیر اثر شاعری کرنے والے جدید شعرا نے موضوع و مواد سے زیادہ توجہ اپنے طرز بیان پر دیا۔ خیالات و جذبات کی ترجمانی کے لیے جو ادبی سانچہ یا اسلوب بہتر ہو سکتا تھا، نئے شاعروں نے اسی کو اپنایا۔ نیا شاعر اپنے داخلی تجربات کے اظہار کے لیے روایتی اسلوب و اظہار کو فرسودہ سمجھتا ہے کیونکہ وہ اس کے کام نہیں آسکتے۔ جدید شاعروں نے اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کے لیے اسلوب و ہیئت کے نت نئے تجربے کیے اور موضوع کو اس کی گہرائیوں تک چھونے کی کوشش کی۔

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادبی دنیا میں بھی ایک چراغ سے دوسرے چراغ جلتے ہیں جس کے نتیجے میں نئے تجربوں کا آنا بعید از قیاس نہیں۔ خاص کر ایسے عہد اور ماحول میں جہاں زندگی پر آشوب ہو، جہاں انسان زندگی کی مایوس فضا میں اپنی خوشی سے نہیں جی رہا ہو بلکہ جینے کے لیے مجبور کیا گیا ہو، جہاں انسان تنگ دستی و حسرت، یاس و حرماں نصیبی ، پامال حسرتوں اور تنگ حالی کے تانوں بانوں میں الجھ کر رہ گیا ہو۔ ایسے میں ان حالات سے اپنا دامن بچانا بہت مشکل ہے۔ شاعر بھی معاشرے کا ہی ایک فرد ہوتا ہے لہٰذا کوئی شاعر ان دشوار گزار راستوں سے بچ کر نکل نہیں سکتا۔ اس لیے جدید شاعر زندگی کا وہی بھیانک رخ پیش کرے گا جو اسے اپنے ارد گرد دکھائی دے گا۔ ایسے حالات کے گواہ حلقہ ارباب ذوق کے شعرا بھی تھے اور جدیدیت کے شعرا بھی۔ اس لیے اگر ان دونوں کی شاعری میں اپنی ذات کا کرب دکھائی دے تو یہ محض اتفاق نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ جدید اردو شاعر اپنے آپ کو ہی تلاش کرنے میں سرگرداں اور پریشان نظر آتا ہے۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ وہ اس کائنات میں کسی طرح بھی اپنی ہستی یا ذات کی شناخت کر لے تاکہ وہ یہ محسوس کر سکے کہ اس کی زندگی میں بھی کچھ معنی ہے۔ لہٰذا جدید شاعری میں اپنے وجود اور اپنے پیکر کو پا لینے کی تڑپ میں شدت ہے۔ اپنی ذات کا پتہ لگانے یا خود کو پانے کی تمنا نے جدید اردو شاعری بالخصوص آزاد نظم میں داخلیت کے رجحان کو فروغ دیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے:

''اردو نظم میں داخلیت کی رو نے تا حال دو واضح لہروں کی صورت اختیار کی ہے اور تیسری لہر بڑی تیزی سے سطح پر آئی ہے۔ پہلی لہر میراجی اور اس کے معاصرین یعنی ن م راشد اور تصدق حسین خالد وغیرہ کی نظموں پر مشتمل ہے۔ دوسری مجید امجد، قیوم نظر، یوسف ظفر، اختر الایمان، مختار صدیقی، ضیا جالندھری، محمد صفدر، عارف عبدالمتین، ظہور نظر، بلراج کومل، منیر نیازی، خلیل الرحمٰن اعظمی، قاضی سلیم، محمد علوی وغیرہ کی نظموں سے عبارت ہے اور آخری لہر ابھی طوفان اور تخریب کے مراحل سے گزر رہی ہے۔''

(وزیر آغا: اردو شاعری کا مزاج، ص 445)

عام طور پر تین قسم کے تجربات شاعری میں کیے جاتے ہیں۔ معنوی تجربات، ہیئت کے تجربات اور لسانی تجربات۔ جدید شاعری میں بھی ان تینوں قسم کے تجربات استعمال کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی دیگر تجربات کی مثالیں جدید شاعری میں ملتی ہیں کیونکہ نئی نسل کے شاعروں نے کچھ نیا کر دکھانے کی آرزو میں مختلف امکانات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ ضروری نہیں کہ ہر تجربہ کامیاب بھی ہو لیکن ان تجربات نے شاعری میں اظہار کے پیرایوں کو وسعت ضرور بخشی ہے۔ آزادی کے بعد اردو کی چند مقبول عام روایتی اصناف کو نئے انداز میں برتنے کے تجربے بھی کیے گئے۔ ان کے علاوہ غیر ملکی زبانوں کے شعری ادب سے مقبول اصناف کی ہیئتوں کو اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنانے کے لیے بھی کئی تجربات کیے گئے جن کے نتیجے میں جدید اردو شاعری میں ترائیلے، اسٹینزا فارم اور ہائیکو جیسی اصناف اور ہیئتوں کو رواج ملا۔

حلقہ ارباب ذوق کے شعرا کے یہاں زندگی اپنے پورے تنوع اور رنگا رنگی کے ساتھ نمایاں ہے۔ حلقے کے شاعروں نے ذاتی اور انفرادی طور پر زندگی کو جس طرح محسوس کیا، اسی طرح اس کا اظہار بھی کیا۔ انھوں نے موضوعات کے ضمن میں حد بندیاں قائم نہیں کیں اور نہ ہی ان کا اصرار کسی خاص ہیئت یا مخصوص ہیئتی تجربات پر تھا۔ ان کے تجربات میں موضوعاتی تنوع، اسالیب کی رنگا رنگی، تراکیب کی جدت اور الفاظ کے انتخاب میں انوکھا پن پایا جاتا ہے۔ حلقے کے زیر اثر جدید شعرا نے بعض ایسے تجربات بھی کیے جن میں ذاتی علامات کا استعمال کیا گیا جس کی وجہ سے ان کے کلام گنجلک اور پیچیدگی کے شکار بھی ہوئے۔ تاہم اس کے باوجود یہ شعرا نئی فنی جمالیات کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔

حلقہ ارباب ذوق کے زیر اثر جدید شعرا نے فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی سے استفادہ کرتے ہوئے شعور کے ساتھ تحت الشعور اور لاشعور کو اپنے تجربے کا موضوع بنایا اور فن کے اسالیب کو دبی ہوئی جنسیت کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا۔ جدید شاعروں نے پہلی بار لاشعور کی پر اسرار اور دھندلی گہرائیوں میں غوطہ زنی کی اور انسان کی پر اسرار امنگوں کو موضوع سخن بنایا۔ لاشعوری جذبات کو بالترتیب اور تفصیل سے بیان کرنے کے لیے ردیف و قافیہ اور وزن کی پابندیوں کے ساتھ ضبط تحریر میں لانا مشکل تھا، اس لیے اظہار و بیان کے لیے نئی تکنیک و ہیئت کا استعمال کیا جانے لگا۔ زینت اللہ جاوید کے مطابق:

''ذہن کی پیچیدہ رو اور خیال کے موڑ کو بیان کرنے کے لیے موجودہ الفاظ جب ان کا ساتھ نہ دے سکے تو انھوں نے اپنے طور پر زبان میں تبدیلیاں کیں اور داخلی جذبات و پیچیدہ خیالات کے اظہار کے لیے روایتی اصناف سخن، بحور و قافیے کی قید سے آزادی حاصل کر لی۔ احساس تجربہ اور شعور کو سادہ بیانیہ انداز کے بجائے مبہم اور ایمائی زبان میں پیش کیا جانے لگا اور اس طرح جو کلام سامنے آیا وہ اپنی ہیئت میں براہ راست اظہار یا گفتگو کے بجائے تصویروں، استعاروں اور اشاروں کا ایک سلسلہ نظر آیا اور بعض شعرا نے شدید حد تک ذاتی علامتوں کا استعمال کیا جس کا عام ذہن متحمل نہ ہو سکا اور بعید از فہم علامتوں نے شاعری میں اغلاق پیدا کر دیا۔''

(زینت اللہ جاوید: نئی اردو شاعری (ایک تجزیاتی مطالعہ)، ص، 61-60)

حلقہ ارباب ذوق نے جن رجحانات کو فروغ دینے کی کوشش کی تھی، ان میں نفسیاتی اور ہیئتی رجحانات سر فہرست ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے اگر اپنا سارا زور موضوع پر صرف کیا تھا تو حلقے سے منسلک شاعروں نے ہیئت پر اور اس رجحان کو جدیدیت کے شاعروں نے بھی خوب اپنایا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض شعرا ہیئت کے تجربوں کے سلسلے میں فیشن اور فارمولے کا بھی شکار ہوئے۔ جیسا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا خیال ہے:

''انھوں نے نئی ہیئت کی جستجو کسی نئے کرب یا نئے جذبے اور تجربے کے اظہار کے لیے نہیں کی تھی۔ بلکہ محض نئے بننے کے شوق میں۔ اس لیے ان میں سے بیشتر کی نظمیں اسلوبی چٹکلوں سے زیادہ آگے نہ جا سکیں۔''

(خلیل الرحمٰن اعظمی: نئی نظم کا سفر، ص28)

حلقہ ارباب ذوق سے متعلق شعرا کا ایک نمایاں کارنامہ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ ان کی کوششوں سے نظم معریٰ اور آزاد نظم کو اعتبار و استحکام حاصل ہوا اور جدید نظم کے نام سے یہ ہیئتیں اردو شعری روایت میں ہمیشہ کے لیے قائم ہو گئیں اور پھر بعد کے زمانے میں حلقے کی مقبولیت کا دائرہ وسیع ہونے لگا جس کے زیر اثر دیکھتے ہی دیکھتے نئے شعرا کا ایک گروپ منظر عام پر آ گیا۔ اسی زمانے میں جدیدیت کا باقاعدہ آغاز ہوا اور جدید نظم کی شعریات پر کھل کر گفتگو ہونے لگی۔ چنانچہ اردو شاعری میں 1960 کے بعد جدیدیت کا رجحان عام ہوا اور جدیدیت سے متاثر منظر عام پر آنے والے نئے شعرا نے اپنے جن پیش رو شاعروں سے اخذ و استفادہ کیا، وہ حلقے سے منسلک شعرا تھے۔

اس سلسلے میں گوپی چند نارنگ کا خیال ہے:

''... جس طرح پابند نظم کو فنی معیار و اعتبار اقبال کے ذریعے عطا ہوا، اسی طرح آزاد اور معریٰ نظم کو فنی استحکام حلقہ ارباب ذوق کے شعرا بالخصوص راشد اور میراجی کے توسط سے ہوا۔''

(آزادی کے بعد اردو شاعری، مرتبہ شہزاد انجم، ص، 53)

اردو میں میراجی، ن م راشد اور تصدق حسین کی پیروی میں جو آزاد نظمیں لکھی گئی ہیں، ان میں فنکار کے شعور اور لاشعور کی زیادہ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اسی لیے بیشتر آزاد نظموں میں اظہار، اشاروں اور علامتوں کا تابع ہوتا ہے۔ اسی طرح جدیدیت کے بعض شعرا نے آزاد و معریٰ نظم میں تلازمات کو بڑی اہمیت دی اور عام قارئین سے بے نیاز ہو کر ذاتی توہمات کو دور از کار علامتوں سے ظاہر کیا جس کی وجہ سے قارئین کے لیے شاعر کے ذہن تک رسائی ناممکن ہو گئی اور بہت سی نظموں میں انھیں بے ربطی اور پراگندگی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ انفرادی نفسیات کا اظہار جس قسم کی علامتوں کے ذریعے کیا گیا ان سے قاری کے ذہن کو کسی قسم کی تحریک نہ ملی اور ایسی تخلیقات ان کے لیے مبہم ہو کر رہ گئیں۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''جیسے ہی علامت اپنے تصور سے جدا ہو کر کسی فرد کے آزاد تلازمہ خیال کا حصہ بن جاتی ہے، اس میں فریق ثانی کو شرکت کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں اور جب علامت یا تجربے میں دوسرے کی شرکت ناممکن ہو تو اسے علامت کہنے کے بجائے مجذوب کی بڑ کہنا مناسب ہے۔''

(ڈاکٹر وزیر آغا: اردو شاعری کا مزاج، ص 90-89)

بہر حال جدید اردو شاعری کو سمت و رفتار اور رنگ و آہنگ دینے میں حلقہ ارباب ذوق نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حلقے کے زیر سایہ پروان چڑھ کر جدیدیت اپنے لیے کوئی مقام و استحکام قائم کرنے میں کامیاب ہو سکی۔ وہ شعرا جو شاعری میں انفرادی جذبات و خیالات کے اظہار کے حامی تھے، حلقے کے زیر اثر آتے گئے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں رجحانات کی حسب توفیق مکمل یا غیر مکمل ترجمانی کرنے لگے جن کا حلقہ ارباب ذوق حامی تھا۔ جدید شاعروں نے جوش و جذبی کے بجائے راشد، میراجی، یوسف ظفر، قیوم نظر، مختار صدیقی، ضیا جالندھری و حلقے کے دیگر شاعروں کی شعری روایت سے اخذ و استفادہ کیا۔ حلقے کے شاعروں کے مزاج کے مطابق جدیدیت کے شعرا بھی بھیڑ میں اپنی ذات کی شناخت قائم رکھنے پر بضد رہے۔ جدید شاعروں نے فکر کے غلبے پر قدغن لگا کر فکر و فن میں توازن پیدا کر کے ایک طرح سے حلقے کی روایت کو آگے بڑھانے کا کام کیا۔ انھوں نے فرد کی نفسیاتی الجھنوں کو بھی شعر و ادب کا موضوع بنایا اور اس کے ذریعے ذات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش بھی کی۔ میراجی اور راشد نے لفظیات کی سطح پر جو اجتہاد کیے تھے، اسے جدید شاعری میں مزید فروغ ملا۔ آزاد نظم اور نظم معریٰ کو مقبول و معروف بنانے میں بھی جدیدیت پر حلقہ کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان سارے نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید شعرا ترقی پسندی کے برعکس حلقے ارباب ذوق کی روایت و اثرات سے فیض یاب ہوئے۔ در اصل 'حلقہ ارباب ذوق' ترقی پسندی کے خلاف ایک رجحان تھا جو جدیدیت کا پلیٹ فارم بنا۔

عام طور پر تین قسم کے تجربات شاعری میں کیے جاتے ہیں۔ معنوی تجربات، ہیئت کے تجربات اور لسانی تجربات۔ جدید شاعری میں بھی ان تینوں قسم کے تجربات استعمال کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی دیگر تجربات کی مثالیں جدید شاعری میں ملتی ہیں کیونکہ نئی نسل کے شاعروں نے کچھ نیا کر دکھانے کی آرزو میں مختلف امکانات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ ضروری نہیں کہ ہر تجربہ کامیاب بھی ہو لیکن ان تجربات نے شاعری میں اظہار کے پیرایوں کو وسعت ضرور بخشی ہے۔

□

Dr. Abdur Rahman, 835, Herikesh Nagar, Tilpat, Fareedabad - 121003

مولانا عبدالماجد دریابادی

عبدالستار دلوی

غالباً 1951 کا ذکر ہے، میں احمد سیلر ہائی اسکول بمبئی میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس زمانے میں یہ اسکول علمی و عملی دنیا میں طلبا کی تربیت میں پیش پیش تھا۔ تقریری و تحریری مقابلوں کو اس اسکول میں نصابی حیثیت حاصل تھی اور اس ساری جدوجہد میں سب سے پیش پیش استاذ محمد بشیر صاحب تھے۔ طلبا میں ذوق کتب بینی پیدا کرنا بھی انھیں کا حصہ تھا۔ شام میں جب لائبریری سے کتابیں لینے کا وقت ہوتا تو بشیر صاحب خود طلبا کے لیے ان کے ذوق و رجحان کے مطابق کتابیں دیتے۔ تحریری و تقریری مقابلوں میں انعام پانے والوں کو بھی تحفے کتابوں ہی کی صورت میں انعام دیے جاتے۔ اسی زمانے میں میرے ایک ماموں زاد بھائی جو میٹریکولیشن میں تھے تحریری مقابلے میں اول آئے تو انھیں بطور انعام جو کتاب پیش کی گئی وہ 'مقالات ماجد' تھی۔ مولانا سے میرا اور چند اور دوستوں کا تعارف اسی تقریری مقابلہ اور اسی انعام سے ہوا۔ دو سال بعد پھر جب یہ مقابلے ہوئے تو تقریری مقابلے میں مجھے اول انعام ملا اور جب انعام ملنے والا تھا تو ہم نے خواہش ظاہر کی کہ نیاز فتح پوری کی 'من و یزداں' ہمیں بطور انعام دی جائے جس کے لیے بشیر صاحب راضی نہ ہوئے۔ مگر جب میرا انعام کے سلسلے میں من و یزداں کا اصرار دیکھا تو اس کے لیے حامی بھری اور ساتھ مولانا کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا اور مضامین ماجد کا خصوصی ذکر کرتے ہوئے اس کے پڑھنے کی ہدایت کی۔ خطبات مدرس پڑھوائی۔ ابوالاعلیٰ مودودی کے رسائل سے روشناس کرایا اور غلام جیلانی برق کی ''دو قرآن' اور 'دو اسلام' سے متعارف کرایا۔ مقصد یہ تھا کہ ہم پر 'من و یزداں' کا جادو اثر نہ کر جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ نیاز کا جادو نگار قلم نئے ذہنوں کو متاثر کرنے لگا تھا۔ اس زمانے میں واحد ذریعہ بھی یہی تھا کہ مولانا ماجد، سید سلیمان ندوی اور ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں بھی پڑھائی جاتیں۔ مولانا عبدالماجد کی خاص طور سے کہ وہ الحاد کے کوچے کے دیرینہ شناسا تھے اور اس کوچے میں بھٹکنے کے بعد اسلام کی صراط مستقیم سے روشناس ہوئے تھے۔

مولانا ماجد کی علمی زندگی کا آغاز ان کے زمانۂ طالب علمی ہی میں ہوگیا تھا۔ ان کی کتابیں 'غذائے انسانی' اور مختصر رسالے 'محمود غزنوی' مولانا کے زمانۂ طالب علمی ہی کی یادگار ہیں۔ مولانا لکھنؤ کے معروف کنگ کالج کے طالب علموں میں سے ہیں، تاہم انھوں نے اپنے علمی مشاغل کے لیے اپنے آپ کو کالج کی چہار دیواری تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اردو کے علمی و ادبی حلقوں سے اپنے آپ کو وابستہ کرکے اردو کے بزرگ ادیبوں اور عالموں سے فیضان نظر پایا۔ ان عالموں اور ادیبوں میں سرفہرست شبلی ہیں جنھوں نے اردو کی علمی دنیا میں ایک مکتبۂ خیال کو پروان چڑھایا اور اس کی رہنمائی کی۔ شبلی کے فیضِ صحبت کے بعد شبلی کے جانشینوں مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی جیسے عالموں کی رفاقت نے علمی دینی اور ادبی صلاحیتوں کو مولانا ماجد کی فطری صلاحیتوں پر جلا کی۔ مولانا عبدالحلیم شرر اور مرزا رسوا کے چشمۂ ادب سے بھی مولانا خاطر خواہ سیراب ہوئے اور اس طرح ان کی طبیعت میں مولوی اور مسٹر کی متنوع خصوصیات کے اجتماع سے ایک ایسی شخصیت ابھری جو جلال و جمال کا خوبصورت مرقع، دین و دنیا کا حسین گلدستہ اور شعر و ادب کا پیکر جمیل ہے۔ مولانا کی ذات بذات خود ایک مکتبۂ خیال بن گئی ہے۔ جس نے حسب موقع نوجوان نسل کے ذہن و دل پر اپنے اثرات ثبت کرکے صحت مند انداز فکر کی طرف ان کی رہنمائی کی اور کفر و الحاد کی راہوں میں بھٹکنے والوں کو صراط مستقیم کی راہ دکھائی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی علمی و ادبی خدمات متنوع ہیں۔ ان خدمات کو ذیل کی شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

ادبی:

(1) مثنوی بحرالمحبت ترتیب و تحشیہ، (2) زود پشیماں (ڈراما) (3) مضامین ماجد (4) حکیم الامت (نقوش و تاثرات) سوانح (5) محمد علی: ذاتی ڈائری حصہ اول (6) مقالات ماجد حصہ اول (7) مقالات ماجد حصہ دوم (8) خطوط مشاہیر (9) اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں (10) سفر حجاز

مذہبی:

(1) تصوف اسلام (2) تحفۂ خسروی (3) ترجمہ و شرح مناجاتِ مقبول (4) تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام (5) تمدن اسلام کی کہانی خود اس کی زبانی (6) مردوں کی مسیحائی (7) قصص و مسائل (8) تفسیرِ ماجدی جلد اول و جلد دوم (9) ترجمہ و تفسیر قرآن مجید (بزبان انگریزی) پارہ اول و دوم (10) فیہ مافیہ

فلسفہ و نفسیات:

(1) فلسفۂ حیات (2) فلسفۂ اجتماع (3) فلسفہ اور اس کی تعلیم (4) منطق (5) فلسفیانہ مضامین (6) مبادیِ فلسفہ حصہ اول و دوم (7) مکالمات برکلے (8) پیامِ امن (9) ہم آپ

تاریخ:

(1) تاریخ اخلاقِ یورپ جلد اول و جلد دوم (ترجمہ)
(2) تاریخ تمدن جلد اول و جلد دوم (ترجمہ)

متفرق:

(1) خطوط مشاہیر حصہ اول (2) فرائض والدین (3) غذائے انسانی

جیسا کہ ماقبل السطور میں بیان ہو چکا ہے۔ مولانا کی علمی زندگی ادب کے مختلف شعبوں پر محیط ہے۔ ان شعبوں میں بھی غالباً مولانا پہلے اردو زبان کے عالم اور ادیب ہیں جنھوں نے فلسفہ اور نفسیات کو اپنا موضوع بنا کر اس علمی دنیا کو اردو والوں سے روشناس کیا۔ اس موضوع پر مولانا ماجد کی متعدد کتابوں سے اردو میں فلسفیانہ موضوع کا جو باب کھلا اس سے مجموعی حیثیت سے اردو زبان کے موضوعات میں بھی تنوع پیدا ہوا۔ یہ زبان شاعری اور افسانہ کی دنیا کے باہر علمی دنیا میں آئی اور اس کی تنگ دامانی کا شکوہ کرنے والوں کے لیے جواب مل گیا۔ گو اس سے قبل علمی و فلسفیانہ موضوعات پر چیدہ چیدہ مضامین ضرور مل جاتے ہیں لیکن اس موضوع کو خصوصیت کے ساتھ اردو میں رواج دینے کا سہرا مولانا ہی کے سر ہے۔ یہ مولانا کا محبوب ترین موضوع ہے۔ جسے بعد میں ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ نے جرمن ترجموں سے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ مذہبی ادب میں ترجمہ و شرح مناجاتِ مقبول سے لے کر تفسیر ماجدی تک اسلام اور متعلقاتِ اسلام کے متعلق متعدد موضوعات پر قلم اٹھایا اور اسلام کی بزرگی و برتری کو اپنے مخصوص تجزیاتی انداز میں پیش کیا اور اسلامی تمدن کی کہانی پیش کرتے ہوئے بیسویں صدی کے نام اس کے پیغام کو لائحۂ عمل کے طور پر علمی وقار اور سنجیدگی سے پیش کیا۔ اگرچہ تمدن اور تاریخ کے مختلف الوان و اقسام کے واقعات یا غیر واقعاتی بیان زبان و ادب کا حصہ ہے اور اس لحاظ سے مختلف علوم و فنون، سماجی و ثقافتی اقدار کا بیان۔ طبیعیات اور جغرافیائی تلاش و تحقیق، فلسفۂ مابعد الطبیعیاتی مسائل پر غور و فکر، معاشیات اور تاریخ کے تجزیے اور تخلیق شعر و ادب کا حصہ ہیں اور کسی بھی زبان کی ترقی اور وسعت کا اندازہ ان تمام کے مجموعی انداز ے سے ہی لگایا جاسکتا

ہے۔ تاہم اصطلاحی معنوں میں اگر ادب کے معنی ومفہوم کو محدود بھی کیا جائے تو خود اس میدان میں بھی مولانا نے وہ قیمتی جواہر پارے چھوڑ دیے ہیں کہ وہ خود ان کی حیات کے ضامن بن سکتے ہیں۔ ادب کے ان محدود اصطلاحی معنوں میں مولانا کی درج ذیل کتابیں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔

(1) انشائے ماجد (حصہ اوّل ودوم)
(2) مثنوی بحرالمحبت ترتیب وتحشیہ
(3) محمد علی: ذاتی ڈائری حصہ اول (4) زود پشیماں (ڈراما)
(5) حکیم الامت (نقوش وتاثرات) سوانح (6) سفرِ حجاز

اول الذکر تین کتابیں ادبی تحقیق وتنقید سے متعلق ہیں۔ پہلی کتاب انشائے ماجد مقالات، نشریے، مقدمات اور تبصروں کا مجموعہ ہے، ثانی الذکر کتاب اردو کے سب سے بڑے طنز ومزاح نگار شاعر اکبرالہ آبادی کے حالاتِ زندگی اور ان کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ ہے اور تیسری کتاب مصحفی کی مثنوی بحرالمحبت ہے جسے مولانا نے پہلی بار مرتب کرکے ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا۔

مولانا کے تنقیدی مضامین شخصیتوں کے تعارف، کتابوں کے تبصرے اور الفاظ کی سرگذشت پر محیط ہیں۔ جہاں تک تبصروں کا تعلق ہے 'صدق' اور 'سچ' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے جدید وقدیم ادبی روپ کی جو بھی کتابیں آئیں ان پر تبصرہ ضروری تھا۔ اسی لحاظ سے قاری کے لیے مولانا جدید وقدیم رشحاتِ قلم کے شناسا معلوم ہوں گے۔ تبصرہ ادبی تنقید کا ایک پہلو ہے۔ چونکہ تبصرہ کے لیے اختصار ضروری ہے، اس میں تجزیہ کے لیے بہت کم گنجائش رہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام طور سے تبصرہ تاثراتی ہوجاتا ہے۔ مولانا کی تنقید بھی تبصرہ کی تنقید ہے اور اسی لحاظ سے تاثراتی ہے، اس کا انحصار ذاتی پسند وناپسند پر زیادہ ہے۔ اس میں شاعر یا ادیب کے ذہن تک پہنچنے کی کوشش بہت کم ہے، شاعر یا ادیب کو اپنے مخصوص ماحول میں رکھ کر اس کی افتاد کے پیش نظر اسے سمجھنے کی کوشش سے تجزیاتی تنقید وجود میں آتی ہے۔ مولانا کی تنقید کا یہ پہلو جیسا کہ عرض کرچکا ہوں کمزور ہے، دراصل بات یہ ہے مولانا تنقید میں پرانے مکتب خیال کے عالم ہیں۔ جس کا بیشتر وصف تاثر قائم کرنے، زبان وبیان کی خوبیوں یا خامیوں پر زور دینا ہوتا ہے۔

مولانا کی ادبی دلچسپیاں متنوع قسم کی ہیں۔ وہ لکیر کے فقیر نہیں۔ انھوں نے ہر موضوع، ہر عنوان، ہر مزاج، ہر مکتب خیال سے پوری پوری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ نثر میں مرزا رسوا کی قصہ گوئی سے محمد علی کی نثر تک اور نظم میں امیر خسرو سے لے کر نظیر اکبرآبادی۔ غالب، اکبر سبھی مولانا کی گرفت میں ہیں۔ تاہم مولانا کی نگارشات دیکھنے سے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ دو شخصیتوں سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ یا یوں کہیے کہ دو شخصیتیں ان کی محبوب ترین شخصیتیں ہیں۔ یہ دو شخصیتیں اکبر اور محمد علی کی شخصیتیں ہیں۔

اکبر اردو کے قومی شاعروں میں ممتاز مقام پر فائز ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے طنز ومزاح کے پیرائے میں چٹکیاں لیتے ہوئے ایسی باتیں کی ہیں کہ جن پر اردو شاعری جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔ اکبر کا ہر شعر موضوع اور ابلاغ کے اعتبار سے مسلسل نظموں پر بھاری ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مغربیت کے بیجا طلسم سے نجات دلانے کی کوشش کی، وہ سرسید کے مخالفین میں سے تھے۔

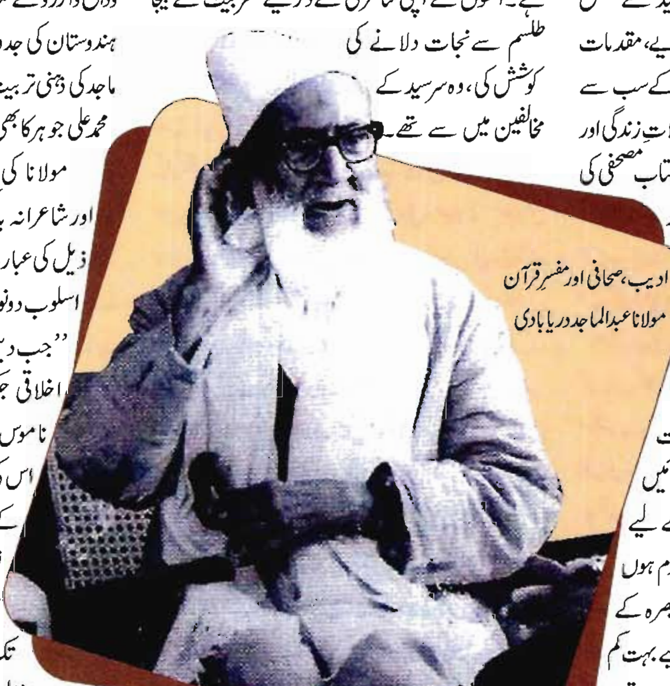
ادیب، صحافی اور مفسر قرآن
مولانا عبدالماجد دریابادی

وہ سرسید اور ان کے تعلیمی نظریات اور مغربی طرزِ فکر سے مطمئن نہیں تھے، اکبر کی شاعری کا بنیادی نکتہ سرسید کی مغربیت کا ردعمل ہے، گو سرسید کی مغربیت کی تعلیم اکبر کے نشتروں سے ختم تو نہ ہوسکی البتہ جدید ذہنوں میں اس سے توازن پیدا کرنے میں مدد ضرور ملی۔ اکبر کی زندگی اور شاعری میں مشرقیت اور حب قومی کا یہی عنصر مولانا ماجد کو سب سے زیادہ بھایا، حتیٰ کہ وہ اکبر کے گرویدہ ہوگئے۔ مقالات ماجد میں اکبر کے تعلق سے کئی مضامین اور 'اکبر نامہ' اس تعلق خاطر کی یادگار ہیں جو اکبر پر اردو میں بنیادی مواد کا کام دیتے ہیں۔ مولانا کے مزاج اور اکبر کی طبیعت میں ہم آہنگی ہی اس بات کا سبب بنی کہ وہ فکری اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب رہتے اور اسی فکری وطبعی میلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر نے مولانا کہ زندگی میں وہ مقام حاصل کرلیا کہ ان کی ذات مولانا کے قلم سے تصنیف کا سبب بن گئی۔ اکبر نے مولانا ماجد کی ذہنی تربیت بھی کی ہے اور انھیں الحاد کے کوچے سے باہر نکالا ہے۔

اکبر ہی کی طرح لیکن اکبر سے کہیں زیادہ مولانا کی ذات محمد علی سے متاثر ہے۔ وہ محمد علی سے صرف متاثر نہیں بلکہ مرعوب ہیں۔ محمد علی کی شخصیت ادیب، شاعر اور جنگِ آزادی کے جاں باز سپاہی کی حیثیت سے اردو ادب اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی بہت ہی مرعوب کن، باوقار اور مرنجاں مرنج شخصیت ہے۔ وہ ایک خوش فکر شاعر تھے جو سوز وساز ودرد وداغ وآرزو کے متلاشی تھے اور جن کی انگریزی اور اردو صحافت ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی ایک دستاویز ہے۔ مولانا ماجد کی ذہنی تربیت جس طرح اکبر نے کی اسی طرح مولانا محمد علی جوہر کا بھی اس میں حصہ ہے اور شبلی کا بھی۔

مولانا کی نثر میں اسلوب کی گرمی، طنز کا تیکھا پن اور شاعرانہ بانکپن کی بھی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں ذیل کی عبارت ان کے شاعرانہ پیرایۂ بیان اور سادہ اسلوب دونوں کا امتزاج پیش کرتی ہے:

''جب دین ہی سرے سے غائب ہوگیا تو اب اس اخلاقی جکڑ بند سے آخر حاصل کیا؟ پردہ تو بقائے ناموس کے لیے ہے۔ جب ناموس ہی نہیں تو اس کی بقا کیسی؟ کھانا پینا زندہ جسم کی ضرورت کے لیے ہے، لیکن زندگی ہی رخصت ہوچکی تو مردہ کو کوئی نہیں کھلاتا پلاتا۔ صندوق میں قفل اس وقت پڑے رہتے ہیں جب تک اس میں قیمتی مال محفوظ ہے لیکن جب وہ خالی ہوگیا تو اب اس کی حفاظت خود ایک دردِ سر ہے۔ پھولوں کی قدر جب ہی تک ہے جب تک وہ تازہ وشاداب ہیں۔ باسی سوکھے مرجھائے پھولوں کو گلے کا ہار بنانے کو کوئی کیوں پسند کرے گا؟''

مولانا ماجد کی شخصیت علم، ادب، تاریخ ہر لحاظ سے ایک بلند وبالا شخصیت تھی اور ان کے رشحات قلم سے نکلی ہوئی تحریریں اردو زبان وادب کی تاریخ کا بیش قیمت سرمایہ ہیں اور ان کی 'آپ بیتی' اردو کی خوش نوشت، سوانح عمریوں میں اپنی جزئیات، خلوص اور سچائیوں کا مرقع ہے اور اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو بے باک انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے اسلوب میں بلا کی جاذبیت ہے، جس کا شمار اردو کی چند بہترین خودنوشت سوانح عمریوں میں ہونا چاہیے۔

□

Prof. Anbus Sattar Dalvi, Director,
Anjuman-e-Islam Urdu Research Institute,
Mumbai (MS)

ادارہ

نواب مرزا شوق لکھنوی

مرزا شوق لکھنوی دبستان لکھنؤ کے نامور شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن جس فن نے انھیں بقاودوام عطا کیا وہ مثنوی ہے۔ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مرزا شوق کا عہد، وہ ہے جب انشا، جرأت، رنگین، آتش، ناسخ اور مصحفی وغیرہ آسمان شاعری پر چمک رہے تھے۔ ان حالات میں دبستان لکھنؤ کی شاعری کے افق پر شوق کا جلوہ گر ہونا اور مستقل جگہ بنانا یقیناً قابل تعریف پہلو ہے۔ اس عہد میں زبان و بیان کے بڑے بڑے مشائخ موجود تھے۔

مرزا شوق لکھنوی کی پیدائش عطاء اللہ پالوی کے مطابق 1783 میں لکھنؤ میں ہوئی۔ حکیم تصدق حسین خاں نام تھا۔ نواب مرزا عرفیت اور شوق تخلص تھا۔ حکیم نواب مرزا کے نام سے مشہور تھے۔ شوق کے والد کا نام آغا علی خاں تھا۔ ان کا سلسلہ نسب مغل تھا۔ بقول پروفیسر وہاب اشرفی طبابت شوق کا پیشہ اور مسلک شیعہ تھا۔ یہ امر ان کے کلام سے بھی واضح ہے۔ خاندانی روایت تھی۔ اس عہد کی روایت کے مطابق شوق نے ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ اپنے عہد کے مشہور اساتذہ کے فیض صحبت میں رہنے کا شرف حاصل تھا جس کی بنا پر مختلف علوم میں عبور حاصل کی۔ خاندانی پیشہ طب اور حکمت پر بھی انھیں مہارت حاصل تھی، شاہی طبیب تھے۔ شوق کے نواسے حسن لکھنوی یہ بتاتے ہیں کہ انھیں واجد علی شاہ کی سرکار سے ہر ماہ پانچ سو روپیہ بطور تنخواہ ملتا تھا۔

مرزا شوق نے اپنی شاعری کے لیے آتش کی شاگردی قبول کی۔ انھوں نے غزل میں بھی خامہ فرسائی کی لیکن ابھی تک مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کوئی دیوان نہیں ملا ہے۔ شوق نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا تاہم انھیں غزل سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ شوق کے ایک محقق عطاء اللہ پالوی نے مختلف تذکروں سے اکٹھا کر کے غزلوں کے کچھ اشعار اپنی کتاب 'تذکرۂ شوق' میں شامل کیے ہیں۔ اس طرح شوق کا سرمایہ غزل صرف 61 اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں میں زبان و بیان کی خوبصورتی ہے، محاوروں کا برجستہ استعمال ملتا ہے۔ اندازِ بیان شوخی لیے ہوئے ہے لیکن سلاست کا فقدان نہیں ملتا:

جلوے نہیں دیکھے جو تمھارے کئی دن سے
اندھیر ہے نزدیک ہمارے کئی دن سے
ہم جان گئے آنکھ ملاؤ نہ ملاؤ
بگڑے ہوئے تیور ہیں تمھارے کئی دن سے

شوق کے غزلیہ اشعار اپنے عہد کے مزاج سخن کی ترجمانی کرتے ہیں، جو لکھنوی شاعری کی زیب و زینت تھی، وہی معاملہ بندی، عشوہ و ناز، محبوب سے چھیڑ چھاڑ، شرارت و شوخی، ان کے دریافت شدہ اشعار کی خصوصیت ہیں۔

نواب مرزا شوق کی مثنویوں کی تعداد کے بارے میں مختلف آرا ملتی ہیں، بلند پایہ محقق رشید حسن خاں نے قدیم و جدید تحقیق کو سامنے رکھ کر جو تصدیق کی ہے اس کے مطابق شوق کی تین ہی مثنویاں ہیں 'فریب عشق'، 'بہار عشق' اور 'زہر عشق'۔ شوق کی پہلی مثنوی 'فریب عشق' 1846 میں تصنیف ہوئی۔ جو چار سو اٹھائیس اشعار پر مشتمل ہیں۔ فریب عشق واقعاتی اور ادبی دونوں لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس مثنوی میں شوق نے اپنے عہد کی بیگمات کی نقل و حرکت کی عکاسی کی ہے جس کے پس پردہ بیگمات کے اخلاق سوز واقعات کو نظم کیا ہے۔ شوق کی دوسری مثنوی بہار عشق 1847 میں منظر عام پر آئی۔ اس مثنوی میں آٹھ سو بیالیس اشعار ہیں۔ شوق کی یہ مثنوی بھی واجد علی شاہ کی تہذیب و معاشرت کی خوبصورت تصویر پیش کرتی ہے۔ عطاء اللہ پالوی اس مثنوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اردو زبان میں اس رنگ کی یہ واحد مثنوی ہے جو نہ صرف زبان و بیان کے لحاظ سے بلکہ کئی حیثیتوں سے بھی اردو زبان کی عجیب و غریب مثنوی ہے۔''

مشہور زمانہ مثنوی 'زہر عشق' مرزا شوق لکھنوی کی اہم تخلیق ہے۔ اس کی تاریخ تصنیف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ شاہ عبدالسلام کا خیال ہے کہ یہ مثنوی 1860 اور 1862 کے درمیان مکمل ہوئی۔ تاہم 1861 تاریخ تصنیف کو مستند مانا جاتا ہے۔ رشید حسن خاں بھی اسی سے متفق نظر آتے ہیں۔ یہ شوق کی شاہکار مثنوی ہے۔ اس مثنوی کے تعلق سے ان پر بعض لوگوں نے دعوے کیے کہ یہ شاعر کی سرگزشت ہے اور شوق خود ہیرو تھے۔ یہ خیال غلط ہے کہ شوق نے خود اپنے کردار کو مثنوی میں بیان کیا ہے۔ دراصل 'زہر عشق' لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت کی تصویر ہے۔ مثنوی زہر عشق کا موضوع عشق و عاشقی پر محیط ہے۔ پوری روداد اس زاویے سے بیان کی گئی ہے کہ کہیں زبان و بیان میں رکاکت اور ابتذال نہیں ہے بلکہ بیگماتی زبان خاص کر بعض عورتوں کے محاورے، نہایت صحت اور صفائی کے ساتھ برتے گئے ہیں۔ یہی شوق کا کمال شاعری ہے۔

مرزا شوق نے لکھنؤ میں 30 جون 1871 کو اٹھاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ مرزا لکھنؤ میں اُسی جگہ مدفون ہیں جہاں اردو شاعری کے آفتاب و ماہتاب یعنی میر تقی میر، انشا، مصحفی وغیرہ دفن کیے گئے تھے۔

انتخاب کلام نواب مرزا شوق

مثنوی 'زہر عشق'

(اقتباس)

دنیا کی بے ثباتی اور آخری وصیت

(محبوبہ کا آخری بیان)

اونچے اونچے مکان تھے جن کے
کل جہاں پر شگوفہ و گُل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے وہ
آج خود ہیں، نہ ہے مکاں باقی
غیرت حور مہ جبیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم
کوئی لیتا بھی اب نہیں ہے نام
اب نہ رُستم، نہ سام باقی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
تھے جو خود سر جہان میں مشہور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے
تھے جو مشہور قیصر و فغفور
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر
رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتا
بوئے الفت تمام پھیلی ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان
موت سے کس کو رستگاری ہے
زندگی بے ثبات ہے اس میں
ہم بھی گر جان دے دیں کھا کر سم
دل کو ہم جولیوں میں بہلانا
جا کے رہنا نہ اس مکان سے دور
روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی
رو کے رہنا بہت طبیعت کو

آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے
آج اُس جا ہے آشیانۂ بوم
صاحبِ نوبت و فشاں تھے جو
نام کو بھی نہیں نشاں باقی
ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم
کون سی گور میں گیا بہرام
اک فقط نام ہی نام باقی ہے
آج ہیں فاتحے کو وہ محتاج
خاک میں مل گیا سب ان کا غرور
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
اُستخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
باقی اُن کا نہیں نشانِ قبور
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
کھا گئے ان کو آسمان و زمیں
یہی دنیا کا کارخانہ ہے
نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا
باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
پڑھتے ہیں کل من علیہا فان
آج وہ کل ہماری باری ہے
موت عینِ حیات ہے اس میں
تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
یا مری قبر پر چلے آنا
ہم جو مر جائیں تیری جان سے دور
ڈھونڈھنے کس طرف کو جائے گی
یاد رکھنا مری وصیت کو

ضبط کرنا اگر ملال رہے
میرے مرنے کی جب خبر پانا
جمع ہولیں سب اقربا جس دم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم
ہوگئے تم اگرچہ سودائی
لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے
طعنہ زن ہوں گے سب غریب و امیر
سامنا ہو ہزار آفت کا
جب جنازہ مرا عزیز اٹھائیں
میری منت ہے دھیان رکھیے گا
تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مرا
اشک آنکھوں سے مت بہایئے گا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے
رنگ دل کے بدل نہ جائیں کہیں
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے
ہوتے آفت کے ہیں یہ پرکالے
ہو بیاں گر کسی جگہ مرا حال
ذکر سن کر مرا نہ رو دینا
رنج فرقت مرا اٹھا لینا
ہوگا کچھ میری یاد سے نہ حصول
رنج کرنا مرا نہ میں قربان
دے نہ اُس کو خدا کبھی کوئی درد
دل میں کڑھنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تو
آ کے رو لینا میری قبر کے پاس
آنسو چپکے سے دو بہا لینا
اگر آجائے کچھ طبیعت پر
غنچۂ دل مرا کھِلا جانا

میری رسوائی کا خیال رہے
یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
رکھنا اُس وقت تم وہاں پہ قدم
ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
دور پہنچے گی میری رسوائی
لوگ عاشق ہمارا جانیں گے
قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر
پاس رکھنا ہماری عزت کا
آپ پلٹیں وہاں نہ اشک بہائیں
بند اپنی زبان رکھیے گا!
نام منہ سے نہ لیجیے گا مرا
ساتھ غیروں کی طرح جایئے گا
سب میں رسوا نہ کیجیے گا مجھے
منہ سے نالے نکل نہ جائیں کہیں
تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے
تم نہ کرنا کچھ اس طرح کو خیال
میری عزت نہ یوں ڈبو دینا
جی کسی اور جا لگا لینا
دل کو کرلینا اور جا مشغول
سن لو گر اپنی جان ہے تو جہان
ہوتا نازک کمال ہے دلِ مرد
جان دینا نہ گھوٹ گھوٹ کے تو
تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
قبر میری گلے لگا لینا
پڑھنا قرآن میری تربت پر
پھول تربت پہ دو چڑھا جانا

رو کے کرنا نہ اپنا حال زبوں
یوں نہ ہوجائے دشمنوں کو جنوں

دیکھیے کس طرح پڑے گی کل
سخت ہوتی ہے منزلِ اوّل

میرے مرقد پہ روز آنا تم
فاتحے سے نہ ہاتھ اٹھانا تم

ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے
مٹی دینا تم اپنے ہاتھوں سے

عمر بھر کون کس کو روتا ہے؟
کون صاحب کسی کا ہوتا ہے؟

کبھی آجائے گر ہمارا دھیان
جاننا ہم پہ ہوگئی قربان

دل پہ کچھ آنے دیجیو نہ ملال
خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال

رنج و راحت جہاں میں توام ہے
کبھی شادی ہے اور کبھی غم ہے

ہے کسی جا پہ جشن شام و پگاہ
ہے کسی جا صدائے نالہ و آہ

مرگ کا کس کو انتظار نہیں
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو
آج دل کھول کے گلے مل لو!

خوب سا آج دیکھ بھال لو تم
دل کی سب حسرتیں نکال لو تم

آؤ اچھی طرح سے کرلو پیار
کہ نکل جائے کچھ تو دل کا بخار

دل میں باقی رہے نہ کچھ ارمان
خوب مل لو گلے سے میں قربان

حشر تک ہوگی پھر یہ بات کہاں
ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں

کہہ لو سن لو جو کچھ کہ دل میں آئے
پھر خدا جانے کیا نصیب دکھائے

دل کو اپنے کرو ملول نہیں
رونے دھونے سے کچھ حصول نہیں

ہم کو گاڑے جو اپنے دل کو کڑھائے
ہم کو ہَے ہَے کرے جو اشک بہائے

عمر تم کو تو ہے ابھی کھیلنا
دن بہت سے پڑے ہیں رو لینا

باہیں دونوں گلے میں ڈال لو آج
جو جو ارمان ہوں نکال لو آج

پھر خدا جانے کیا مشیت ہے
اتنی صحبت بہت غنیمت ہے

کس کو کل بیٹھ کر کرو گے پیار
کس کی لو گے بلائیں تم ہر بار

کل گلے سے کسے لگاؤ گے
یوں کسے گود میں بٹھاؤ گے

حال کس کا سنائے گی آکر
کس کی ماما بلائے گی آکر

ہم تو اٹھتے ہیں اس مکان سے کل
اب تو جاتے ہیں ہم جہان سے کل

یاد اتنی تجھے دلاتے جائیں
پان کل کے لیے لگاتے جائیں

ہوچکا آج جو کہ تھا ہونا
کل بسائیں گے قبر کا کونا

خاک میں ملتی ہے یہ صورتِ عیش
پھر کہاں ہم کہاں یہ صحبتِ عیش

دیکھ لو آج ہم کو جی بھر کے
کوئی آتا نہیں ہے پھر مر کے

ختم ہوتی ہے زندگانی آج
خاک میں ملتی ہے جوانی آج

چپ رہو کیوں عبث بھی روتے ہو
مفت کاہے کو جان کھوتے ہو

سمجھو اس کو شبِ برات کی رات
ہم ہیں مہماں تمھارے رات کی رات

چین دل کو نہ آئے گا تجھ بن
اب کے بچھڑے ملیں گے حشر کے دن

اب تم اتنی دعا کرو مری جان
کل کی مشکل خدا کرے آسان

پھل اُٹھایا نہ زندگانی کا
نہ ملا کچھ مزا جوانی کا

دل میں لے کر تمھاری یاد چلے
باغ عالم سے نامراد چلے

کہتی ہے بار بار ہمتِ عشق
ہے یہی مقتضائے غیرت عشق

چارپائی پہ کون پڑ کے مرے
کون یوں ایڑیاں رگڑ کے مرے

عشق کا نام کیوں ڈبو جائیں
آج ہی جان کیوں نہ کھوجائیں

جب تلک چرخ بے مدار رہے
یہ فسانہ بھی یادگار رہے"

واسوختِ شوق

وہ بھی کیا دن تھے کہ تم شوخ جفا کار نہ تھے
تیغِ ابرو کی طرح خلق کے خونخوار نہ تھے
سر مو مثلِ سرِ زلف دل آزار نہ تھے
شوخ تھے، گرم تھے، اس طرح کے طرار نہ تھے
صورتِ برق جو رخسار چمک جاتے تھے
اپنے سایے سے بھی تم آپ جھجک جاتے تھے

نہ تھے عیار، نہ مکار، نہ تھے عربدہ جو
نہ الجھ پڑنے میں تھی کیسوئے خم دار کی خو
پیچ کی بات سمجھتے تھے نہ ہرگز سرمو
جو نہ کہنا تھا وہ کہتے تھے تمھارے بررو
واقفِ رمز و کنایہ نہ مری جان تھے تم
سیدھی الٹی نہ سمجھتے تھے یہ ناوان تھے تم

چشمِ مخمور کے منظور نظر جام نہ تھا
ناز و انداز و ادا سے تمھیں کچھ کام نہ تھا
ذکر حسنِ رُخ و گیسو سحر و شام نہ تھا
نام کو پاس کوئی عاشق بدنام نہ تھا
اتنی آرائشِ تن پر نہ نظر تھی تم کو
نیک و بد سے نہ زمانے کی خبر تھی تم کو

ذکر کل کا ہے سمجھتے نہ تھے کچھ بات ذرا
وضع البیلی تھی، ہر بات میں الھڑ پن تھا
خودنمائی کا نہ حاصل تھا طبیعت کو مزا
چال سیدھی تھی، نہ تھا اتنا ڈوپٹہ ٹیڑھا
بالیاں پہنیں گے، رہتے تھے ان ارمانوں میں
نیلے ڈورے تھے فقط پہنے ہوئے کانوں میں

یاد بھی اب تو نہ ہووے گا وہ تم کو زنہار
ناک میں نیم کا تنکا نہ وہ جوبن کا اُبھار
آستینوں کی پھنسی کرتی وہ بازو تیار
بے مَلے مسّی کے وہ دانت وہ آغاز بہار
وہ ہر اک بات میں اٹھلانا وہ البیلا پن
وہ دبی بات، وہ لجیائی تمھاری چتون

دیکھنے والے تو ہم بھی ہیں ترے اُس سِن کے
ایک دو میں کبھی چار آنکھ نہ تم کرتے تھے
شوخ چشمی تھی طبیعت میں مگر پہلے سے
'چشم بددور ہو' جتنے تھے یہی تھے کہتے
جانِ عشاق پہ شوخی تری آفت ہوگی
اب تو فتنہ ہے کوئی دن میں قیامت ہوگی

دلِ عاشق کو نہ اس طرح لگا لیتے تھے
یوں زباں دانت کے نیچے نہ دبا لیتے تھے
دیکھتا تھا جو کوئی تیوری چڑھا لیتے تھے
شرم آجاتی تھی آنکھوں کو جھکا لیتے تھے
رعد جس وقت گرجتا تھا تو گھبراتے تھے
بجلی جب کوندتی تھی ڈر کے چمٹ جاتے تھے

اب تو کچھ نامِ خدا سیکھے نئے ہیں انداز
سحر آنکھوں میں بھرا ہے تو لبوں میں اعجاز
نئی صحبت، نئے اشخاص، نیا راز و نیاز
نیا عشوہ، نیا غمزہ، نئی گرمی، نئے ناز
زلف دکھلا کے جسے چاہا اسے مار چلے
چال وہ سیکھی کہ جس چال پہ تلوار چلے

اس قدر اب نہ اٹھا دیجے حیا کے پردے   لوگ آپس میں بہت کرنے لگے ہیں چرچے
میلے ٹھیلے پہ ابھی گو نہیں رغبت ہے ولے   بات یہ بھی تو مگر سچ ہے بقولِ شخصے
پہروں گھر میں نہیں صاحب کا پتا لگتا ہے
یوں ہی بدنام جو ہو جاؤ تو کیا لگتا ہے

اب نہ پردہ ہے، نہ چوری ہے، نہ شرماتے ہیں   جی جہاں چاہتا ہے آپ چلے جاتے ہیں
جس پہ دل آتا ہے گھر میں اُسے بلواتے ہیں   اور جو کچھ کہیے ڈھٹائی سے یہ فرماتے ہیں
ہاں جی ہاں غیر سے کی ہم نے محبت تمھیں کیا
اپنا دل، اپنی خوشی، اپنی طبیعت تمھیں کیا

بندہ پرور! یہ جو کچھ آپ نے فرمایا بجا   حسن ہے، جتنا غرور آپ کریں ہے زیبا
پر یہ غمزہ، یہ لگاوٹ، یہ سجاوٹ، یہ ادا   جتنا کچھ تم میں ہے سب یہ ہے ہمارا صدقہ
میری الفت کے سبب حسن میں مغرور ہوئے
اک مرے چاہنے سے خلق میں مشہور ہوئے

دل ربائی کا چلن سارا سکھایا میں نے   ہو کے دیوانہ پری زاد بنایا میں نے
ہاں مگر سچ ہے کہ اپنا کیا پایا میں نے   ایک دن بھی نہ مزا اس کا اٹھایا میں نے
دھیان رہ رہ کے یہی آتا ہے ہم کیا سمجھے
ہووے اِس دل کا برا آپ کو اچھا سمجھے

اب یہ ڈر ہے کہ جہاں میں کہیں بدنام نہ ہو   خود غرض، عہد شکن لوگ نہ سمجھیں تم کو
بے مروّت نہ ہو، بے دید نہ ہو، یوں دیکھو!   بے سبب ہم سے نہ تم ترکِ ملاقات کرو
ہوگا دشوار بہت منہ کا دکھانا تم کو
کیا کہے گا یہ بتاؤ تو زمانہ تم کو

اتنا مغرور نہ ہو حسنِ دو روزہ پہ صنم   ہیں حسیں آپ تو بندہ بھی نہیں آپ سے کم
سیکڑوں چاہتے ہیں، سیکڑوں کا جاتا ہے دم   گئے گزرے ہوئے عالم پہ بھی یہ ہے عالم
سیکڑوں مرتے ہیں اس بات پہ، یہ بات کرے
سیکڑوں چاہتے ہیں ہم سے ملاقات کرے

پر یہ للہ بتا دے تو مجھے اے مری جان   جن ہے تو، یا ہے پری، یا ہے مکمل انسان
تیری الفت نے کیا ہے مجھے ایسا حیران   کہ کسی طرح سے بچتی نظر آتی نہیں جان
ہے دھواں سانس میں کیا چیز جلا دی تو نے
نہیں معلوم کہاں آگ لگا دی تو نے

اب طبیعت نے اٹھایا ہے یہ صدمہ جاں کاہ   جان بچتی نظر آتی نہیں اے غیرتِ ماہ
شکوہ کرتا نہیں اس پر بھی ترا میں واللہ!   کوئی کہتا ہے تو کہتا ہوں کہ "کیا اُس کا گناہ"
ہو نہ غیبت، یہ مناسب نہیں کہنا مجھ کو
اُس کا کیا شکوہ، کسی سے نہیں کہنا مجھ کو

ان کو منظور اگر غیروں سے ہے انس و وفا   ان سے ملنا نہیں منظور ہمیں بھی حاشا
گو کہ مشہور زمانے میں وہ ہیں مہر لقا   اپنے مطلب کے نہیں، روز جلے کس کی بلا
کس کو مطلب ہے کہ اب ان سے ملاقات کرے
ایسے خود غرضوں سے پاپوش مری بات کرے

غزلیں

دیکھ لیتے ہیں جو ہم اس گل کے پیارے ہاتھ پاؤں
بے خودی سے پھول جاتے ہیں ہمارے ہاتھ پاؤں

قاصدا! یہ یاد رکھنا ان کی صورت کا پتا
بھولی بھولی شکل ہے اور پیارے پیارے ہاتھ پاؤں

شوخیاں کرتے ہو، چل نکلے ہو تم حد سے سوا
باندھیں گے مہندی لگا کر ہم تمھارے ہاتھ پاؤں

پشتِ دست و پا میں عکسِ رو نظر آتا ہے صاف
کیوں نہ وہ خود بیں ہو، آئینہ ہیں سارے ہاتھ پاؤں

ہر گھڑی ہم بھی اکڑ کر آئنے میں دیکھتے
گر تمھارے سے کہیں ہوتے ہمارے ہاتھ پاؤں

پاؤں پر گرنے سے بھی جب وہ نہ آیا میرے ہاتھ
پیٹے، کاٹے، جھٹکے، ٹپکے، دے دے مارے ہاتھ پاؤں

ذبح کے ہنگام کیونکر مجھ سے تڑپا جائے گا
سنتا ہوں وہ آپ پکڑیں گے ہمارے ہاتھ پاؤں

غیر کے گھر میں رہو کوئی وہاں ہو کہ نہ ہو
تمھیں بتلاؤ برا دل میں گماں ہو کہ نہ ہو

وہ سنے یا نہ سنے دل میں تو حسرت نہ رہے
مثل نے نالہ کروں منہ میں زباں ہو کہ نہ ہو

باغ کی سیر کو اغیار اکیلا لے جائیں
تمھیں منصف ہو یہ سن کر خفقاں ہو کہ نہ ہو

دود آہِ دل عاشق کا تعجب کیا ہے؟
دل جلے سینے میں بتلاؤ دھواں ہو کہ نہ ہو

نزع کا وقت ہے وہ آئے ہیں دل کچھ کہہ لے
پھر خدا جانے کہ قابو میں زباں ہو کہ نہ ہو

ضعف سے گو نہیں طاقت ہے پہ گرتے پڑتے
گھر تلک ان کے چلو تاب و تواں ہو کہ نہ ہو

■

ماخذ: کلیات نواب مرزا شوق لکھنوی، مرتبہ: ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، سنہ اشاعت: اپریل 1978،
ملنے کا پتہ: دانش محل بک سیلر امین الدولہ پارک لکھنؤ 1

کرشن چندر

ادارہ

ڈپٹی نذیر احمد اور منشی پریم چند سے اردو فکشن کی جو توانا روایت اردو میں شروع ہوئی اس کو وسعت اور گہرائی بخشنے والے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر کا نام بے حد نمایاں ہے۔ اپنے افسانوں اور ناولوں کی کہانیاں بننے میں فنکاری کا جتنا زیادہ اور جتنا خوب صورت و اثر انگیز استعمال کرشن چندر نے کیا اس کی دوسری مثال اردو کے کسی نثر نگار تخلیق کار کے یہاں نہیں ملتی۔ خاص طور سے اپنے ناولوں میں انھوں نے اس ہنر کا زیادہ استعمال کیا۔ ایک گدھے کی سرگزشت اور اس سیریز کے باقی دو ناولوں ایک گدھا نیفا میں اور گدھے کی واپسی میں انھوں نے غریب عام آدمی کی نظر سے ہندوستانی و عالمی انسانی سماج کی بوالعجبیوں کو دیکھا اور دکھایا، اور سیاست کے تاریک گوشوں کو بے نقاب کیا۔ اس سیریز نے انھیں اپنے دور کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ناول نگار بنا دیا تھا۔ طنز و مزاح ان کے اکثر ناولوں میں کہانی کا حصہ بن کر سامنے آتا تھا۔

کرشن چندر نے ناول، افسانے، ڈرامے، رپورتاژ، مضامین سبھی کچھ لکھا، لیکن ان کی بنیادی حیثیت افسانہ نگار کی ہے۔ کرشن چندر دراصل بسیار نویس اور زود نویس تھے ان کی مقبولیت ان کی رومانیت اور نہایت خوبصورت اور سبک نثر کی وجہ سے تھی جس میں جادو کا اثر تھا اور جس کی بدولت کرشن چندر نے شہرت کی بلندیوں کو چھولیا۔ مزاجاً وہ رومان پسند اور جذباتی تھے۔ ان کی رومانیت، حسن پرستی، جذباتیت، فطرت سے بے پناہ لگاؤ اور بے لوث محبت نے مل کر ان کے افسانوں میں ایسی کشش پیدا کردی کہ دل بے ساختہ ان کی طرف کھنچتا تھا۔ وہ محبت کے جادوگر تھے۔ ان کی زبان میں ایسا رس اور جادو ہے جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ ان کے افسانوں میں بلند و پست سب ہے، لیکن ان کے بہترین افسانے ان کی رومان پروری، حسن کاری، فطرت پرستی، انسان دوستی اور بہتر سماج کی آرزومندی کے باعث زندہ رہیں گے۔

تصانیف: کرشن چندر ڈیڑھ سو سے زائد کتابوں کے خالق ہیں جن میں سے اہم یہ ہیں: ان داتا، تین غنڈے، طلسمِ خیال، زندگی کے موڑ پر، ٹوٹے ہوئے تارے، شکست، دادر پُل کے بچے، ہم وحشی ہیں، ہوائی قلعے، ایک گدھے کی سرگزشت، باون پتے، ایک عورت ہزار دیوانے، جب کھیت جاگے، دل کی وادیاں سوگئیں، فٹ پاتھ کے فرشتے، آدھے گھنٹے کا خدا، آسمان سرخ ہے، ایک وائلن سمندر کے کنارے، ہائڈروجن بم کے بعد — انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھیں اور 'الٹا درخت' بچوں کے لیے لکھا گیا ان کا بہترین مختصر ناول تھا۔

کرشن چندر کی پیدائش 26 نومبر 1913 بھرتپور راجستھان میں ہوئی۔ ان کے والد ڈاکٹر گوری شنکر بھرت پور اور بعد ازاں پونچھ میں ملازم تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم پونچھ میں ہوئی۔ 1930 کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور آگئے اور فورمین کرسچین کالج میں داخلہ لیا۔ 1934 میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔

کرشن چندر کی ادبی زندگی صحیح معنوں میں 'ادبی دنیا' لاہور سے شروع ہوئی جہاں صلاح الدین احمد نے ان کی بے حد حوصلہ افزائی کی۔ اسی زمانے میں انھیں آل انڈیا ریڈیو لاہور میں ملازمت مل گئی اور سال بھر میں دہلی اور پھر لکھنؤ تبادلہ ہوگیا۔ لکھنؤ اس زمانے میں ترقی پسند تحریک کا مرکز تھا۔ لکھنؤ میں تھے کہ شالیمار پکچرز کے لیے مکالمے لکھنے کی دعوت ملی اور وہ استعفیٰ دے کر پونا چلے آئے۔ بعد میں مستقل طور پر بمبئی آگئے۔ 1969 میں حکومتِ ہند کی طرف سے پدم بھوشن کا اعزاز عطا ہوا اور کئی اداروں اور انجمنوں کی جانب سے ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ انھوں نے بہت سی فلموں کی کہانیاں بھی لکھیں جن میں 'شہر اور سپنا' اور 'شرافت' قابل ذکر ہیں۔ آخری دنوں میں وہ جاسوسی ناول بھی لکھنے لگے تھے۔ انھوں نے اردو کے مشہور انشائیہ نگار رشید احمد صدیقی کی دختر سلمیٰ صدیقی سے شادی کی تھی جو خود بھی اردو کی معروف افسانہ نگار ہیں۔ کرشن چندر کے بھائی مہندر ناتھ بھی عمدہ افسانے لکھتے تھے۔

کرشن چندر کا انتقال 8 مارچ 1977 کو بمبئی میں ہوا۔

■

ماخذ: فن اور شخصیت (کوائف نمبر: امیر خسرو سے ساحر لدھیانوی تک)، مدیر: صابر دت، اشاعت: 1994)

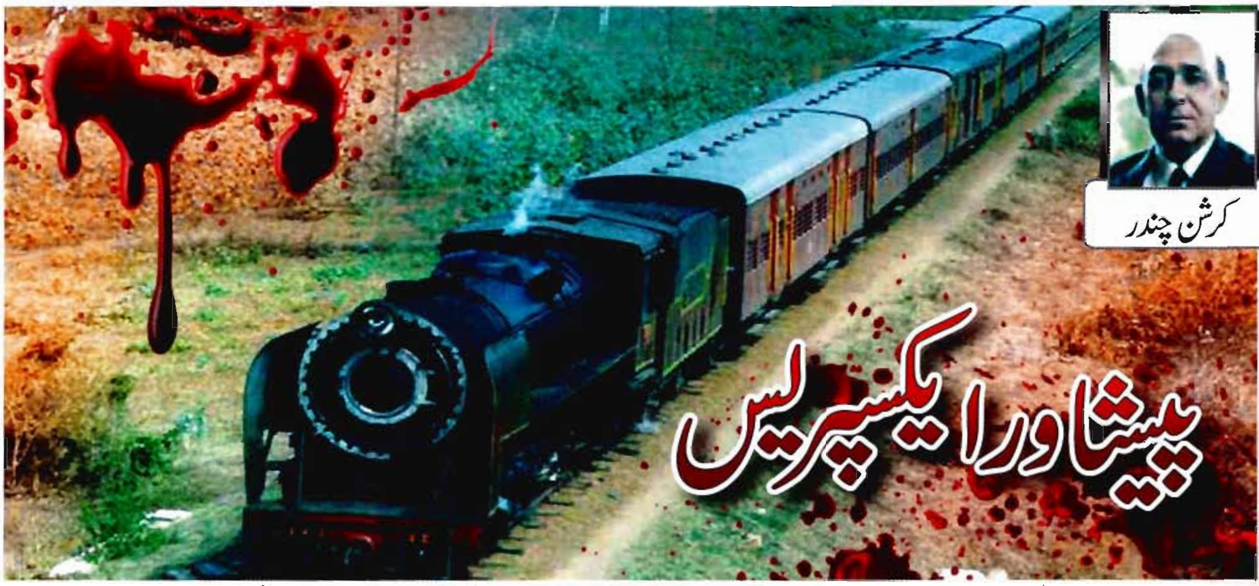

پشاور ایکسپریس

کرشن چندر

جب میں پشاور سے چلی، تو میں نے چھکا چھک اطمینان کا سانس لیا۔ میرے ڈبوں میں زیادہ تر ہندو لوگ بیٹھے ہوئے تھے، یہ لوگ پیشاور سے ہوتے مردان سے، کوہاٹ سے، چارسدہ سے، خیبر سے، لنڈی کوتل سے، بنوں، نوشہرہ، مانسہرہ سے آئے تھے۔ اور پاکستان میں جان و مال کو محفوظ نہ پا کر ہندوستان کا رخ کر رہے تھے۔ اسٹیشن پر زبردست پہرہ تھا اور فوج والے بڑی چوکسی سے کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو جو پاکستان میں پناہ گزین اور ہندوستان میں شرنارتھی کہلاتے تھے اس وقت تک چین کا سانس نہ آیا جب تک میں نے پنجاب کی رومان خیز سرزمین کی طرف قدم نہ بڑھائے۔ یہ لوگ شکل و صورت سے بالکل پٹھان معلوم ہوتے تھے۔ گورے چٹے مضبوط ہاتھ پاؤں، سر پر کلاہ اور لنگی اور جسم پر قمیص اور شلوار، یہ لوگ پشتو میں بات کرتے تھے اور کبھی کبھی نہایت کرخت قسم کی پنجابی میں بات چیت کرتے تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے ہر ڈبے میں دو سپاہی بندوقیں لے کر کھڑے تھے۔ وجیہ بلوچ سپاہی، اپنی پگڑیوں کے عقب میں مور کے چھتر کی طرح خوبصورت طرے لگائے ہوئے، ہاتھ میں جدید رائفلیں لیے ہوئے ان ہندو پٹھانوں اور ان کی بیوی بچوں کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے تھے۔ جو ایک تاریخی خوف اور شر کے زیر اثر اس سرزمین سے بھاگے جا رہے تھے۔ جہاں وہ ہزاروں سال سے رہتے چلے آئے تھے۔ جس کی سنگلاخ سرزمین سے، انھوں نے توانائی حاصل کی تھی، جس کے برفاب چشموں سے انھوں نے پانی پیا تھا اور جس کے حسین چمن زاروں سے انھوں نے انگوروں کا رس پیا تھا، آج یہ وطن یک لخت بیگانہ ہو گیا تھا اور اس نے اپنے مہربان سینے کے کواڑ ان پر بند کر دیے تھے اور وہ ایک نئے دیس کے تپتے ہوئے میدانوں کا تصور دل میں لیے بادل نخواستہ وہاں سے رخصت ہو رہے تھے، اس امر کی مسرت ضرور تھی کہ ان کی جانیں بچ گئی تھیں۔ ان کا بہت سا مال و متاع اور ان کی بہوؤں بیٹیوں، ماوؤں اور بیویوں کی آبرو محفوظ تھی، لیکن ان کا دل رو رہا تھا اور آنکھیں سرحد کے پتھریلے سینے پر یوں گڑی ہوئی تھیں، گویا اسے چیر کر اندر گھس جانا چاہتی ہیں اور اس کے شفقت بھرے مامتا کے فوارے سے پوچھنا چاہتی ہیں۔ بول ماں۔ آج کس جرم کی پاداش میں تو نے اپنے بیٹوں کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اپنی بہوؤں کو اس خوبصورت آنگن سے محروم کیا ہے۔ جہاں وہ کل تک سہاگ کی رانیاں بنی بیٹھی تھیں۔ اپنی البیلی کنواریوں کو جو انگور کی بیل کی طرح تیری چھاتی سے لپٹ رہی تھیں، جھنجھوڑ کر الگ کر دیا ہے۔ کس لیے آج یہ دیس بدیس ہو گیا ہے۔ میں چلتی جا رہی تھی اور ڈبوں میں بیٹھی ہوئی مخلوق اپنے وطن کی سطح مرتفع، اس کی بلند و بالا چٹانوں اس کے مرغزاروں، اس کی شاداب وادیوں، کنجوں اور باغوں کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے ہر جانے پہچانے منظر کو اپنے سینے میں چھپا کے لے جانا چاہتی ہے، جیسے نگاہ ہر لحظہ رک جائے، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس عظیم رنج و الم کے بارے میں میرے قدم بھاری ہوئے جا رہے ہیں اور ریل کی پٹری مجھے جواب دیئے جا رہی ہے۔

حسن ابدال تک لوگ یوں ہی محزوں، افسردہ، یاس و نکبت کی تصویر بنے رہے۔ حسن ابدال کے اسٹیشن پر بہت سے سکھ آئے ہوئے تھے۔ پنجہ صاحب سے لمبی لمبی کرپانیں لیے، چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئیں، بال بچے سہمے سہمے سے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی ہی تلوار کے گھاؤ سے یہ لوگ خود مر جائیں گے۔ ڈبوں میں بیٹھ کر ان لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر دوسرے سرحد کے ہندو اور سکھ پٹھانوں سے گفتگو شروع ہو گئی۔ کسی کا گھر بار جل گیا تھا۔ کوئی صرف ایک قمیص اور شلوار میں بھاگا تھا۔ کسی کے پاؤں میں جوتی نہ تھی، اور کوئی اتنا ہوشیار تھا کہ اپنے گھر کی ٹوٹی چارپائی تک اٹھا لایا تھا، جن لوگوں کا واقعی بہت نقصان ہوا تھا وہ لوگ گم صم بیٹھے تھے۔ خاموش، چپ چاپ اور جس کے پاس کبھی کچھ نہ ہوا تھا وہ اپنی لاکھوں کی جائیداد کے کھونے کا غم کر رہا تھا اور دوسروں کو اپنی فرضی امارت کے قصے سنا سنا کر مرعوب کر رہا تھا اور مسلمانوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ بلوچ سپاہی ایک پروقار انداز میں دروازوں پر رائفلیں تھامے کھڑے تھے اور کبھی کبھی ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرا اٹھتے۔

ٹکشلا کے اسٹیشن پر مجھے بہت عرصے تک کھڑا رہنا پڑا۔ نجانے کس کا انتظار تھا۔ شاید آس پاس کے گاؤں سے ہندو پناہ گزین آ رہے تھے۔ جب گارڈ نے اسٹیشن ماسٹر سے بار بار پوچھا تو اس نے کہا۔ یہ گاڑی آگے نہ جا سکے گی۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ اب لوگوں نے اپنا ساز و سامان خورد و نوش کھولا اور کھانے لگے۔ سہمے سہمے بچے، قہقہے لگانے لگے، اور معصوم کنواریاں دریچوں سے باہر جھانکنے لگیں اور بڑے بوڑھے حقے کڑکڑانے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد دور سے شور سنائی دیا اور ڈھولوں کے پیٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

ہندو پناہ گزینوں کا جتھا آ رہا تھا شاید، لوگوں نے سر نکال کر ادھر ادھر دیکھا، جتھا دور سے آ رہا تھا۔ وقت گزرتا گیا، جتھا قریب آتا گیا۔ ڈھولوں کی آواز تیز تر ہوتی گئی۔ جتھے کے قریب آتے ہی گولیوں کی آوازیں

کانوں میں آئیں اور لوگوں نے اپنے سر کھڑکیوں سے پیچھے ہٹا لیے۔ یہ ہندوؤں کا جتھا تھا۔ جو آس پاس کے گاؤں سے آیا تھا۔ گاؤں کے مسلمان لوگ اسے اپنے حفاظت میں لا رہے تھے، چنانچہ ہر ایک مسلمان نے ایک کافر کی لاش اپنے کندھے پر اٹھا رکھی تھی، جس نے جان بچا کر گاؤں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی، دو سو لاشیں تھیں۔ مجمع نے یہ لاشیں نہایت اطمینان سے اسٹیشن پر پہنچ کر بلوچی دستے کے سپرد کیں اور کہا کہ وہ ان مہاجرین کو نہایت حفاظت سے ہندوستان کی سرحد پر لے جائے۔

چنانچہ بلوچ سپاہیوں نے نہایت خندہ پیشانی سے اس بات کا ذمہ لیا اور ہر ڈبے میں پندرہ بیس لاشیں رکھ دی گئیں۔ اس کے بعد مجمع نے ہوا میں فائر کیا اور گاڑی چلانے کے لیے اسٹیشن ماسٹر کو حکم دیا۔ میں چلنے لگی تھی کہ پھر مجھے روک دیا گیا اور مجمع کے سرغنے نے ہندو پناہ گزینوں سے کہا کہ دو سو آدمیوں کے چلے جانے سے ان کے گاؤں ویران ہو جائیں گے، اور ان کی تجارت تباہ ہو جائے گی اس لیے دو گاڑی میں سے دو سو آدمی اتار کر اپنے گاؤں لے جائیں گے چاہے کچھ بھی ہو۔ وہ اپنے ملک کو یوں برباد ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ اس پر بلوچ سپاہیوں نے ان کی فہم و ذکا اور ان کی فراست طبع کی داد دی اور ان کی وطن دوستی کو سراہا۔ چنانچہ اس پر بلوچی سپاہیوں نے ہر ڈبے سے کچھ آدمی نکال کر مجمع کے حوالے کیے، پورے دو سو آدمی نکالے گئے ایک کم نہ ایک زیادہ۔

لائن لگاؤ کافرو! سرغنے نے کہا۔ سرغنہ اپنے علاقہ کا سب سے بڑا جاگیردار تھا اور اپنے لہو کی روانی میں مقدس جہاد کی گونج سن رہا تھا۔

کافر پتھر کے بت بنے کھڑے تھے۔ مجمع کے لوگوں نے انھیں اٹھا اٹھا کر لائن میں کھڑا کیا۔ دو سو آدمی، دو سو زندہ لاشیں۔ چہرے ستے ہوئے۔ آنکھیں فضا میں تیروں کی بارش سی محسوس کرتی ہوئی۔

پہل بلوچ سپاہیوں نے کی۔ پندرہ آدمی فائرنگ سے گر گئے۔

یہ ٹکشلا کا اسٹیشن تھا۔

بیس اور آدمی گر گئے۔

یہاں ایشیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی اور لاکھوں طالب علم اس تہذیب و تمدن کے گہوارے سے کسب فیض کرتے تھے۔

پچاس اور مارے گئے۔

ٹکشلا کے عجائب گھر میں اتنے خوبصورت بت تھے، اتنے حسین سنگ تراشی کے نادر نمونے، قدیم تہذیب کے جھلملاتے ہوئے چراغ۔

پچاس اور مارے گئے۔

پس منظر میں سرکوب کا محل تھا اور کھیلوں کا ایمفی تھیٹر اور میلوں تک پھیلے ہوئے ایک وسیع شہر کے کھنڈر ٹکشلا کی گذشتہ عظمت کے پرشکوہ مظہر۔

تیس اور مارے گئے۔

یہاں کنشک نے حکومت کی تھی اور لوگوں کو امن و آشتی اور حسن و دولت سے مالا مال کیا تھا۔

پچیس اور مارے گئے۔

یہاں بدھ کا نغمہ عرفان گونجا تھا۔ یہاں بھکشوؤں نے امن و صلح و آشتی کا درس حیات دیا تھا۔

اب آخری گروہ کی اجل آ گئی تھی۔

یہاں پہلی بار ہندوستان کی سرحد پر اسلام کا پرچم لہرایا تھا۔ مساوات اور اخوت اور انسانیت کا پرچم۔

سب مر گئے، اللہ اکبر! فرش خون سے لال تھا اور جب میں پلیٹ فارم سے گزری تو میرے پاؤں ریل کی پٹری سے پھسلے جاتے تھے۔ جیسے میں ابھی گر جاؤں گی اور گر کر باقی ماندہ مسافروں کو بھی ختم کر ڈالوں گی۔

ہر ڈبے میں موت آ گئی تھی اور لاشیں درمیان میں رکھ دی گئی تھی اور زندہ لاشوں کا ہجوم چاروں طرف تھا اور بلوچ سپاہی.......... مسکرا رہے تھے، کہیں کوئی بچہ رونے لگا۔ کسی بوڑھی ماں نے سسکی لی، کسی کے لٹے ہوئے سہاگ نے آہ کی، اور چیختی چلاتی، راولپنڈی کے پلیٹ فارم پر آ کھڑی ہوئی۔

یہاں سے کوئی پناہ گزین گاڑی میں سوار نہ ہوا۔ ایک ڈبہ میں چند مسلمان نوجوان پندرہ بیس برقعہ پوش عورتوں کو لے کر سوار ہوئے۔ ہر نوجوان رائفل سے مسلح تھا۔ ایک ڈبے میں بہت سا سامان جنگ لادا گیا، مشین گنیں، اور کارتوس پستول اور رائفلیں۔

جہلم اور گوجر خاں کے درمیانی علاقے میں مجھے سگنل کھینچ کر کھڑا کر دیا گیا۔ میں رک گئی۔ مسلح نوجوان گاڑی سے اترنے لگے۔ برقعہ پوش خواتین نے شور مچانا شروع کیا۔ ہم ہندو ہیں، ہم سکھ ہیں، ہمیں زبردستی لے جا رہے ہیں۔ انھوں نے برقعے پھاڑ دیے اور چلانے لگیں۔ نوجوان مسلمان ہنستے ہوئے گھسیٹ گھسیٹ کر گاڑی سے نکال لائے۔

ہاں یہ ہندو عورتیں ہیں۔ ہم انھیں راولپنڈی سے ان کے آرام دہ گھروں، ان کے خوشحال گھرانوں، ان کے عزت دار ماں باپ سے چھین کر لائے ہیں۔ اب یہ ہماری ہیں۔ ہم ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کریں گے۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو انھیں ہم سے چھین کر لے جائے۔

سرحد کے دو نوجوان ہندو پٹھان چھلانگ مار کر گاڑی سے اتر گئے، بلوچ سپاہیوں نے نہایت اطمینان سے فائر کر کے انھیں ختم کر دیا۔ پندرہ بیس نوجوان اور نکلے، انھیں مسلح مسلمانوں کے گروہ نے منٹوں میں ختم کر دیا۔ دراصل گوشت کی دیوار لوہے کی گولی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ نوجوان ہندو عورتوں کو گھسیٹ کر جنگل میں لے گئے اور میں منہ چھپا کر وہاں سے بھاگی۔ کالا، خوفناک سیاہ دھواں میرے منہ سے نکل رہا تھا۔ جیسے کائنات پر خباثت کی سیاہی چھا گئی تھی۔ اور سانس میرے سینے میں یوں الجھنے لگی جیسے یہ آہنی چھاتی ابھی پھٹ جائے گی اور اندر بھڑکتے ہوئے لال لال شعلے اس جنگل کو خاک سیاہ کر ڈالیں گے، جو اس وقت میرے آگے پیچھے پھیلا ہوا تھا جس نے ان پندرہ عورتوں کو چشم زدن میں نگل لیا تھا۔

لالہ موسیٰ کے قریب لاشوں سے اتنی مکروہ سڑانڈ نکلنے لگی کہ بلوچ سپاہی انھیں باہر پھینکنے پر مجبور ہو گئے، وہ بات کے اشارے سے ایک آدمی کو بلاتے اور اس سے کہتے، اس لاش کو اٹھا کر یہاں لاؤ دروازے پر اور جب وہ آدمی ایک لاش اٹھا کر دروازے پر لاتا تو اسے گاڑی سے باہر دھکا دے دیتے۔ تھوڑی دیر ہی میں سب لاشیں ایک ایک ہمراہی کے ساتھ باہر پھینک دی گئیں اور ڈبوں میں آدمی کم ہو جانے سے ٹانگیں پھیلانے کی جگہ بھی ہو گئی۔

پھر لالہ موسیٰ گزر گیا اور وزیر آباد آ گیا۔ وزیر آباد کا مشہور جنکشن، وزیر آباد کا مشہور شہر۔ جہاں ہندوستان بھر کے لیے چھریاں اور چاقو تیار ہوتے ہیں۔ وزیر آباد جہاں کے ہندو اور مسلمان صدیوں سے بیساکھی کا میلہ بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں اور اس کی خوشیوں میں اکٹھے حصہ لیتے ہیں۔ وزیر آباد کا اسٹیشن لاشوں سے پٹا ہوا تھا۔ شاید یہ لوگ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے، لاشوں کا میلہ، شہر میں دھواں اٹھ رہا تھا اور اسٹیشن کے قریب انگریزی بینڈ کی صدا سنائی دے رہی تھی اور ہجوم کی پر شور تالیوں اور قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں، چند منٹوں میں ہجوم اسٹیشن پر آ گیا، آگے آگے دیہاتی ناچتے گاتے آ رہے تھے اور ان کے پیچھے ننگی عورتوں کا ہجوم تھا۔ مادر زاد تھیں عورتیں، بوڑھی، نوجوان، بچیاں، دادیاں اور پوتیاں، مائیں اور بہوئیں اور بیٹیاں، کنواریاں اور حاملہ عورتیں، ناچتے گاتے ہوئے مردوں کے نرغے میں تھیں، عورتیں ہندو اور سکھ تھیں اور مرد مسلمان تھے، اور دونوں نے مل کر یہ عجیب بیساکھی منائی تھی۔ عورتوں کے بال کھلے ہوئے تھے، ان کے جسموں پر زخموں کے نشان

تھے، اور وہ اس طرح سیدھی تن کر چل رہی تھیں جیسے ہزار کپڑوں میں ان کے جسم چھپے ہوں۔ جیسے ان کی روحوں پر سکون آمیز موت کے دبیز سائے چھا گئے ہوں۔ ان کی نگاہوں کا جلا دروپدی کو بھی شرماتا تھا اور ہونٹ دانتوں کے اندر بھنچے ہوئے تھے گویا کسی مہیب لاوے کا منہ بند کیے ہوئے ہیں۔ شاید ابھی یہ لاوا پھٹ پڑے گا اور اپنی آتش فشانی سے دنیا کو جہنم زار بنا دے گا۔

مجمع میں سے آوازیں آئیں۔ ''پاکستان زندہ باد۔''

''اسلام زندہ باد۔ قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد۔''

ناچتے تھرکتے ہوئے قدم پرے ہٹ گئے اور اب یہ عجیب وغریب ہجوم ڈبوں کے عین سامنے تھا۔ ڈبوں میں بیٹھی ہوئی عورتوں نے گھونگھٹ کاڑھ لیے اور ڈبے کی کھڑکیاں یکے بعد دیگر بند ہونے لگیں۔

بلوچ سپاہیوں نے کہا۔ کھڑکیاں مت بند کرو ہوا رکتی ہے، کھڑکیا بند ہوتی گئیں۔ بلوچ سپاہیوں نے بندوقیں تان لیں۔ ٹھائیں ٹھائیں پھر بھی کھڑکیاں بند ہوتی گئیں اور پھر ڈبے میں ایک کھڑکی بھی کھلی نہ رہی، ہاں کچھ پناہ گزین ضرور مر گئے تھے۔

ننگی عورتیں پناہ گزینوں کے ساتھ بٹھا دی گئیں اور میں اسلام زندہ باد اور قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد کے نعروں کے درمیان رخصت ہوئی۔

گاڑی میں بیٹھا ہوا ایک بچہ لڑھکتا لڑھکتا ایک بوڑھی دادی کے پاس چلا گیا۔ اس سے پوچھنے لگا۔ ''ماں تم نہا کے آئی ہو؟''

دادی نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔ ہاں ننھے، آج مجھے میرے وطن کے بیٹوں نے بھائیوں نے نہلایا ہے۔

تمھارے کپڑے کہاں ہیں اماں؟

ان پر میرے سہاگ کے خون کے چھینٹے تھے بیٹا۔ وہ لوگ انھیں دھونے کے لیے لے گئے ہیں۔ دو ننگی لڑکیوں نے گاڑی سے چھلانگ لگا دی اور میں چیختی چلاتی آگے بھاگی اور لاہور پہنچ کر دم لیا۔

مجھے نمبر ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کیا گیا۔ نمبر 2 پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی کھڑی تھی۔ یہ امرتسر سے آئی تھی، اور اس میں مسلمان پناہ گزیں بند تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مسلم خدمت گار میرے ڈبوں کی تلاشی لینے لگے اور زیور اور نقدی اور دوسرا قیمتی سامان مہاجرین سے لے لیا گیا۔

اس کے بعد چار سو آدمی ڈبوں سے نکال کر اسٹیشن پر کھڑے کیے تھے۔ یہ مذبح کے بکرے تھے، کیونکہ ابھی ابھی نمبر 2 پلیٹ فارم پر ایک مسلم مہاجرین کی گاڑی آ کے رکی تھی اس میں چار سو مسلمان مسافر کم تھے اور پچاس مسلم عورتیں اغوا کر لی گئی تھیں۔ اس لیے یہاں پر بھی پچاس عورتیں چن چن کر نکال لی گئیں اور چار سو ہندو مسافروں کو تہ تیغ کیا گیا تا کہ ہندوستان اور پاکستان میں آبادی کا توازن برقرار رہے۔

مسلم خدمت گاروں نے ایک دائرہ بنا رکھا تھا اور چھرے ہاتھ میں تھے اور دائرے میں باری باری ایک مہاجر ان کے چھرے کی زو میں آتا تھا اور بڑی چابک دستی اور مشاقی سے ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ چند منٹوں میں چار سو آدمی ختم کر دیے گئے۔ اور پھر میں آگے چلی۔ اب مجھے اپنے جسم کے ذرے ذرے سے گھن آنے لگی تھی۔ اس قدر پلید اور متعفن محسوس کر رہی تھی میں جیسے مجھے شیطان نے سیدھا جہنم سے دھکا دے کر پنجاب میں بھیج دیا ہو۔ اٹاری پہنچ کر فضا بدل سی گئی۔ مغل پورہ ہی سے بلوچ سپاہی بدلے گئے تھے اور ان کی جگہ ڈوگروں اور سکھ سپاہیوں نے لے لی تھی، لیکن اٹاری پہنچ کر تو مسلمانوں کی اتنی لاشیں ہندو مہاجرین نے دیکھیں کہ ان کے دل فرط مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ آزاد ہندوستان کی سرحد آ گئی تھی۔ ورنہ اتنا حسین منظر کس طرح دیکھنے کو ملتا اور جب میں امرتسر اسٹیشن پر پہنچی تو سکھوں کے نعروں نے زمین آسمان کو گونجا دیا۔ یہاں بھی مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر کے ڈھیر تھے۔ اور ہندو جاٹ اور سکھ اور ڈوگرے ہر ڈبے میں جھانک کر پوچھتے تھے ''کوئی شکار ہے'' مطلب یہ کہ کوئی مسلمان ہے۔

ایک ڈبے میں چار ہندو برہمن سوار ہوئے۔ سر گھٹا ہوا، لمبی چوٹی، رام نام کی دھوتی باندھے، ہردوار کا سفر کر رہے تھے۔ یہاں ہر ڈبے میں آٹھ دس سکھ اور جاٹ بھی بیٹھ گئے۔ یہ لوگ رائفلوں اور بلموں سے مسلح تھے اور مشرقی پنجاب میں شکار کی تلاش میں جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے دل میں کچھ شبہ سا ہوا۔ اس نے ایک برہمن سے پوچھا:

براہمن دیوتا کدھر جا رہے ہو؟

ہردوار۔ تیرتھ کرنے۔

''ہردوار جا رہے ہو کہ پاکستان جا رہے ہو۔''

میاں اللہ کرو۔ دوسرے براہمن کے منہ سے نکلا۔

جاٹ ہنسا۔ تو آؤ اللہ اللہ کریں۔ او نتھا سیاں، شکار مل گیا، بھئی آورا یہ دا اللہ بیلی کریئے۔ اتنا کہہ کر جاٹ نے بلم نقلی براہمن کے سینے میں مارا اور دوسرے براہمن بھاگنے لگے۔ جاٹوں نے انھیں پکڑ لیا۔ ایسے نہیں براہمن دیوتا ذرا ڈاکٹری معائنہ کراتے جاؤ، ہردوار جانے سے پہلے ڈاکٹری معائنہ بہت ضروری ہے نا۔

ڈاکٹری معائنے سے مراد یہ تھا کہ وہ لوگ ختنہ دیکھتے تھے اور جس کے ختنہ ہوا ہوتا اسے وہیں مار ڈالتے۔ چار مسلمان جو براہمن کا روپ بدل کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے وہیں مار ڈالے گئے اور میں آگے چلی۔

راستے میں ایک جگہ جنگل میں مجھے یک لخت کھڑا کر دیا گیا اور لوگ یعنی مہاجرین اور سپاہی اور جاٹ اور سکھ سب نکل نکل کر جنگل کی طرف بھاگنے لگے۔ میں نے سوچا شاید مسلمانوں کی بہت بڑی فوج ان پر حملہ کرنے کے لیے آ رہی ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ جنگل میں بہت سارے مسلمان مزارع اپنے بیوی بچوں کو لیے چھپے بیٹھے ہیں۔ ست سری اکال اور ہندو دھرم کی جے کے نعروں کی گونج سے جنگل کانپ اٹھا اور وہ لوگ نرغے میں لے لیے گئے۔ آدھے گھنٹے میں سب صفایا ہو گیا۔ بڑھے، جوان، عورتیں اور بچے سب مار ڈالے گئے۔ ایک جاٹ کے نیزے پر ایک ننھے سے بچے کی لاش تھی، اور وہ اسے ہوا میں گھما گھما کر کہہ رہا تھا۔ آئی بیساکھی، آئی

بیساکھی، جٹالائے ہے ہے۔

جالندھر سے اِدھر پٹھانوں کا ایک گاؤں تھا۔ یہاں پر گاڑی روک کر لوگ گاؤں میں گھس گئے۔ سپاہی اور مہاجرین اور جاٹ پٹھانوں نے مقابلہ کیا۔ لیکن آخر میں مارے گئے۔ بچے اور مرد ہلاک ہو گئے تو عورتوں کی باری آئی اور میں وہیں اسی کھلے میدان میں جہاں گیہوں کے کھلیان لگائے جاتے تھے اور سرسوں کے پھول مسکراتے تھے اور عفت ماب بیبیاں اپنے خاوندوں کی نگاہ شوق کی تاب نہ لا کر کمزور شاخوں کی طرح جھکی جھکی جاتی تھیں۔ اسی وسیع میدان میں جہاں پنجاب کے دل نے ہیر رانجھے اور سوہنی مہینوال کی لافانی الفت کے ترانے گائے تھے، انھیں شیشم، سرس، اور پیپل کے درختوں تلے وقتی چکلے آباد ہوئے۔ پچاس عورتیں اور پانسو خاوند، پچاس بھیڑیں اور پانسو قصاب، پچاس سوہنیاں اور پان سو مہینوال، شاید اب چناب میں کبھی طغیانی نہ آئے گی۔ شاید اب کوئی وارث شاہ کی ہیر نہ گائے گا۔ شاید اب مرزا صاحبان کی داستان الفت و عفت ان میدانوں میں کبھی نہ گونجے گی۔ لاکھوں بار لعنت ہو ان رہنماؤں پر، اور ان کی آئندہ سات پشتوں پر جنھوں نے اس خوبصورت پنجاب، اس البیلے، پیارے سنہرے چناب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے اور اس کی پاکیزہ روح کو گہنا دیا تھا اور اس کے مضبوط جسم میں نفرت کی پیپ بھر دی تھی، آج پنجاب مر گیا تھا۔ اس کے نغمے گنگ ہو گئے تھے۔ اس کے گیت مردہ۔ اس کی زبان مردہ۔ اس کا بے باک نڈر، بھولا بھالا دل مردہ اور نہ محسوس کرتے ہوئے اور آنکھ اور کان نہ رکھتے ہوئے بھی میں نے پنجاب کی موت دیکھی اور خوف سے اور حیرت سے میرے قدم اس پٹری پر رک گئے۔

پٹھان مردوں اور عورتوں کی لاشیں اٹھائے جاٹ اور سکھ اور ڈوگرے اور سرحدی ہندو واپس آئے اور میں آگے چلی۔ آگے ایک نہر آتی تھی، ذرا ذرا وقفے کے بعد میں روک دی جاتی۔ جونہی کوئی ڈبہ نہر کے پل سے گزرتا لاشوں کو عین نیچے نہر کے پانی میں گرا دیا جاتا۔ اس طرح جب ہر ڈبے کے رکنے کے بعد سب لاشیں پانی میں گرا دی گئیں تو لوگوں نے دیسی شراب کی بوتلیں کھولیں اور میں خون اور شراب اور نفرت کی بھاپ اگلتی ہوئی آگے بڑھی۔

لدھیانہ پہنچ کر لٹیرے گاڑی سے اتر گئے، اور شہر میں جا کر انھوں نے مسلمانوں کے محلوں کا پتہ ڈھونڈ نکالا اور وہاں حملہ کیا اور لوٹ مار کی اور مال غنیمت اپنے کاندھوں پر لادے ہوئے تین چار گھنٹوں کے بعد اسٹیشن پر واپس آئے۔ جب تک لوٹ مار نہ ہو چکتی، جب تک دس بیس مسلمانوں کا خون نہ ہو چکتا۔ جب تک سب مہاجرین اپنی نفرت کو آلودہ نہ کر لیتے۔ میرا آگے بڑھنا دشوار کیا ناممکن تھا۔ میری روح میں اتنے گھاؤ تھے اور میرے جسم کا ذرہ ذرہ گندے ناپاک خونیوں کے قہقہوں سے اس طرح رچ گیا تھا کہ مجھے غسل کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس سفر میں کوئی مجھے نہانے نہ دے گا۔

انبالہ اسٹیشن پر رات کے وقت میرے ایک فرسٹ کلاس کے ڈبے میں ایک مسلمان ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی اور بچے سوار ہوئے، اسی ڈبے میں ایک سردار صاحب اور ان کی بیوی بھی تھے، فوجیوں کے پہرے میں مسلمان ڈپٹی کمشنر کو گاڑی میں سوار کر دیا گیا اور فوجیوں کو ان کی جان و مال کی سخت تاکید کر دی گئی۔

رات کے دو بجے میں انبالہ سے چلی اور دس میل آگے جا کر روک دی گئی۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ اندر سے بند تھا۔ اس لیے کھڑکی کے شیشے توڑ کر لوگ اندر گئے اور ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو قتل کیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر کی ایک نوجوان لڑکی تھی، اور بڑی خوبصورت وہ کسی کالج میں پڑھتی تھی۔ دو ایک نوجوانوں نے سوچا اسے بچا لیا جائے۔ یہ حسن، یہ رعنائی، یہ تازگی، یہ جوانی کسی کے کام آسکتی ہے، اتنا سوچ کر انھوں نے جلدی سے لڑکی اور زیورات کے بکس کو سنبھالا اور گاڑی سے اتر کر جنگل میں چلے گئے۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔

یہاں یہ کانفرنس شروع ہوئی۔ لڑکی کو چھوڑ دیا جائے یا مار دیا جائے۔

لڑکی نے کہا۔ مجھے مارتے کیوں ہو؟ مجھے ہندو کر لو، میں تمھارے مذہب میں داخل ہوئی جاتی ہوں۔ تم میں سے کوئی ایک مجھ سے بیاہ کرے میری جان لینے سے فائدہ؟

دوسرے نے قطع کلام کرتے ہوئے اور لڑکی کے پیٹ میں چھرا بھونکتے ہوئے کہا۔ میرے خیال میں اسے ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔ چلو گاڑی میں واپس چلو۔ کیا کانفرنس لگا رکھی ہے تم نے......

لڑکی جنگل میں گھاس کے فرش پر تڑپ تڑپ کر مر گئی، اس کی کتاب اس کے خون سے تربتر ہو گئی، کتاب کا عنوان تھا۔ ''اشتراکیت عمل اور فلسفہ از جان سٹریچی'' وہ ذہین لڑکی ہو گی۔ اس کے دل میں اپنے ملک و قوم کے خدمت کے ارادے ہوں گے، اس کی روح میں کسی سے محبت کرنے، کسی کو چاہنے، کسی کے گلے لگ جانے، کسی بچے کو دودھ پلانے کا جذبہ ہوگا۔ وہ لڑکی تھی، وہ ماں تھی، وہ بیوی تھی، وہ محبوبہ تھی، وہ کائنات کی تخلیق کا مقدس راز تھی، اور اب اس کی لاش جنگل میں پڑی تھی، اور گیدڑ اور گدھ اور کوے اس کی لاش کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔

اشتراکیت، فلسفہ اور عمل، وحشی درندے انھیں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے اور کوئی نہیں بولتا اور کوئی آگے نہیں بڑھتا اور کوئی عوام میں سے انقلاب کا دروازہ نہیں کھولتا۔ اور میں رات کی تاریکی میں آگ اور شراروں کو چھپا کے آگے بڑھ رہی ہوں اور میرے ڈبوں میں لوگ شراب پی رہے ہیں اور مہاتما گاندھی کے جے کارے بلا رہے ہیں۔

ایک عرصے کے بعد میں بمبئی واپس آئی ہوں۔ یہاں مجھے نہلا دھلا کر شیڈ میں رکھ دیا گیا ہے۔ میرے ڈبوں میں اب شراب کے بھپارے نہیں ہیں۔ خون کے چھینٹے نہیں ہیں۔ وحشی خونی قہقہے نہیں ہیں، مگر رات کی تنہائی میں جیسے بھوت جاگ اٹھتے ہیں۔ مردہ روحیں بیدار ہو جاتی ہیں اور زخمیوں کی چیخیں اور عورتوں کی بین اور بچوں کی پکار، ہر طرف فضا میں گونجنے لگتی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ اب مجھے کبھی کوئی اس سفر پر نہ لے جائے۔ میں اس شیڈ سے باہر نہیں نکلنا چاہتی۔ میں اس خوفناک سفر پر دوبارہ نہیں جانا چاہتی۔ اب میں اس وقت جاؤں گی جب میرے سفر پر دو طرفہ سنہرے گیہوں کے کھلیان لہرائیں گے اور سرسوں کے پھول جھوم جھوم کر پنجاب کے رسیلے الفت بھرے گیت گائیں گے اور کسان ہندو اور مسلمان دونوں مل کر کھیت کاٹیں گے۔ بیج بوئیں گے، ہرے ہرے کھیتوں میں نلائی کریں گے اور ان کے دلوں میں مہر و وفا اور آنکھوں میں شرم اور روحوں میں عورت کے لیے پیار اور محبت اور عزت کا جذبہ ہوگا۔

میں لکڑی کی ایک بے جان گاڑی ہوں۔ لیکن پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ اس خون اور گوشت اور نفرت کے بوجھ سے مجھے نہ لادا جائے، میں قحط زدہ علاقوں میں اناج ڈھوؤں گی، میں کوئلہ اور تیل اور لوہا لے کر میں جاؤں گی۔ میں کسانوں کے لیے نئے ہل اور نئی کھاد مہیا کروں گی، میں اپنے ڈبوں میں کسانوں اور مزدوروں کی خوش حال ٹولیاں لے کر جاؤں گی اور باعصمت عورتوں کی میٹھی نگاہیں اپنے مردوں کا دل ٹٹول رہی ہوں گی اور ان کے آنچلوں میں ننھے منے خوبصورت بچوں کے چہرے کنول کے پھولوں کی طرح کھلے نظر آئیں گے اور وہ اس موت کو نہیں بلکہ آنے والی زندگی کو جھک کر سلام کریں گے۔ جب نہ کوئی ہندو ہوگا نہ مسلمان بلکہ سب مزدور ہوں گے اور انسان ہوں گے!

■

مصنف: ہارون خاں شیروانی   مترجم: رحم علی الہاشمی

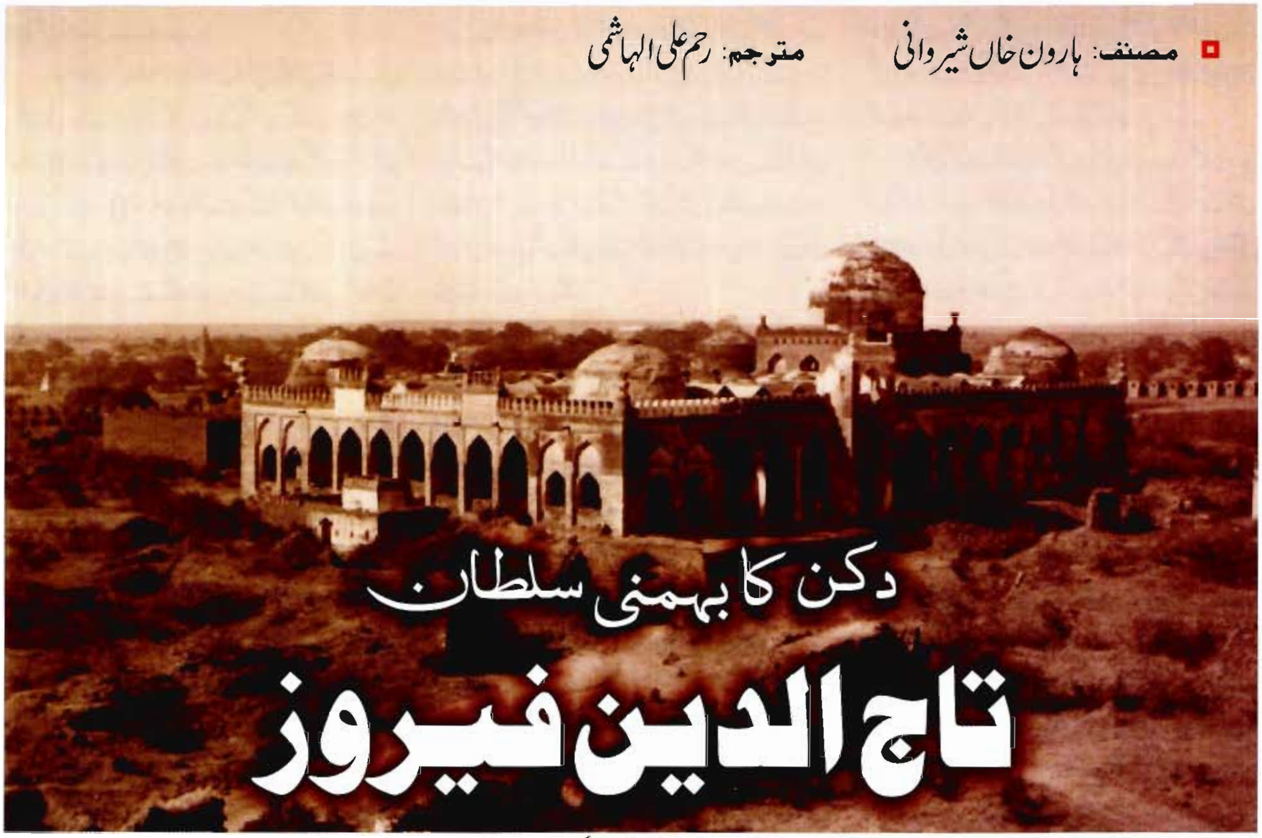

دکن کا بہمنی سلطان
تاج الدین فیروز

24 صفر 1800ھ (16 نومبر 1397) کو جب فیروز تخت نشین ہوا تو وہ ادھیڑ عمر سے اوپر ہو چکا تھا اور اس میں شک نہیں کہ بہمنی سلطنت کے عناصر ترکیبی میں توازن قائم کرنے کے روز افزوں دقت طلب کام کو اس نے پوری ذمے داری اور سوجھ بوجھ کے احساس کے ساتھ شروع کیا۔ اس نے تغلق چین تک ترک کے اقتدار کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کی جو دکھن کے قدیم امرا و شرفا کے لیے دردسر ہو رہا تھا۔ لیکن ایک آدمی کے زوال سے مسئلہ حل نہیں ہو گیا۔ اب ایران اور بیرون ملک سے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا تھا جس کی سلطان اپنے خسر محمد دوم کی روایت کو قائم رکھنے کے لیے ہمت افزائی کرتا تھا یعنی دکھن کو مشرق میں تمدن کا گہوارہ بنانا اور اس مقصد میں شمال کی رقیب سلطنت دہلی کے زوال پذیر ہونے سے نسبتاً زیادہ آسانی ہو گئی تھی۔ شاید ایران اور عراق کے اثرات کا توڑ کرنے کے لیے اس نے یہ جرأت مندانہ اقدام کیا کہ آبادی کے ہندو عنصر کو حکومت کی ذمے داریاں سنبھالنے میں شریک کیا اور شاید اُسی نے سب سے پہلے برہمنوں کو بڑے عہدوں پر مقرر کیا اس لیے کہ ہندوؤں میں غالباً یہی طبقہ تعلیم یافتہ تھا کھیرلا کے نرسنگھ نے جب ہتھیار ڈال دیے تو فیروز نے اسے بہمنی سلطنت کا امیر بنا دیا اور اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مورث بہمن شاہ کے نقش قدم پر چل کر دکھن کے ہندو امرا کو دوست بنانا چاہتا تھا۔ اُس نے اِس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور وہ پہلا شخص تھا جس نے نہ صرف وجے نگر اور کھیرلا کے پڑوسی شاہی خاندانوں سے بلکہ عوام ہندو خاندانوں سے رشتہ مناکحت قائم کیا۔

اس سلسلے میں دو ایک اور باتیں ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کونڈا ویڈو کے ویما ساون اور نلگنڈہ کے ویلا ماون میں مسلسل جھگڑا رہتا تھا اور دکھن میں جو جذبہ کارفرما تھا اس کی بنا پر ویلا ماون نے اپنے دشمن ویما ساون کے خلاف فیروز کی حمایت کا خیر مقدم کیا اور ویما ساون نے اپنی مدد پر وجے نگر کے رائے کو بلایا۔ ظاہر ہے کہ مذہبی عناد کی جو خلش بہمنی وجے نگر کے تعلقات میں تھی وہ دور ہو رہی تھی اور مشرق کے بعض ریڈلون نے وجے نگر کے خلاف سلطان کا ساتھ دیا اور وجے نگر کا رائے تلنگانہ پر اسی طرح حملہ کر رہا تھا جیسے وہ بہمنی سلطنت پر چڑھائی کر رہا ہو۔ ہندوؤں سے فیروز کے خوشگوار تعلقات کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ سدھو نے ساگر پر بغاوت کو فرو کرنے میں مدد دی اور اس کے لڑکے بھیروں سنگھ کو مدھول اور چوراسی گاون کی جاگیر 25 ربیع الثانی 1800ھ (15 جنوری 1398) کو دی گئی۔

بادشاہ کی علمیت

ہندوستان کے حکمرانوں میں فیروز کا شمار فاضل ترین بادشاہوں میں ہوتا ہے اور دوسرے ذی علم بادشاہ محمد تغلق کے مقابلے میں یہ کمتر نہ تھا۔ عمدہ خوش نویس ہونے کے علاوہ وہ تفسیر قرآن، اصول قانون، حکمت و فلسفہ، صوفی مصطلحات، مکتبی فلسفہ، اقلیدس، فن مناظرہ اور ریاضیات میں بھی ماہر تھا اور علوم کے ہر شعبے سے دلچسپی رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے ہر ہفتہ میں تین دن ان علوم میں خود باضابطہ تعلیم دینے کے لیے مخصوص کر لیے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنے فاضل خسر محمد دوم اور اپنے استاد ملا فضل اللہ انجو سے جو تربیت حاصل کی تھی اس کی بنا پر اس نے علم و فضل میں نام پیدا کیا۔ وہ ایک ممتاز شاعر بھی تھا اور عروجی اور فیروز تخلص رکھتا تھا اور اس کے اشعار جو فرشتہ اور برہان نے کہیں کہیں نقل کیے ہیں ان سے اُس کی علمی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ تعمیر عامہ کے سلسلے میں اس نے جو کام کیے وہ دولت آباد کے قریب پہاڑی سلسلہ پر 810ھ (1408) میں بالا گھاٹ کے نام سے ایک رصدگاہ کی تعمیر تھی جس کے لیے سید محمود گرزدنی اور حکیم حسن گیلانی کو مامور کیا گیا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ حکیم حسن گیلانی کی قبل از وقت وفات سے

اس کی تکمیل نہ ہوسکی۔

اس کی زبان دانی کی قابلیت کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ فرشتہ نے اُس کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ اگر معتبر ہیں تو فیروز نہ صرف عربی، فارسی اور ترکی زبانوں ہی سے خوب واقف تھا بلکہ تلنگی، کنڑی، مرہٹی، گجراتی، بنگالی اور کئی اور زبانیں بھی جانتا تھا اس حد تک کہ جن لوگوں کی یہ مادری زبان تھی، ان سے انھیں کی زبانوں میں بلاتکلف گفتگو کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی کئی بیویاں اور زنانے میں بہت سی عورتیں مختلف قوموں اور نسلوں کی تھیں اور ہر ایک کے پاس اسی قوم کی باندیاں تھیں اور سلطان ان سب سے انھیں کی مادری زبان میں گفتگو کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی شہوانی قوت بہت زبردست تھی مگر اسلام کے اصول یعنی ایک شادی یا مخصوص حالات میں محدود تعداد کی شادیوں کی اجازت کی وجہ سے وہ مجبوراً ان جذبات کو دبائے رکھتا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ آبادی کے متضاد عناصر میں توازن قائم کرنے کے لیے رسمی اخلاق کی شادیوں کو ضروری سمجھتا ہو۔ بہرنوع اسے سخت فکر تھی کہ اپنے طرزِ عمل کو شرع کے مطابق کس طرح قائم رکھے اور اس نے اپنے استاد میر فضل اللہ انجو سے مشورہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ایران اور عراق سے شیعہ تعلیمات دکھن میں نفوذ کر رہی تھیں اور اگرچہ خود بادشاہ سنی تھا مگر ممکن ہے کہ میر فضل اللہ شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتا ہو۔ چنانچہ اس نے بادشاہ سے کہا کہ شیعہ مذہب میں متعہ یا عارضی شادی کی اجازت ہے اور بادشاہ کے لیے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی یہی صورت ہے کہ اپنے اعمال و اطوار اور عبادات وغیرہ میں تو وہ سنی رہے لیکن شیعہ مذہب کے متعہ کے اصول کو قبول کر لے۔ سلطان کو یقیناً اس تجویز سے خوشی ہوئی ہوگی اور اس نے عارضی شادیاں کر کے اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیا۔ اس کے محل کا عملہ بہت وسیع تھا جس کی سربراہی محمد دوم کی لڑکی ملکہ دکھن کے ہاتھ میں تھی۔ اس میں نہ صرف ہر قوم کی عورتیں تھیں بلکہ ہر مذہب کی بھی۔ مذہب کے احترام کا اسے اتنا لحاظ تھا کہ وہ شاید حرم کی یہودی اور عیسائی عورتوں کی تشفی کے لیے عہدِ قدیم اور عہدِ جدید کی انجیل پڑھا کرتا تھا۔

کلچرل اثرات

بہمنی سلطنت میں اکیلا سلطان ہی ہندو کلچر سے متاثر نہ تھا بلکہ ہم درباری قاضی سراج کے واقعہ سے دیکھتے ہیں (جس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علوم اسلامی کا عالم تھا یا کم از کم علما کے طبقے سے تعلق رکھتا تھا) کہ جنوب کے مسلمانوں نے فنون اور موسیقی کی روایات میں ہندو اثرات کو کس حد تک قبول کر لیا تھا۔ یہ واقعہ ہمارے لیے دلچسپ ہے کہ قاضی سراج ہندو فقیر کے بھیس میں وجے نگر کے کیمپ کے اندر تک جا سکتا تھا اور وہاں بغیر اپنی اصلی شخصیت ظاہر کیے بلا تکلف مقامی زبان میں گفتگو کر سکتا تھا۔ 810ھ (1408) میں سلطان کی دیورائے کی لڑکی سے شادی کا لازمی نتیجہ بہمنی سلطنت میں ثقافتی ردِعمل کی شکل میں ظاہر ہوا ہوگا اور فیروز کو کلچرل عوامل کے امتزاج میں مدد ملی ہوگی جو اس کا عزیز ترین مقصد تھا اور اس کی علامت یہ تھی کہ سلطان سوار ہو کر بے دھڑک وجے نگر کے شہر میں گیا اور رائے کے محل میں تین دن معزز مہمان کی حیثیت سے قیام کیا۔ بہمنی دربار میں ہندو کلچر کے اس براہِ راست اثر کے ماسوا آبادی کے اندر دونوں مذہبوں میں باہمی خلا ملا ہوا ہوگا اس لیے کہ تجارت بیشتر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو تاجر باہر کے ملکوں سے کاروبار کرتے تھے اور بہمنی حکمراں کے لیے 'اُرمز کے گھوڑے، سیلون کے ہاتھی اور چین کی مشک اور سمور' مہیا کرتے تھے۔

فرشتہ نے جو تفصیلی حال باریک بینی کے ساتھ فیروز کے حرم کا لکھا ہے اور میر فضل اللہ انجو کی فہمایش کی تمہید سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیروز کس حد تک ان عوامل سے متاثر تھا جو آہستہ آہستہ مگر قطعیت کے ساتھ بہمنی سلطنت میں نمایاں ہو رہے تھے۔ اگرچہ وہ یقیناً ہندو آبادی سے مصالحت کا خواہاں تھا مگر اسی کے ساتھ اس کی یہ بھی بہت بڑی خواہش تھی کہ دکھن کو ان بہترین چیزوں کا مرکز بنا دے جو مشرقی ایشیا میں مل سکتی ہیں۔ وہ گوا اور دابول سے ہر سال بہمنی جہاز تجارت کے لیے بیرونی ممالک بھیجا کرتا تھا اور اسی کے ساتھ خاص طور پر یہ ہدایت کرتا تھا کہ بہمنی سفرا کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ سلطان کو کوئی تحفہ ایک ذی علم آدمی سے زیادہ پسند نہیں ہے۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ اس کا یہ فرض ہے کہ تمام ممالک سے زیادہ سے زیادہ ذی علم اور نیک کردار لوگوں کو بلا کر دکھن میں جمع کرے تا کہ اس وقت کی دنیا کے بہترین تجربات اس کی مرضی پر حاصل ہو سکیں۔ یہی مقصد تھا کہ دکھن میں مولانا لطف الدین سبزواری، حکیم حسن گیلانی، سید محمود گرزدنی اور اس طرح کے بہت سے ممتاز افراد ایران اور ساحل کیپین کے دوسرے ممالک سے آ کر جمع ہو گئے۔ ان نو واردوں کا ہمیشہ اُس کے دربار میں خیر مقدم ہوتا تھا اور وہ بے تکلفی کے ساتھ ان سے خلا ملا پسند کرتا تھا۔ اگرچہ دربار میں اُسے شاہی وقار کا بڑا خیال رہتا تھا تا کہ لوگ اس کی قوت و سطوت کو محسوس کریں۔

وہ کہتا تھا کہ دربار کے بعد وہ ایک معمولی آدمی سے بہتر نہیں ہوتا اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اہلِ علم اس سے بے تکلفی کے ساتھ نہ ملیں۔ دراصل وہ شام کا ایک حصہ اس لیے مخصوص رکھتا تھا کہ شعرا، اہلِ علم، داستان گو وغیرہ سے گھل مل کر بات چیت کرے۔ اس وقت وہ نہایت سادے لباس میں ملبوس ہوتا تھا اور صرف ایک ادب سب کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا کہ اس کے سامنے کوئی کسی کے پیٹھ پیچھے برائی نہ کرے۔

بیرونی اثر کئی اور بہت سی باتوں میں ظاہر ہوتا تھا۔ بادشاہ کو کربلا، نجف اور مدینہ منورہ کے مساوات کی طرف خاص توجہ تھی یہاں تک کہ اُس نے پرانا بہمن شاہ کا چاندی کا تخت (جو رائے تلنگانہ کے محمد اوّل کو تخت فیروز نذر کرنے سے پہلے استعمال ہوتا تھا) توڑ وا کر اس کی قیمت ضرورمند سادات اور دوسرے متقی لوگوں میں تقسیم کرنے کے لیے ملک کے باہر بھیج دی۔

تعمیرات

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے فیروز نے بیرونی اثرات کا توڑ کرنے کے لیے ہندوؤں کو نظم و نسق کے کاموں میں شریک کیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ دکھن کے کلچر اور فنِ تعمیر میں ہندو اثرات کا نفوذ بڑی حد تک نمایاں ہے۔ یہ ایرانی، ہندو اور دہلوی اسلوبوں کا امتزاج تھا جس نے فیروز کے مقبرہ کو 'گلبرگہ کی شاندار ترین یادگار بنا دیا۔

اگرچہ یہ مقبرہ (بلکہ دو مقبرے بالکل یکساں ایک دوسرے سے متصل) یک منزلہ ہے لیکن باہر سے دو منزلہ عمارت معلوم ہوتی ہے جس میں کئی محرابیں ایک دوسرے کے سہارے مسلسل ہیں اور اوپری محرابوں میں پتھر کے کٹاؤ کا آرائشی کام ہے۔ ہمیں یہ ایرانی بہمنی ملے جلے طرز کی محرابیں معلوم ہوتی ہیں جن کے دروازوں کے دونوں طرف ہندو طرز کے بازو ہیں اور چھجے کو سنبھالے ہوئے جو دیوار گیریاں وہ دکھن کے ہندو مندروں کی دیوار گیریوں سے مشابہ ہیں۔ گچ کی استرکاری اور پلاستر کا بھاری کٹاؤ کا کام جو شاید ایرانی نمونے کا ہے، محرابوں کے اوپر ان کے درمیانی حصے میں اور مقبرہ کے اندر بنا ہوا ہے۔ اگرچہ تغلق طرز کی ڈھلوان دیواریں غائب ہیں لیکن ایک گنبد کے

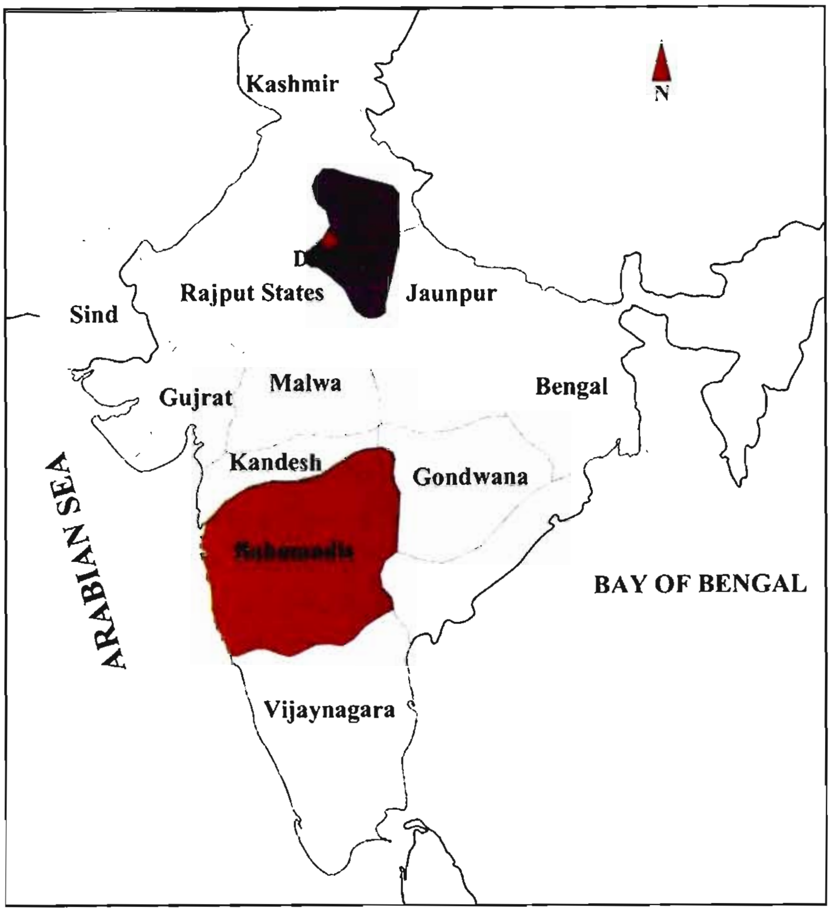

اندرونی حصے میں مجوف نالیاں جو باریک کتبہ کی دھاریوں سے مزین ہیں دہلی کے قطب مینار کی بیرونی آرایش کے مشابہ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پتھر کی جالیاں جو اوپری محرابوں کی آرایش ہیں وہ مخروطی شکل کی ہیں جو چوکھٹے کے تقریباً تہائی حصہ پر حاوی ہیں یہ اسی نمونہ کی ہیں جو فیروز آباد میں اور آخری دو بہمنیوں کے مقبروں میں اور دکھن کے دوسرے مقامات پر نظر آتی ہیں۔

فیروز کا مقبرہ ایک چھوٹے پیمانے پر فن تعمیر کا شاہکار کہا جاسکتا ہے لیکن اس کی حیرت میں ڈالنے والی تعمیرات میں تنہا یہی نہیں ہے۔ اپنی کثیر التعداد عارضی اور مستقل بیویوں کے لیے اس نے دریائے بھیما پر ایک بڑا شہر تعمیر کیا ''جس میں کشادہ اور سیدھی سڑکیں، خوبصورت دوکانیں اور بازار ہیں'' اور دریا سے پانی محل کے اندر تک پہنچایا گیا ہے۔ ایک دوسرے اور عظیم تر حکمران فتح پور سیکری کے بانی کی طرح اس نے فیروز آباد کو عملاً اپنا دارالسلطنت بنالیا۔ فیروز آباد کی تعمیرات فن تعمیر میں اپنی آپ مثال ہیں جن کے انوکھے تعمیری منصوبے دکھن کے باہر کہیں اور نہیں نظر آتے جیسا کہ مسٹر من نے ناظم آثار قدیمہ حیدر آباد دکن کو ایک خط میں لکھا ہے: ''اصل خصوصیت گنبد اور مخروطی چھت کا ملا جلا استعمال ہے جو میں نے سب سے پہلے چھوٹے پیمانے پر گلبرگہ کے قلعہ کے اندر کے بازار میں دیکھا جو جامع مسجد سے ذرا فاصلہ پر ہے۔ باوجود امتداد زمانہ کے جو اس وقت سے اب تک گزر چکا ہے، جب کہ فیروز فیروز آباد میں مجمع خواتین کا سربراہ تھا ہمیں اب بھی بہت کچھ ملتا ہے جس سے ہم اس کی سابقہ شان و شوکت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ شہر کے چار بڑے پھاٹک، دیوان خاص اور کنجی محل جس کے گرد حرم شاہی کے کمرے ہیں، مسافر خانہ، زنانخانہ کے محرابی کمرے، غسل خانے، نام نہاد باورچی خانہ اور مسجد، ان سب سے فیروز کی فن تعمیر میں جدت کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے گنبد اور مخروطی میناروں کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ مثلاً نام نہاد باورچی خانہ کی چھت پر ایک بڑا گنبد اور چاروں طرف چار مخروطی مینار ہیں۔ چھتوں پر نیچی دیواریں بھی بالکل نئے طرز کی ہیں نیز وہ چھوٹے چھوٹے مینار جو کناروں پر ہیں۔ چھت کے اندر کی طرف بڑی افراط سے آرایش اور مخروطی نقش و نگار ہیں۔'' مسجد میں داخلہ کا دروازہ ''بہمنی طرز تعمیر کا بہت عمدہ نمونہ ہے۔'' خود مسجد 200x350 فٹ کی ہے جس کے چاروں طرف محراب دالان ہیں جن کے مغربی سرے پر کبھی مخروطی آرایش کے گنبد تھے۔ گنبد اور مخروطی مینار جیسا کہ مسٹر من کا بیان ہے گلبرگہ کے پھاٹک کے قریب بازار اور رائچور قلعہ کے پھاٹک کی چھتری، دیوگیر اور دیگر مقامات پر بھی ملتے ہیں۔

گلبرگہ کے ولی اللہ

اس عہد کے خالص سیاسی پہلو پر نظر ڈالنے سے پیشتر حضرت سید محمد گیسو دراز ولی اللہ کی گلبرگہ میں آمد کا ذکر ضروری ہے جس کا دکھن کے لوگوں پر بہت بڑا اثر ہوا اور اہم نتائج ظہور پذیر ہوئے۔ حضرت کے خاندان کا دکھن سے تعلق پہلے سے تھا جب کہ وہ تقریباً 805ھ (1401) میں گلبرگہ وارد ہوئے اس لیے کہ آپ کے والد سید یوسف محمد تغلق کے عہد میں دولت آباد آئے تھے اور 20 رمضان 725ھ (30 اگست 1325) کو خلد آباد میں فوت ہوئے۔ خود حضرت گیسو دراز 4 رجب 721ھ (30 جنوری 1331) کو دہلی میں پیدا ہوئے اور جب وہ گلبرگہ تشریف لائے تو ان کی عمر نوے سال سے اوپر تھی۔ یہاں 819ھ (1413) میں وہ قلعہ گلبرگہ کی جامع مسجد کے قریب اپنے کثیر التعداد مریدوں کے ساتھ ایک خوبصورت خانقاہ میں مقیم ہوگئے۔ اُس وقت فیروز دارالسلطنت سے باہر تھا لیکن واپسی پر جب اس نے سنا تو امرا اور اعلیٰ حکام کو ساتھ لے کر انھیں سلامی دینے حاضر ہوا جب کہ انھوں نے اہلِ علم طبقہ میں خاص مقبولیت حاصل کرلی تھی جن کا لوگوں میں بڑا اثر تھا اور بہت جلد گلبرگہ میں مریدوں کا ایک حلقہ پیدا کرلیا تھا۔ فیروز نے حضرت کو ان کی اور ان کے ہمراہیوں کی گزر اوقات کے لیے کئی گاؤں وقف کیے۔ لیکن حضرت نے فیروز کے ذہن پر جو اثر ڈالا تھا وہ جلد ہی ختم ہوگیا اور سلطان چونکہ خود ذی علم تھا اس لیے ان کی خالص ادبی استعداد پر شبہ کرنے لگا۔ کھنچاؤ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ بادشاہ نے انھیں پیام بھیجا کہ چونکہ ان کی قیام گاہ شاہی محل کے بہت قریب ہے اور ان کے یہاں قوالیوں اور مریدوں کی بلند آواز نے تعلیم کا شور وغل ہوتا ہے اس لیے وہ کہیں اور چلے جائیں۔ چنانچہ آپ وہاں سے اٹھ کر اس مقام پر چلے آئے جہاں اب آپ کا مزار ہے اور جو اب تک دکھن کے ہندو اور مسلمانوں کے احترام و تقدس کا مرجع ہے۔ جیسا کہ بعد کو معلوم ہوگا اس کھنچاؤ کے بہت ہی اہم نتائج سامنے آئے۔

سیاسی حالات

وجے نگر

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے فیروز نے اپنے بھائی احمد خاں کو خان خاناں کا خطاب دیا تھا اور اپنے استاد میر فضل اللہ انجو کو ملک نائب اور وکیل یا وزیر اعظم کا اور شاید غیر ملکی اثر کا توڑ کرنے کے لیے اور نیم ہندو آبادی کو ملانے کے لیے کئی برہمنوں کو معزز اور ذمے داری کے عہدوں پر مقرر کیا۔

فیروز کی طویل حکومت کی تقریباً ساری مدت ہمسایہ سلطنت وجے نگر سے کش مکش میں صرف ہوئی اور یہ کش مکش وجے نگر کے رائے کی طرف سے شروع ہوئی۔ اس کی تخت نشینی کے تھوڑے ہی دن بعد 1398 میں جنوب مغرب میں ساگر کے زمینداروں کی بغاوت آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ان زمینداروں نے دارالسلطنت کی ہلچل سے فائدہ اٹھایا اور بہمنی فوج کو قلعہ سے نکال دیا، نیز شمال میں کھیرلا کے نرسنگھ دیو نے بہمنی اقتدار کے خلاف بغاوت کر دی اور مانڈو اور اسیر کے حکمرانوں کی مدد اور وجے نگر کے رائے کی شہہ سے اس نے ماہور تک سارے علاقہ پر چھاپہ مارا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فیروز نے پہلے ساگر کا رخ کیا اور کچھ شدید جنگ کے بعد جس میں انا دیو ویلاما جسے ریڈیوں نے ملک سے نکال دیا تھا اور اُس نے فیروز سے مدد مانگی تھی اور نیز مقامی حاکم سدھو بہمنی افواج کے شانہ بشانہ باغیوں کے خلاف لڑے اور سدھو جنگ میں قتل بھی ہو گیا۔ ساگر کی بغاوت 25 ربیع الثانی 800ھ (15 جنوری 1398) سے پہلے دبا دی گئی اور سدھو کے لڑکے بھیرون سنگھ کو مدھول اور ضلع رائے باغ کے چوراسی گاؤں کی جاگیر دی گئی۔

شمال کی طرف کی مہم فیروز نے اُس وقت تک کے لیے ملتوی کر دی جب تک کہ وہ وجے نگر سے نہ نپٹ لے۔ شہزادہ بکا نے اس اثنا میں وجے نگر کی بہت بڑی فوج جمع کر لی تھی جس میں منجملہ دوسرے سامان کے 80000 تیر انداز اور بندوقچی تھے۔ اس فوج کے ساتھ اس نے تنگ بھدرا کو عبور کیا اور پھیلاؤ کیس ساتھ بیک وقت مدگل، رائچور اور دوآبہ کے دوسرے بہمنی مقبوضات نیز تلنگانہ پر چڑھائی کر دی۔ تلنگانہ کے ویلاما حکمراں محمد اوّل کے وقت سے عہد نامہ کے ذریعے سے بہمنیوں کے حلیف تھے۔ دوسری طرف بکا کی مدد پر راجہ سندری کا پتا ویما تھا اور چونکہ فیروز کی اصل فوج رائچور کے دوآبہ کے دفاع میں مصروف تھی اِس لیے بکا کی جو فوج تلنگانہ کی طرف بڑھتی تھی۔ اُس نے بہ آسانی دشمن کو شکست دے دی۔ شمال میں کھیرلا کی طرف کا حملہ بھی موثر ہوا اور سلطان کو مجبوراً برار اور دولت آباد کی فوج کو شمال کی طرف بھیجنا پڑا۔ اب بارش شروع ہو گئی تھی اور کرشنا ندی سیلاب پر تھی اس لیے فریقین میں سے کسی کو بھی اسے عبور کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اور دریا کے کنارے ایک طرح کی بے بسی مسلط تھی۔ چونکہ اس مشکل کو حل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی اس لیے فیروز کے ساتھیوں میں سے ایک

باکمال درباری مسمی قاضی سراج کو ایک نئی چال سوجھی وہ یہ کہ چند آدمیوں کے ساتھ رات کی تاریکی میں وجے نگر کے کیمپ میں گھس کر رائے کے لڑکے کو قتل کر دیا جائے۔ قاضی سراج نے سات آدمی ساتھ لیے اور مخبوط الحواس فقیروں کے بھیس میں کسی نہ کسی طرح وجے نگر کے کیمپ میں داخل ہو گئے۔ سلطان سے انھوں نے یہ استدعا کی کہ چار پانچ ہزار کا منتخب رسالے کا دستہ تیار رہے جو دوسری طرف سے شور وغل ہونے پر فوراً وہاں پہنچ جائے۔ قاضی سراج اور ان کے آدمی وجے نگر کے کیمپ میں پہنچ کر اُس خیمے میں گئے جو ناچنے والیوں اور طوائفوں کے لیے مخصوص تھا اور ان میں سے ایک کے ساتھ 'عشق کی پینگ بڑھائی'۔ شام کے وقت انھوں نے دیکھا کہ ایک طوائف کپڑے اور زیور سے آراستہ ہو کر شاہی کیمپ میں جانے کی تیاری کر رہی ہے اور قاضی سراج نے اس کی خوشامد کی کہ اسے بھی ساتھ لے چلے اس لیے کہ اس نے کبھی شاہی کیمپ نہیں دیکھا ہے لیکن طوائف نے کہا کہ وہاں صرف گانے بجانے والے جا سکتے ہیں جس پر بنے ہوئے فقیر نے طبلہ بجا کر اسے سنایا کہ اسے اس کی اچھی مشق ہے۔ طوائف اتنا خوش ہوئی کہ وہ نہ صرف قاضی سراج کو بلکہ اس کے سب ساتھیوں کو اپنے ساتھ شاہی کیمپ میں لے گئی۔ جلسہ ناچ سے شروع ہوا اس کے بعد گانا ہوا اور کچھ نقلیں جس میں سراج اور اس کے ساتھیوں نے بھی حصہ لیا۔ جس وقت سب لوگ جشن منا رہے تھے اور شاہزادہ اور اس کے ساتھی شراب کے نشہ میں بدمست تھے تو سراج کے دو آدمی آگے بڑھے اور شہزادے کے خنجر بھونک دیا جو وہیں مر گیا۔

وجے نگر کے کیمپ میں ہلچل مچ گئی اور چونکہ رات سخت تاریک تھی اور خیمہ کی روشنیاں گل کر دی گئیں اس لیے سراج اور اس کے ساتھی اندھیرے میں نکل بھاگے اور پکڑے نہ جا سکے۔ اس اثنا میں فیروز نے تین چار ہزار سپاہی گھوڑوں پر اور بید کی تیرنے والی ٹوکریوں پر روانہ کر دیے تھے جو دریا پار کر کے وہاں پہنچ گئے۔ سلطان نے خود صبح ہوتے ہی دریا پار کیا اور پسپا ہوتی ہوئی فوج کا وجے نگر کے پھاٹک تک تعاقب کیا اور فضل اللہ انجو اور خان خاناں کو جنوبی صوبوں کی طرف روانہ کر دیا۔

ہری ہردوم نے فوراً ہتھیار ڈال دیے اور ملک نائب سے صلح کی گفت وشنید شروع کر دی جو بظاہر جنوب کے صوبوں کو تاراج کر کے واپس آ گیا تھا۔ معاہدہ لکھا گیا جس کے بموجب بہمنی سلطان نے تمام گرفتار شدہ قیدیوں کو چھوڑ دیا اور اس شرط پر وجے نگر سے واپس جانے کا وعدہ کیا کہ ہری ہر دس لاکھ ہُن شاہی خزانہ میں داخل کرے اور ایک لاکھ ہُن ملک نائب کو گفت وشنید کامیابی سے انجام دینے کے صلہ میں نذر کرے۔ صفدر خاں کے لڑکے فولاد خاں کو رائچور دوآبہ کا گورنر مقرر کر کے سلطان دارالسلطنت کی طرف واپس ہوا۔

اب ان لوگوں کی باری آئی جنھوں نے پچھلی مہم میں بہمنیوں کے پشت میں چھرا بھونکنے کی کوشش کی تھی۔ ساگر میں پہلے ہی تسلط ہو چکا تھا اور شروع 802ھ (1399) میں سلطان اس قلعہ میں گیا جہاں اُس نے

مقامی رئیسوں اور رایوں کی سلامی لی اور ساگر کا نام بدل کر نصرت آباد رکھا۔ یہیں اس نے ہری ہر کی طرف سے 33 لاکھ ٹنکہ کا سالانہ خراج وصول کیا۔ واپسی میں کچھ دن بھیما کے کنارے قیام کیا اور وہاں فیروز آباد شہر کی بنیاد ڈالی اور جب عمارتیں مکمل ہو گئیں تو وہ دارالسلطنت واپس آیا۔

کھیرلا

گلبرگہ میں دو تین ماہ اور قیام کر کے سلطان کھیرلا کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ ماہور پہنچا تو وہاں کے مقدم نے جو برابر نرسنگھ کا ساتھ دیتا رہا تھا سلطان سے معافی کا طلب گار ہوا اور سلامی کی اجازت پا کر خراج کی پیش کش کی۔ سلطان نے ماہور کے قلعہ میں ایک ماہ پانچ دن قیام کیا۔ اب نرسنگھ بالکل اکیلا رہ گیا تھا اس لیے کہ ماہور کا رئیس بہمنیوں کی طرف چلا گیا تھا اور گونڈوانہ کے رئیس سے اس نے جو مدد مانگی وہ نہیں مل سکی۔ پھر بھی وہ سلطان کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لے کھیرلا سے دو منزل آگے بڑھا۔ خراج دینے پر راضی ہونے کے لیے جو پیام نرسنگھ کو بھیجا گیا تھا اس کا اس نے نفی میں جواب دیا اور فیروز کے لیے لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا، لیکن وہ ماہور سے ایلچ پور چلا گیا اور لڑائی کا اہتمام اُس کی عدم موجودگی میں ہوا۔ فضل اللہ انجو نے میسرہ کی کمان سنبھالی اور خان خاناں نے میمنہ کی۔ لڑائی بہت سخت ہوئی اور شجاعت خاں، بہادر خاں، دلاور خاں اور رستم خاں جیسے بہمنی امرا جنگ میں مارے گئے۔ یہ افواہ بھی اُڑی کہ خان خاناں مارا گیا مگر انجو نے حکم دیا کہ فوج کو ہمت نہ ہارنا چاہیے اور افواہ خواہ غلط ہو، یا صحیح اسے بالکل راز میں رکھنا چاہیے اور یہ اعلان کرنے کے لیے کہ بادشاہ سلامت بہت بڑی فوج لے کر ایلچ پور سے آ گئے ہیں اس نے نقارے بجوا دیے۔ خان خاناں شہید نہیں ہوا تھا اور وہ جلد ہی انجو کی فوج سے آ کر مل گیا۔ نرسنگھ کے لڑکے کوشل سنگھ کو قید کر لیا گیا اور نرسنگھ کو کھیرلا کے قلعہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ محاصرہ دو ماہ تک جاری رہا جس کے آخر میں نرسنگھ نے ہتھیار ڈال دیے اور بذاتِ خود ایلچ پور جا کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور یہ درخواست کی کہ سلطان خراج لینا منظور کر لے جیسے اس کے پیش رو گلبرگہ کے بادشاہوں کا دستور تھا۔ نرسنگھ نے یہ بھی پیش کش کی کہ بادشاہ اس کی لڑکی کو 'شاہی خادمہ' کے طور پر حرم شاہی میں داخل کر لے اور چالیس ہاتھی، پانچ من سونا اور پچاس من چاندی کی نذر گزاری۔ بادشاہ نے اپنی طرف سے کھیرلا کی ریاست اسے بحال کر دی اور اسے سلطنت کا امیر بنا لیا اور ایک خلعت بشمول زرکار ٹوپی کے عطا کی۔

تلنگانہ

کھیرلا کی مہم کے بعد ہی شاید سلطان نے فوج لے کر تلنگانہ پر چڑھائی کی جہاں ویلاماون اور ویماون میں سخت جنگ جاری تھی۔ ویلاماون کو سلطان نے مدد دی تھی اور ویماون کو وجے نگر نے۔ دراصل یہ جنگ اس لیے ہوئی تھی کہ کتایا ویما ہری ہر کو جو مدد دیا کرتا تھا وہ دینے سے انکار کر دیا تھا چنانچہ سلطان نے انادیو اور دیگر ویلاما سرداروں کے ساتھ مشرق کا رخ کیا۔ ان میں سے ایک سردار گنج راؤ تپا گندوکولم میں کتایا ویما کو ملا اور شاید اُسے قتل کر دیا۔ آندھیرا پردیش میں فیروز کی رفتار کچھ مبہم سی معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ ایک طرف تو فرشتہ کا بیان ہے

کہ اس نے راستہ میں کئی قلعوں کو تسخیر کر لیا اور راجہ مندری کے قلعے پر بھی قبضہ کر لیا لیکن دوسری جگہ ہمیں یہ بیان ملتا ہے کہ وہ گوداوری کو عبور نہ کر سکا اس لیے کہ دودایا الایا الادی ریڈی جسے شاید دیورائے کی مدد حاصل تھی وہ بہت طاقتور ثابت ہوا اور بہمنی کماندار علی خاں کو شکست دے دی اور فیروز کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ مزید برآں فرشتہ کا یہ بھی بیان ہے کہ اس مہم کے نتیجے میں تلنگانہ بہمنی سلطنت میں شامل ہو گیا لیکن بعد کو ہم دیکھتے ہیں کہ تلنگانہ سے خراج کا مطالبہ کیا گیا جو وصول بھی ہو گیا۔ لیکن اگر یہ ریاست پہلے ہی بہمنی سلطنت میں شامل ہو گئی ہوتی تو خراج طلب کرنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ شروع میں سلطان کو راجہ سندری پر چڑھائی میں پوری کامیابی ہوئی لیکن آخر میں وہاں اُسے شکست ہوئی اور اُسے مقامی سرداروں کو پورے طور پر زیر کیے بغیر واپسی پر مجبور ہونا پڑا، اگرچہ یہ سردار خراج کی رقم شاہی خزانہ میں داخل کرتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگر تلنگانہ پر بہمنیوں کا قبضہ ہوا بھی ہوگا تو وہ مکمل قبضہ نہ ہوگا اس لیے کہ جیسا بعد کو معلوم ہوگا سلطان برابر ایک فریق کی دوسرے کے خلاف مدد کرتا رہا۔

تیمور

بہمنی سلطنت اور ہندوستان کے شاہانِ مغل کے مورث اعلیٰ فاتح اعظم تیمور کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی اُس سے دکھن کے بیرونی ممالک سے تعلقات اور اس زمانہ کے بین الاقوامی رسم و رواج پر عجیب طرح کی روشنی پڑتی ہے۔ فیروز نے جب سنا کہ تیمور ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے اور شاید اپنے ایک لڑکے کو ہندوستان کا بادشاہ بنائے گا تو اس نے صورت حال کی پیش بندی کی اور میر فضل اللہ انجو کے داماد میر تقی الدین محمد اور مولانا فضل اللہ سبزواری کو سمندر کے ذریعے سے ایک پیام اور تحفے لے کر تیمور کے پاس بھیجا۔ یہ دونوں تیمور کے دارالسلطنت پہنچ گئے مگر اپنے تحفے پیش کرنے کے لیے چھ مہینے انتظار کرتے رہے۔ فیروز کے پیام میں یہ تحریر تھا کہ اگر تیمور کا قصد دہلی آنے کا ہے اور اپنے ایک لڑکے کو یہاں کا بادشاہ بنانے کا ہے تو وہ خود حاضر ہو کر نئے بادشاہ کو سلامی دے گا۔ تیمور نے فیروز کو ایک فرمان بھیجا جس میں اسے اپنا لڑکا کہہ کر مخاطب کیا اور اسے تمام شاہی لوازم اور ساز و سامان استعمال کرنے کی اجازت دی۔ تیمور نے فیروز کو تحفے بھی بھیجے اور اس کے دکھن کی سلطنت کے قبضہ کی تصدیق کی۔ نیز گجرات اور مالوا کے قبضہ کی بھی۔ اگرچہ یہ دونوں تیمور یا فیروز کی دسترس سے باہر تھے۔ مالوا اور خاندیش کے حکمرانوں نے یہ سوچ کر کہ آئندہ نہ جانے کیا صورت پیش آئے تیمور کو پیام بھیجا کہ وہ دکن کے حکمراں کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک خفیہ پیام وجے نگر کے رائے کو بھیجا کہ اگر وہ دکھن پر حملہ کرے تو بشرط ضرورت یہ اس میں سرگرم مدد دیں گے اور شاید اسی بھروسے پر رائے نے مقررہ خراج گلبرگہ نہیں بھیجا لیکن سلطان نے خیال کیا کہ ابھی وجے نگر کے خلاف جنگ مناسب نہیں ہے تاہم خود وجے نگر کے رائے نے بالکل خلاف توقع بنیاد پر خود ہی لڑائی چھیڑ دی۔

□

ماخذ: دکن کے بہمنی سلاطین: ہارون خاں شیروانی، مترجم: رحم علی الہاشمی، سنہ اشاعت: 2013، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مصنف: پرتیبھا رائے   مترجم: رشدہ خاتون

لمس

(اڑیا کہانی)

ایک ابدی تعلق قائم ہو جاتا ہے دو جسموں کے پہلے لمس اور اس کے اتصال سے۔ جسموں کا یہ لمس دراصل ضمیر کا اتصال ہے، جو جماع و انزال کی صورت میں باقی ماندہ زندگی کو مطمئن اور منضبط کرتا ہے۔ اس لمس کی کوئی ایک زبان نہیں ہے جس میں اس کو بیان کیا جاسکے، یہ بے لفظ ہے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، کہ کس نے چھوا — فرشتہ نے یا جانور نے، یہ لمس چاندی کی چھڑی کا ہے یا سونے کا یا پھر موت کا یا زندگی کا؟ کبھی کبھی تن کی دہلیز کو عبور کر کے کسی بے پناہ لمس کے لیے بے قرار ہو اٹھتا ہے من، روح، ضمیر۔ چارولتا سوچ میں پڑ جاتی، اتصال — جسمانی ہے یا ذہنی؟

عورت اور مرد کے من کے اتصال سے ولادتیں نہیں ہوتیں۔ اگر ایسا ہوتا تو زمین کے بہت سے زوجین لاولد رہ جاتے۔ صحت مند اور لائق چار بچوں کی ماں چارولتا من کی گہرائی میں اس بات کا جائزہ لیتی اور ایشور کے اس آفاقی رمز کے آگے ہر بار سر جھکا دیتی۔

نیل کنٹھ اور چارولتا اپنے پہلے ملن کی رات سے ہی یہ محسوس کر چکے تھے کہ دونوں ایک دوسرے کے عین مطابق شریک حیات بالکل بھی نہیں ہیں۔ یا یہ کہیے کہ مساویانہ ضابطگی نہیں ہے۔ شادی شدہ زندگی پوری طرح سے انسانی عمل دخل کا نتیجہ ہے۔ حقیقت میں کوئی کسی کے لیے پیدا نہیں ہوتا۔ آدمی اپنے لیے ہی پیدا ہوتا ہے اور اپنے آرام اور فائدے کو ذہن میں رکھ کر پوری زندگی گزارتا ہے، خود کے خوابوں اور آزادی کو مرکز میں رکھ کر گڑھتا ہے سارا رشتہ، اسی میں پھر ڈوب جاتا ہے سماج، اقدار اور عام رواج — معاشرتی رواج اور روایت کا احترام کرتے ہوئے آدمی کئی ناپسندیدہ واقعات کو بھی قبول کر لیتا ہے، کیوں کہ اس کے ساتھ آدمی کی سماجی حیثیت اور وقار جڑا ہوتا ہے۔

شادی بھی ایک سماجی حیثیت ہے۔ دونوں مرد عورت کا ہی نہیں بلکہ دو خاندانوں کا سماجی وقار، نیک نامی، بدنامی بھی اس سے جڑ جاتی ہے۔ اس لیے پہلی رات سے ہی اپنے ذاتی آرام، وقار، عزت کو ترجیح دیتے ہوئے پوری زندگی شادی کے بوجھ کو ڈھوتے چلتے ہیں۔ اور یہی ذرا سی بردباری اور تحمل نے ہی ہمارے سماج میں ابھی تک شادی کو مستقل بندھن میں باندھے ہوئے ہے۔ روایت کے تئیں یہی احترام ہی شادی کا بنیادی اصول ہے۔

نیل کنٹھ نے اپنی پسند سے ہی چارولتا سے شادی کی تھی۔ یہ شادی پوری طرح سے اس کے سراپا اور خوبصورتی سے متاثر ہو کر کی گئی تھی۔ کالج میں انھوں نے کئی مرتبہ چارولتا کو دیکھا تھا۔ اس کی خوبصورتی سے وہ مسحور ہو گئے تھے۔ ویسے چارولتا کالج کی مشہور مہ جبینوں کی فہرست میں شامل نہیں تھی۔ پھر بھی چارولتا کی خوبصورتی میں ایک ایسی الھڑ دوشیزگی تھی جو ظاہر کرتی تھی کہ وہ صرف خوبصورت ہی نہیں ہے بلکہ بردبار بھی ہے۔ شاید مرد اپنے لیے شریک حیات انتخاب کرتے وقت انھیں دو خوبیوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ شریک حیات کی بردباری اور تحمل ہماری سماجی روایت کا حصہ ہے۔

لائق شریک حیات وہی ہے، جو بستر پر طوائف کی طرح بے پناہ آسودہ کر سکتی ہو، خادمہ کی طرح خدمت کر سکتی ہو اور سیتا کی طرح ہر ظلم و زیادتی کو منہ بند کر کے برداشت کر سکتی ہو... یہ سب باتیں نیل کنٹھ کو کسی نے بتائی نہیں تھیں۔ تہذیب اور روایت کے نام پر یہ اس کی رگ رگ میں سرایت تھی۔ اسی لیے چارولتا کو دور سے ہی دیکھ کر وہ اس سے شادی کرنے کے لیے خواہش مند ہو گئے تھے۔

بس نیل کنٹھ کی خواہش سے ہی شادی آرام سے طے ہو گئی۔ چارولتا کی مرضی جاننے کی کسی کو ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس کی بھابھی نے الزام سے بچنے کے لیے جب چارولتا سے اس کی پسند کے بارے میں پوچھا تب تک شادی کے لیے جواب بھیجا جا چکا تھا۔ بہت ہی غیرت مند اور خاموش مزاج لڑکی تھی چارولتا۔ اپنے من کے جذبے کو چھپا کر بولی، ''پاپا، بھیا، آپ سبھی راضی ہیں اور جواب بھی دے چکے ہیں تو پھر میری مرضی کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''ابھی بھی وقت ہے۔ سگائی تو نہیں ہوئی، مہا پرساد تو نہیں چڑھایا گیا ہے۔'' نند کے من کی گہرائی کا اندازہ لگانے کے لیے بھابھی نے کہا۔

چارولتا ہنس کر بولی، ''پاپا، بھیا کا جواب دے دینا ہی میرے لیے مہا پرساد جیسا ہے۔ اور پھر جن کو میں نے دیکھا نہیں، جانتی بھی نہیں ان کو لے کر پسند ناپسند کا سوال ہی کہاں اٹھتا ہے؟ پاپا اور بھیا نے جب پسند کیا ہے تو پھر اس میں میری نامنظوری کیوں ہو؟ ویسے بھی چارولتا کے اعتراض کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ بیٹی رانی کی طرح راج کرے گی۔ ایسا رشتہ پا کر سبھی مسرور تھے۔ ایسے میں چارولتا منع بھی کرتی تو کیوں؟ اب شادی کرنی ہی تھی اور اپنی کوئی پسند بھی نہیں تھی تو...

رانیاں کیا سچ مچ آرام سے رہتی ہیں؟ قیمتی ساڑی طرح طرح کے زیورات لذیذ کھانے خادم، خادمائیں راج محل کے علاوہ عورت کو خوش ہونے کے لیے اور کیا چاہیے بھلا؟

لیکن معلوم نہیں کیوں بچپن سے ہی رانیوں کے آرام کو لے کر اس کے من میں گہرا شبہ تھا۔ رانیوں سے کیا کبھی کسی نے ان کے من کی خوشی کے بارے میں پوچھا؟ چارولتا کو لگتا، سیتا بہت تعریف پسند اور وقار کی لالچی عورت تھی۔ سماج کا وقار اور تعریف اس کے لیے بہت اہم تھا۔ اسی لیے انھوں نے خاموشی سے سماج کا سارا ظلم برداشت کر لیا تھا۔ ایسی بہت سی روایتی کہانیوں یا سچائیوں کی طرف وہ دل ہی دل میں انگلی اٹھاتی رہی۔ لیکن اس میں بھی منہ کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔ اسی کی طرح سیتا کے پاس بھی ہمت کی بہت کمی تھی۔ اسی لیے شاید انھوں نے آخر میں آگ کا سہارا لیا، اور سماج نے اس کے لیے ان کی واہ واہی کی۔ یعنی ظلم کو منہ بند کر کے برداشت کرنے کا مطلب ہے بردباری اور تحمل۔

تن اور من دو الگ الگ عناصر ہیں، حالانکہ پھر بھی الگ نہیں ہیں۔ من کو نامنظور کر کے تن کو منظور کیا جا سکتا ہے، لیکن ایسی منظوری صرف جسمانی ہوتی ہے، روحانی نہیں۔

مباشرت، جسمانی ہے یا روحانی؟

چارولتا من اور روح کے تئیں بہت حساس تھی کیونکہ ہمارے سماجی چال چلن میں یہی سب سے زیادہ نظرانداز ہوا ہے۔ چارولتا کے بچپن کی سہیلی گوڑ خاندان کی بیٹی ملّی کی جس دن اپنے والد کے عمر کے بدصورت، لالچی شخص کی دوسری شادی اس سے ہو گئی۔ اس دن چارولتا کو بہت زیادہ دلی تکلیف ہوئی تب وہ دوشیزہ تھی۔ چارولتا نے سوچا کہ اس کی کنواری حسین دوشیزہ سہیلی ملّی اس گنجے بدصورت عمر دراز بوڑھے شوہر کو اپنا جسم چھونے بھی نہیں دے گی اور شب عروسی کے دوسرے دن اپنے والد کے گھر واپس آ جائے گی۔ لیکن ملّی جب والد کے گھر آئی تب وہ بوڑھے شوہر کی لاڈلی بیوی کے اعزاز سے مہک رہی تھی۔ اس پہلے سے شادی شدہ شوہر کی اولاد کو ملّی اپنے اندر پناہ دے کر بھرا ہوا جسم لیے ہوئے واپس ہوئی تھی۔ پہلے سے اور گوری ہو گئی تھی۔ زیور پہن مانگ میں سندور بھر، پان سے ہونٹوں کو رنگ کر وہ رانی کی طرح لگ رہی تھی۔ گاؤں کی عورتیں ملّی کو دیکھ کر جہاں خوش ہو رہی تھیں، وہیں چارولتا، ملّی کی دمکتی خوشی کو دیکھ کر حیرت زدہ

ہو گئی۔ باپ کے عمر کے اس بوڑھے شوہر کو کیا ملّی پیار کر پائی؟ دل دے سکی اسے؟ تو پھر اتنی جلدی ملّی کیسے ماں بننے جا رہی ہے؟

تنہائی میں یہی بات اس نے ملّی سے پوچھ لی۔ اس کی بات سن کر ملّی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی اور بولی، ''پیار؟ دل لینا۔ دینا؟ یہ سب کیسی باتیں ہیں چارو دیدی؟ ناٹک دیکھ کر، ناول پڑھ کر جانے کن بے کار کی باتوں کو دماغ میں بھر رکھا ہے۔ ان سب باتوں کو دماغ میں مت گھساؤ۔ بہت تکلیف پاؤ گی۔ میاں بیوی کی دنیا ناول والے عشق سے نہیں چلتی ہے۔ شاعری واعری لکھ کر تم نے اپنا دماغ خراب کر لیا ہے۔ کھا پی کر بچے کی ماں بن کر لڑکی کی راج رانی ہوتی ہے۔ کسی بھی بات کی کمی نہیں ہے مجھے دیدی۔ میں بہت خوش ہوں۔''

''تجھے کوئی بھی کمی نہیں ہے؟ سچ کہہ رہی ہے تو؟'' چارولتا نے اپنی چبھتی ہوئی نظر ملّی کی آنکھوں میں گڑا کر پوچھا۔ ملّی آنکھیں نچاتے ہوئے بولی، ''کمی ڈھونڈھنے لگو تو پھر آسمان کے تارے جیسے بے حساب کھل جائیں گے، پھر تم جی نہیں پاؤ گی۔ پانچوں انگلی برابر نہیں ہے تو کیا ہاتھ کام نہیں کرتے دیدی؟ زندگی بھی ٹھیک اسی طرح ہے۔ تم کمی ڈھونڈھنے لگو گی تو پھنس جاؤ گی۔ ناول پڑھ پڑھ کر تم نے بے کار اپنا دماغ خراب کر رکھا ہے۔''

ملّی اپنے تھل تھلے کمر کو ماما کے غیر مرئی احساس کے افتخار میں ہلاتے ہوئے چلی گئی۔

اس دن چارولتا کو احساس ہوا تھا کہ شاید ملّی آرام سے ہے، رانیوں کی طرح ہے، ملّی نے جتنی عمر میں پڑھائی کر کے شادی کر لی تھی، اسی عمر میں اگر چارولتا بھی شادی کر لیتی تو شاید وہ بھی اسی کی طرح خوش رہتی۔ لیکن وہ تکلیف میں ہے ایسا کوئی کہہ نہیں سکتا۔

نیل کنٹھ با کردار ہے، چارولتا کو پسند کر کے شادی کی ہے۔ پیسوں کی کمی نہیں ہے، تو پھر کمی ہے کہاں؟ من۔ اگر من میں کمی رہی بھی تو کسی کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ من پیچیدہ شے ہے، بہت عجیب وغریب۔ جس کو جو ملا ہے وہی اس کے لیے تکلیف کا باعث بن جاتا ہے۔ ملی ہوئی شے کا احترام نہ کرنا، نہ ملنے والی شے کے لیے من مضطرب ہو جاتا ہے۔ یہی من ہے جو سب کچھ رہتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہونے کی تکلیف سے زندگی کو پریشانی میں مبتلا کرتا ہے۔ اسی لیے من کو پرے رکھ کر خوشی کی تلاش ہی شادی شدہ زندگی کا معیار ہونا چاہیے۔

چارولتا نے اس معیار کو پوری طرح نبھایا تھا۔ ان کی پینتیس برس کی شادی شدہ زندگی میں من کی اہمیت کبھی نہیں رہی۔

پہلے اتصال سے قبل ہی نیل کنٹھ سمجھ گئے تھے کہ چارولتا جس طرح سے شائستہ، بردبار اور ثابت قدم نظر آ رہی تھی، ویسی وہ ہے نہیں۔ اس کے اندر ایک آزاد روح حکمراں ہے۔ عورت کی یہی آزادیِ روح ہی شادی میں مصیبت کی بنیادی وجہ بنتی ہے۔ اس بیدار آزادیِ روح کو پہلے سے ہی جڑ سے کچل دینا ہوگا نہیں تو بہت جلد ہی وہ چھتنار درخت میں بدل کر ان کی مردانگی، نسل اور بنیاد پر زبردست ضرب لگائے گی۔

من کو ردکرتن کی مدح سرائی پر ہی پہلا تعلق قائم ہوا تھا۔ چارولتا کے من کو گہری ٹھیس لگی۔ لیکن وہ زخم کسی کو نظر نہیں آیا۔ چارولتا نے کسی کو دکھایا بھی نہیں، اپنے شوہر کو

بھی نہیں۔دکھاتی تو بھی نیل کنٹھ کو نظر آ جاتا ایسا یقین چارولتا کو آج بھی نہیں ہے۔

حسینوں کے من کے اندر حسن کا غرور اجگر کی طرح کنڈلی مار کر سویا رہتا ہے۔مہ جبینوں کو برداشت تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے حسن کے غرور کو نہیں، خاص طور سے بیویوں کو۔ہوسکتا ہے چارولتا کے من میں بھی حسن کا غرور ہو۔وہ اگر سوچتی ہے کہ اس سے شادی کر کے نیل کنٹھ سرخرو ہوا ہے،تو اس کے اس گمان کو پہلے ہی ختم کرنا ہوگا۔اسی رات میں اپنے آپ کو ثابت کرنے کے لیے نیل کنٹھ نے جائز قدم اٹھایا۔

''دراصل مجھے کسی اور لڑکی سے شادی کرنی تھی۔ بہت ہی مہذب خاندان کی خوبصورت لڑکی تھی۔تعلیم تہذیب اور مزاج میں اس کے ہم پلہ بہت کم لڑکیوں کو میں نے دیکھا ہے۔عشق وشق کے حمایت میں میں نہیں ہوں۔پھر بھی ہم دونوں کئی برسوں سے ایک دوسرے سے شادی کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ایک دومرتبہ مل بیٹھ کر گفتگو کرنے کا اتفاق بھی ہوا۔مجھے پختہ یقین تھا کہ وہ میری مثالی بیوی ثابت ہوگی۔لیکن دونوں خاندانوں کے درمیان میں چھوٹی سی ایک غلط فہمی کی وجہ سے آخری لمحوں میں وہ رشتہ ختم ہوگیا۔پاپا دادا کے فیصلے کی مخالفت کرنے کی روایت ہماری نسل میں نہیں ہے۔ اسی لیے میں خاموش رہا۔ابھی تک اس بے چاری نے شادی نہیں کی ہے۔تم شاید اس کو پہچانتی ہو،تمھارے کالج میں ہی پڑھتی تھی،سُرما.....''

سرما کا نام سنتے ہی چارولتا کا سر احساس جرم سے جھک گیا۔سُرما چارولتا کی غیر معمولی سہیلی تھی۔لیکن ایک مرتبہ بھی سُرما نے اپنے اس رشتے کے بارے میں اس سے کبھی بھی کچھ کہا نہیں۔سگائی نہ ہونے تک شاید لڑکیوں کو شادی کے اس رشتے کا پختہ یقین نہیں ہوتا ہے۔شاید اسی لیے سرما نے اس سے کچھ کہا نہیں تھا۔اگر وہ یہ بات جانتی تو اس سے شادی کے لیے ہرگز راضی نہ ہوتی۔ افسوس: سُرما سے کیسے نظر ملا پائے گی وہ؟ کیا کہے گی وہ سُرما سے؟

اس کی شادی میں سُرما کا نہ آنا اب وہ سمجھ گئی۔سرما نے اس سے مبارک باد کا اظہار بھی نہیں کیا۔چارولتا نے سوچا سرما امتحان میں مصروف ہوگی۔سُرما، چارولتا کے متعلق کتنا برا سوچ رہی ہوگی۔

چارولتا ہمت کر کے صاف لفظوں میں گویا ہوئی، ''یہ بات آپ کو پہلے کہنی چاہیے تھی۔میں جانتی تو سرما ہی اس گھر میں دلہن بن کر آتی۔میری شادی آپ سے نہیں ہو پاتی تو کیا؟کسی دوسرے سے ہو جاتی۔بے چاری سُرما'' سرما کی تکلیف سے چارولتا غمگین ہوگئی۔

چارولتا کی حقیقت پسندی نیل کنٹھ کو اچھی نہیں لگی۔شادی کی پہلی رات کو اپنے شوہر کے منہ سے کسی پرائی عورت کی تعریف سن کر نئی نویلی دلہن کو تو زارو قطار آنسو بہاتے ہوئے شوہر کے سینے سے لگ جانا چاہیے،''اس کلموہی سُرما کو اب بھول جاؤ!سُرما سے کس خوبی میں کم ہوں میں،کہ پہلی رات کو ہی آپ سرما کا نام لے رہے ہیں؟'' حالانکہ اس کے برخلاف چارولتا نے اس کے منہ پر ہی بول دیا کہ آپ سے شادی نہیں ہو پاتی تو کسی دوسرے سے ہو جاتی۔ اس کی ہمت تو کچھ کم نہیں ہے۔لاج شرم بھی نہیں ہے۔پہلی رات کو شوہر کے سامنے ہی،غیر مرد سے شادی کر سکتی ہے، کہنے میں ذرا بھی ہچکچائی نہیں۔

نیل کنٹھ کا مردانہ وقار پہلی رات کو ہی زخمی ہوگیا۔ چارولتا نے اس طرف خیال نہ کرتے ہوئے مزید کہا، ''ابھی بھی آپ سُرما سے شادی کر سکتے ہیں۔میرا جو کچھ ہونا تھا ہوا۔میں اپنے آپ کو سنبھال لوں گی۔آپ اور سُرما ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہیں گے تو مجھے بھی خوشی ہوگی۔آپ نہیں جانتے سرما میری بہت اچھی سہیلی ہے۔ چنڈالنی نے اتنا دھوکا کیا میرے ساتھ !ایک دن بھی اگر اس کے منہ سے آپ کا نام سنتی تو پاپا سے صاف طور پر منع کر دیتی۔آپ اگر سُرما سے شادی کرنا چاہتے ہیں،تو میں کل ہی پاپا کے پاس چلی جاؤں گی۔''نیل کنٹھ کی مردانگی پر بار بار چارولتا ضرب لگا رہی تھی۔کہہ رہی ہے کہ نیل کنٹھ کو چھوڑ کر خود کو سنبھال لے گی۔اور اس کو پہلے سے معلوم ہوتا تو نیل کنٹھ سے شادی کرنے کے لیے صاف طور پر منع کر دیتی،تو پھر کس سے شادی کرتی؟اور اب واپس لوٹ جانے کے لیے بھی تیار ہے۔کس کے بھروسے پر ہے یہ حماقت؟

سخت لہجے میں نیل کنٹھ بولے،'' لگتا ہے کافی سطحی ناول پڑھ رکھا ہے،اسی لیے ایسی باتیں کر رہی ہو۔یاد رکھو ہمارے گھر کا ایک اصول ہے۔ہمارے خاندان میں کوئی بھی اپنی بیوی سے تعلق ختم نہیں کرتا۔یہ سب چھوٹے لوگوں کے گھروں میں ہوتا ہے۔تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟تمہاری تعلیم، پرورش اور تہذیب ایسی سطحی ہوگی ایسا میرا یقین نہیں تھا۔اور کسی دن تمھارے منہ سے یہ بات میں پھر نہ سنوں۔''

پہلے ہی دن سے چارولتا مطمئن ہوگئی کہ سُرما اس کی ازدواجی زندگی میں کچھ بھی پریشانی پیدا نہیں کرے گی،حالانکہ اس کی وجہ سے،انجانے میں ہی سہی سُرما کا دل جو ٹوٹ گیا،اس کی تلافی کے لیے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔چارولتا دل ہی دل میں اس ادھیڑ بن میں لگی تھی کہ تبھی نیل کنٹھ نے جرح کرتے ہوئے پوچھا، ''تم بھی کسی اور سے شادی کرنا چاہتی تھیں کیا؟بار بار یہی بات کہہ رہی ہو۔''

چارولتا نے صاف گوئی سے جواب دیا''ہاں، میں بھی کسی اور سے شادی کرنا چاہتی تھی۔بہت کم عمر میں ہی میں ان کی دل ہی دل میں عزت کرتی تھی۔لیکن ہمارے خاندان کے داماد بننے کے قابل وہ نہیں ہو سکے۔کئی مسابقتی امتحان دینے کے باوجود کامیابی نہیں ملی تو معمولی تنخواہ والی ایک نوکری کرنے لگے۔پھر میری ہمت نہیں ہوئی کہ ان سے شادی کرنے کی ضد کروں۔بات آگے بڑھی ہی نہیں۔جب میں ایم اے کر رہی تھی تبھی انھوں نے کسی اور سے لو میرج کر لیا۔اس وقت تک میرے گھر والے میری شادی کے لیے سنجیدگی سے سوچ بھی نہیں رہے تھے۔''

اپنے مالکانہ حقوق پر زبردست چوٹ محسوس کی نیل کنٹھ نے۔نہایت سنجیدہ لہجے میں بولے،''تمہارا وہی ایک عاشق تھا یا اور بھی کئی تھے؟سنا ہے کالج میں تمہارے پیچھے ایک لمبی قطار تھی عاشقوں کی۔''

شرماتے ہوئے چارولتا بولی۔''کئی لڑکے مجھے خط لکھتے تھے،حالانکہ میں ان میں سے کسی کو پہچانتی نہیں تھی۔مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔''

''تم نے کیا کبھی کسی کو خط نہیں لکھا؟''

''لکھا تھا،انھیں میں سے بندایک کو، جو خط میں اپنا پتہ لکھتے تھے۔شائستگی سے جواب لکھ کر انھیں بتا دیتی تھی کہ ہاسٹل میں خط لکھ کر تنگ کرنے کی جگہ وہ پڑھائی میں اپنا دھیان لگائیں۔'' چارولتا بےخوفی سے بولی۔

طنزیہ لہجے میں نیل کنٹھ نے پوچھا''صرف اسی ایک ناکام عاشق کو ہی خط لکھ کر جواب دینے کی گزارش کی تھی؟''

''ہاں،صرف وہی ایک تھے،جنھیں میں نے کئی خط لکھا تھا''

''کتنے خط لکھے تھے؟''

''کئی،لیکن ایک بھی ڈاک کے سپرد نہیں کیا۔خط لکھ کر پھاڑ دیتی تھی۔شرم،خوف اور اس شبہے میں کہ کہیں خط کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائے۔''

نیل کنٹھ ایک دم طیش میں آ گئے،''لاج،خوف وہ بھی تمھارے جیسی لڑکی میں؟میں اگر پہلے سے جانتا تو''

نیل کنٹھ غصے میں مٹھی بھینچنے لگے۔

''یقین کیجیے، میں نے ایک بھی خط پوسٹ نہیں کیا، لکھنے کے بعد سارے خط میں پھاڑ دیتی تھی، بس ایک دو خط میں نے سنبھال کر رکھا ہے۔ پوسٹ کرنے کے لیے نہیں، بلکہ کافی اچھا لکھ پائی تھی اس لیے، پھاڑنے کا من نہیں کیا۔ تم چاہو تو پڑھ سکتے ہو۔''

چارولتا نے جتنی آسانی سے جواب دیا، نیل کنٹھ کا چہرہ اتنا ہی طیش سے بھر اٹھا۔ آنکھوں سے اتنا ہی غصہ جھانکنے لگا۔ اس لڑکی کا کوئی یقین نہیں۔ نہ جانے کتنے عاشقوں کے آگے اس نے بھولے پن کا یہ ڈرامہ کیا ہوگا۔

طیش میں آکر نیل کنٹھ نے پوچھا، ''کہاں ہیں وہ خط؟ باپ کے گھر سے بیش قیمت سامان ساتھ میں لائی ہو! کہاں رکھا ہے؟''

اسی رات چارولتا نے والد کے گھر سے لائے ہوئے باکس میں سے دونوں خط، جو کبھی کسی غیر مرد کے لیے لکھا تھا، بغیر کسی جھجک کے نکال کر شوہر کی طرف بڑھا دیا۔

نیل کنٹھ نے بہت ضبط کے ساتھ دونوں خط پڑھا، پڑھتے۔ پڑھتے غصے سے آگ بگولہ ہو گیا۔ نادیدہ عاشق کو ارسال نہ کیے جانے والے خط کسی ناول سے نقل کیے گئے اقتباس معلوم پڑ رہے تھے، جو ان کی نئی نویلی دلہن چارولتا کی بے حیائی کا مظہر تھے۔ چارولتا کے خوبصورت چہرے پر تھوکنے کا من کیا۔ چارولتا کو لہولہان کرنے کے لیے ان کی مردانگی ہنکار بھرنے لگی۔ دونوں خط کو پھاڑ دینے کی خواہش ہونے کے باوجود انھوں نے پھاڑا نہیں۔ چارولتا کو ستانے کے لیے دونوں خط کو اسلحے کے طور پر سنبھال کر رکھتے ہوئے نفرت اور حقارت سے چارولتا کی طرف دیکھا۔ اور بے نتیجہ مردانہ وقار کے غصے کو چارولتا کے سڈول خوبصورت چھریرے بدن میں اتار دیا۔

اسی پہلی رات سے ہی نفرت اور بے یقینی کے ساتھ تیز دھار دار تلوار پر پاؤں رکھ کر چارولتا نے جسمانی زندگی گزارنی شروع کی۔ اپنا اور شوہر کا من ٹٹولتے ٹٹولتے، روح کے لمس کے لیے ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے چارولتا چار بچوں کی ماں بن گئی اور ماہر خانہ دار خاتون بھی۔ دیکھتے دیکھتے بچے بھی بڑے ہو گئے اور چارولتا، نیل کنٹھ ادھیڑ۔

چارولتا اور نیل کنٹھ جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کو دل نہیں دے پائیں گے، پیار نہیں کر پائیں گے۔ کوئی بھی کسی کے لیے نہیں بنا تھا۔ یہ دونوں سمجھ گئے تھے۔ پھر بھی دونوں کو ایک ہی گھر میں رہنا ہوگا، ایک ہی بستر پر سونا ہوگا، دکھ اور تکلیف، غم اور خوشی، جیت ہار، خوش قسمتی اور بدقسمتی میں ایک دوسرے کا حصے دار بننا ہوگا، ایسا ایک بغیر تحریر، بغیر کسی اعلامیہ کے ایک مفاہمت دونوں کے درمیان جانے کب مکمل ہو چکی تھی۔ اسی مفاہمت کو دونوں زندگی بھر بچوں کو مرکز میں رکھ کر نبھاتے چلے گئے۔ سرما کو لے کر چارولتا نیل کنٹھ کو کبھی طعنے نہیں دیتی تھی حالانکہ چارولتا کے ناکام طفلانہ عشق کو لے کر نیل کنٹھ اس کو بار بار بے عزت کرتے تھے۔ چارولتا کو احساس ہو چکا تھا کہ جس کو عشق کا روپ سمجھ کر اس نے انگنت عاشقانہ خط لکھ کر پھاڑ دیا تھا، وہ عشق نہیں تھا، نوعمر دل کا چنچل جذبہ تھا بس، اس میں کوئی گہرائی نہیں تھی۔ اس لیے آج اس عاشق کا کوئی پتہ ٹھکانہ بھی اس کے پاس نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو بھی

کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بات اس نے کتنی بار حلف اٹھا کر نیل کنٹھ کو سمجھائی، لیکن نیل کنٹھ نے چارولتا کے کردار کو زندگی بھر شبہے کے گھیرے میں ہی رکھا۔ غلط یا صحیح جو لڑکی ایک بار کسی غیر مرد کی طرف متوجہ ہو گئی ہو، باقی ماندہ زندگی صحیح راستے پر چلنے کی یقین دہانی کرانے پر بھی اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

پینتیس برس میں چارولتا کے پاس سو کے قریب خطوط آئے ہوں گے۔ جس میں اوسط کے اعتبار سے ہر برس دو خط کے حساب سے ستر خط اس کے والدین بھیا بھابھی کی طرف سے آئے ہوں گے، اور گزشتہ کچھ برسوں میں اس کے بچے نوکری کی وجہ سے اس سے دور رہنے لگے، تو ان کے پاس سے شاید تیس خط آئے ہوں گے۔ لیکن واضح لفظوں میں مذکورہ شخص کا خط آیا ہے یہ جانتے ہوئے بھی نیل کنٹھ خط کھول کر، پڑھ کر جانچ پرکھ کر ہی چارولتا کو دیتے تھے۔ پینتیس برسوں میں سے ایک بھی خط اس نے خود کھول کر پڑھا نہیں۔ نیل کنٹھ ہر مرتبہ ناکام ہی ہوتے رہے۔ لفافے کے اندر سے کسی نامعلوم عاشق کا خط ملنے کی ان کی امید روز بروز جھوٹی ثابت ہوتی رہی۔ کبھی کبھی چارولتا کے اس بچکانے خط کو پڑھ کر بلاوجہ ہی ناراض ہوتے اور چارولتا کے داغ دار ماضی کو لے کر اس کے منہ پر ہی اس کو ذلیل کرتے۔ چارولتا سوچتی اس رات جذبے کی رو میں بہہ کر سچ نہیں بولتی تو شاید آج ان کی ازدواجی زندگی بے مصرف نہ ہوتی۔ حالانکہ ان ساری باتوں کو سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بچوں کو انسان بنانے کی خواہش میں بے مصرف ازدواجی زندگی میں چھپے ہوئے درد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اتنے برسوں تک ایک جھوٹی زندگی جیتی رہی۔ اب جب بچے دور ہیں تو دونوں کے پاس کافی خالی وقت ہے۔ ماں باپ کی پرسکون ازدواجی زندگی کو دیکھ کر بچے ایک صحت مند شخصیت کے مالک بن کر زندگی میں کامیاب ہوں گے اسی امید سے میاں بیوی نے بہت احتیاط برتتے ہوئے اب تک کا وقت گزارا۔ لیکن اب وہ ڈر، خوف اور شبہ کچھ بھی نہیں رہا، اس لیے اب دونوں بات بات پر ایک دوسرے کے دشمن بنتے جا رہے تھے۔

یوں دیکھا جائے تو دونوں کی ازدواجی زندگی میں شخصیت سازی نہیں تھی۔ بچوں نے کبھی اپنے والدین کو لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ دونوں نے اپنے فرائض میں کبھی کوئی کمی کی ہو، ایسا بچوں نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ ممی پاپا کی ازدواجی زندگی ان کے لیے مثالی تھی۔ گھر میں ہمیشہ ہنسی خوشی، موج مستی اور سکون بھرا ماحول ہی رہا ہو، ایسا نہیں تھا تو بے اطمینانی، تناؤ، جھگڑا لڑائی کا ماحول بھی نہیں تھا۔

چارولتا نے گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کے لیے اپنا تن من اور روح کو قربان کر دیا تھا۔ شوہر کی کم آمدنی میں بھی کیسے بچوں کی ضروریات کو پورا کرے گی، اسی کوشش میں مگن رہتی۔ یوں تو وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی، چاہتی تو نوکری کر کے پیسہ کماتی تو بچے ذرا اور عیش و آرام کی زندگی گزار پاتے۔ لیکن نیل کنٹھ کے خوف ناک مردانہ وقار کو اس سے ٹھیس پہنچتی۔ اس لیے چارولتا نے اس طرف کبھی دھیان نہیں دیا۔

اب سبھی بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہیں۔ اپنی دنیا میں خوش ہیں۔ بچوں کی کامیابی کو لے کر وہ دونوں بھی عام طور سے خوش ہیں۔ بس اسی ایک بات کو چھوڑ دیں تو باقی ساری باتوں میں میاں بیوی کے درمیان نا اتفاقی ہی

رہی۔ بچوں کے دور رہنے سے اب یہ تمام تلخیاں زیادہ سے زیادہ ابھر کر سامنے آنے لگیں تھیں۔ دونوں کی دلچسپیاں مختلف ہونے کے باوجود پینتیس برسوں تک کیسے ایک آسان زندگی گزار پائے، یہ بات دونوں کو حیرانی میں ڈال دیتی۔

ایک دن ادھیڑ نیل کنٹھ نے پوچھا، ''تمھارے اس ناکام عاشق کی کیا خبر ہے؟ اتنے برسوں میں تمھارے نام ایک خط بھی نہیں لکھا۔؟''

چارولتا کے ٹھہرے ہوئے خون میں اچانک آگ لگ گئی۔ اس شخص کی کیا مت ماری گئی ہے؟ اتنے برسوں تک یہ اس خط کو ہی ڈھونڈھ رہا ہے؟ اگر مل جاتا تو کیا کر لیتے؟ چارولتا پر اور زیادہ ظلم کرتے؟ شکّی من کو واہ واہی دیتے؟ زندگی بھر اس نامعقول جذبے کو لے کر اپنے کو پریشان کرتے رہے۔ لیکن فوراً ہی چارولتا پرسکون ہو گئی۔ خون میں اٹھا ابال اندر ہی اندر بیٹھ گیا۔ آہا! سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے اس آدمی کے پاس۔ وہ بھی کس لیے؟ ایک بے معنی سی بات کے لیے؟

اب بھی چارولتا کے گھر سُرما کا آنا جانا ہے۔ کافی بعد میں اس نے شادی کی۔ آرام سے نہیں ہے لیکن کیا کرے۔ دنیا کے جنجال میں پس رہی ہے وہ۔ سُرما کو لے کر نیل کنٹھ پر چارولتا نے کبھی کوئی شک تو نہیں کیا؟ پھر نیل کنٹھ کا یہ فضول کا شک کیوں؟ نیل کنٹھ کیا سوچ رہا ہے کہ ابھی بھی اس ناکام عاشق کے ساتھ اس نے تعلق قائم کر رکھا ہے اور یہ سب کچھ اس کے پیٹھ پیچھے ہو رہا ہے۔

چارولتا کے نام ایک عشق نامہ مل جانے کے بعد شاید اتنے برسوں سے من کے اندر چھپی نفرت کو ختم کرنے کے لیے انھیں موقع مل جائے۔ تب تو بہت اچھا ہوگا۔ چارولتا جانتی ہے، آج ان کے نام ایک لاکھ عشقیہ خطوط آئیں تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ نیل کنٹھ اس پر شک کرے یا نہ کرے، اس سے اس کو کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔ نیل کنٹھ کی زندگی میں اب اس کی اہمیت ختم ہو رہی ہے۔ اور کچھ دن منہ بند رکھ کے وہ بے خوف جی سکتی ہے۔ کسی بھی طرح کی جھوٹی باتیں اس کی ریاضت کو برباد نہیں کر پائیں گی۔

اچانک چارولتا کے من میں ایک حیرت انگیز خواہش جاگ اٹھی۔ سچ ہے! زندگی میں اس لازوال محبوب سے ایک بھی محبت نامہ اس کو نہیں ملا۔ اتنی بڑی زندگی بغیر عشق کے گزر گئی۔ محبت نہ ملی نہ سہی، ایک محبت نامہ حاصل کرنے کی قابلیت بھی اس میں نہیں؟ زندگی کیا پھر ایسے ہی بے مطلب ختم ہو جائے گی؟ اتنی طویل زندگی میں اس نے پھر کیا پایا؟

اس کو ضمیر سے ایک رمز بھری آواز سنائی پڑی۔ تیرا عاشق تیرا انتظار کر رہا ہے، محبت نامہ آ رہا ہے!

ادھیڑ چارولتا کا روم روم رومان سے بھر گیا۔ روح مسرور ہو اٹھی، اس کو محسوس ہوا۔ انجانے میں ہی وہ اس محبوب کے محبت نامے کا بے صبری سے انتظار کرتی رہی۔

اب اور انتظار کرنے کی قوت برداشت نہیں ہے اس میں۔

کب آئے گا وہ؟ محبت نامہ میں وہ لازوال خبر!

چارولتا ہر دن ڈاک کا انتظار کرتی رہی۔ ڈاک آتے ہی الھڑ لڑکی کی طرح بے صبر ہو اٹھتی اور پھر خط دیکھ

کر نا امید ہو جاتی۔

نیل کنٹھ نے اس کی ایسی حرکت دیکھی۔ ایک دن تیوری پر بل دے کر پوچھا، ''کس کے خط کا انتظار کر رہی ہو؟ کہیں سے کوئی خط آنے والا ہے کیا؟''

''ہاں ہے۔''

''کہاں سے؟''

''نہیں جانتی۔ پھر بھی آئے گا ضرور۔'' بے دلی سے چارولتا نے جواب دیا۔

نیل کنٹھ نے غصے سے تلملا کر پوچھا، ''تم نے کیسے جانا؟''

''جانتی ہوں خواب میں مجھ سے کسی نے کہا ہے۔''

''نان سنس....! نیل کنٹھ غصے سے بھڑک اٹھے۔

سچ ہی ایک دن وہی عشق نامہ آ پہنچا۔ خط کے کھلتے ہی ہوا میں خوشبو پھیل گئی۔ رنگین ہوا تھیں باسی پھولوں کی پنکھڑیاں۔ نیل کنٹھ خط پڑھ کر بے حس سے ہو گئے۔

''جان من تم آؤ۔ میں ابد سے انتظار کر رہا ہوں۔ تم خوشبو بن کر پھیل جاؤ، اور میرے ضمیر میں بس جاؤ، تم نغمہ بن کر میری روح میں مل جاؤ۔ آؤ میں انتظار کر رہا ہوں۔''

چارولتا کی طرف خط پھینکتے ہوئے نیل کنٹھ نے پوچھا، ''اس بے نام خط کو بھیجا کس نے ہے؟ کس کی ہے یہ حماقت؟''

چارولتا بس مسکراتی رہی اور خط پڑھ کر اپنی پینتیس سالہ ازدواجی زندگی کے اس موڑ پر شرما کر رومانیت سے لطف اندوز ہونے لگی۔

نیل کنٹھ نے چارولتا کے ہاتھ سے خط چھین لیا۔ شوہر کے سامنے ادھیڑ چارولتا نے غیر مرد کا عشقیہ خط پڑھتے ہوئے ذرا بھی لحاظ نہیں کیا۔ نیل کنٹھ ایسی بے ہودگی کو برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ خط کو بار بار پڑھ کر اپنا سارا غصہ چارولتا پر نکال دیا۔ برسوں سے جو شک وہ کرتے رہے بے معنی نہیں تھا، یہ جان کر کچھ خوداعتمادی کا تجربہ بھی ہوا۔

چارولتا اب اداس رہنے لگی، دوبارہ خط پڑھنے کی اس نے کوشش نہیں کی۔ شاید بہت پہلے سے وہ جانتی تھی کہ اس طرح کا کوئی خط ضرور آئے گا۔ خط لکھنے والا کون ہے۔ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ چارولتا نے جیسے عہد کر لیا ہو کہ وہ منہ نہیں کھولے گی۔ نیل کنٹھ کے کسی الزام کا کوئی جواب نہیں دے گی۔

ایک دن صبح چارولتا نے اپنا منہ کھولا۔ بولی، ''چلو بہت ہو گیا وہ الزام بھری ازدواجی زندگی۔ اب تیرتھ کرنے چلتے ہیں۔ بدری ناتھ، رشی کیش کیدار ناتھ۔ تن میں تو عمر کا ساتھ دیتے دیتے بدلاؤ آ گیا، لیکن من کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہمالیہ کی برفیلی تیرتھ بھومی پر پاؤں رکھیں گے تو من بھی بڑھ جائے گا، پرسکون اور مطمئن ہو کر تصورات میں غرق ہو جائے گا۔'' چارولتا کی آواز میں سچی التجا تھی۔

نیل کنٹھ مذاق اڑاتے ہوئے بولے، ''تیرتھ یاترا! ادھر تمھارے انتظار میں کوئی بیٹھا ہے اس کا کیا ہوگا؟''

چارولتا نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں، بولی، ''مجھے تو جانا ہوگا۔ انھیں کے پاس۔''

نیل کنٹھ لاپرواہی کے جذبہ سے بولے، ''چلی جاؤ منع کون کر رہا ہے؟ خط جب آیا ہے تو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اتنا کہہ کر چارولتا خاموش ہو گئی۔

سچ میں! ایک دن پختہ عمر کی چارولتا گھر سے غائب ہوگئی۔ نیل کنٹھ صبح کی سیر سے واپس ہوئے تو چارولتا گھر میں نہیں تھی۔ کہاں گئی اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں دی تھی۔ وہ بریک فاسٹ سجا کر اور دو سطر لکھ کر چھوڑ گئی تھی، ضرورت پڑنے پر بچوں کے پاس چلے جانا۔ ان کے ساتھ ٹھیک سے رہنا۔''

نیل کنٹھ غصہ، نفرت، برے خیال اور اضطراب میں جیسے پاگل سے ہو گئے۔ کس سے کہیں گے کی اس عمر میں ایک دنیا دار عورت اپنے نالائق عاشق کا خط پا کر اس کے پاس چلی گئی؟ ایسے جوان بیٹے، بہو، بیٹی، داماد کے سامنے بھی انھیں یہ کہنا پڑے تو بھی ان کی مردانگی کتنی زخمی، لہولہان اور بے عزت ہوگی۔ لیکن بچوں سے اس بات کو چھپایا بھی تو نہیں جا سکتا۔ نیل کنٹھ نے ایک دن انتظار کرنے کے بعد تار دے کر بچوں کو بلا لیا۔ بچوں کے آجانے پر ان سے کہا ''تمھاری ماں کا دماغ پھر گیا، معلوم نہیں ایسا کیا ہوا؟ کس کے پاس گئی ہے میں جانتا ہوں لیکن نام پتہ مجھے نہیں معلوم۔ باقی تم اور کچھ مجھ سے مت پوچھو۔ اب بتاؤ کیا کیا جائے۔'' نیل کنٹھ بہت بے بس لگ رہے تھے۔ ایک باپ کی حیثیت سے اپنے بچوں کی ماں کے داغ دار ماضی اور برے کردار کے بارے میں بتانے کے لیے ان کی دانشمندی انھیں روک رہی تھی۔ لیکن بچے بضد ہو گئے، ''کھل کر نہیں کہیں گے تو ماں کو ڈھونڈھنے کہاں جائیں گے؟ اگر عزت اور وقار کی وجہ سے ناراض ہو کر کہیں چلی گئی ہے اور آپ کو معلوم ہے تو پھر کہنے میں ہرج کیا ہے؟''

''روٹھ کر یا ناراض ہو کر نہیں گئی ہے۔ وہ یہاں نہیں رہنا چاہتی تھی اس لیے چلی گئی۔ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اب اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ باقی کے دن کسی طرح کاٹ لوں گا۔'' نیل کنٹھ دکھ بھرے لہجے میں بولے۔ اس درمیان غصہ سرد پڑ چکا تھا۔

بچے زور دے کر بولے ''آپ کو ضرورت نہیں ہے تو کوئی بات نہیں، لیکن ہمیں ماں کی ضرورت ہے، ہمیں پتہ دیجیے۔ ہم ماں کے پاس جا کر انھیں سمجھا بجھا کر لے آئیں گے۔'' نیل کنٹھ مجبور ہو کر بولے، ''بغیر پتہ ٹھکانہ کے ایک بے نام خط سے تم سب کو کیا معلوم ہو پائے گا؟ اسے کس نے بلایا، یہ تو وہی جانے۔ اسی پتے پر وہ چلی گئی۔ اب ہم کچھ نہیں جان پائیں گے،''

اتنا کہہ کر نیل کنٹھ نے شرم و حیا اور بے بسی کے ساتھ بیوی کے بے نام عاشق کا خط بچوں کے ہاتھ میں دے دیا، اور بچوں سے نظریں نہ ملا پانے کی وجہ سے اپنے کمرے میں جا کر دراوزہ اندر سے بند کر لیا۔ بچے خط پڑھ کر ایک دم سے مبہوت ہو گئے۔ وہ پریشان بھی ہوئے اور ساتھ میں خوش بھی۔ ان کی ماں سچ میں کہاں چلی گئی؟ یہ خط کس نے لکھا ہے یہ بات پاپا تو نہیں جان پائے لیکن بچوں سے کچھ بھی نہیں چھپا رہا۔ ایسے ہی لفظوں سے کتنی مرتبہ بچوں کی کاپی میں مضمون لکھا گیا ہے۔ کہیں بچے مضمون نہ لکھ پانے کی وجہ سے سر سے سزا نہ پائیں اس لیے بچوں کی طرح ٹیڑھے میڑھے لفظوں سے ماں خود ان کی کاپی میں مضمون لکھ دیتی تھی تا کہ سر پکڑ نہ پائیں۔ لفظ کے نقل کرنے کی ان کی ماں کی کوشش تب انھیں خوب مزا دیتی تھی۔

اس خط میں بچوں کی نقل کر کے اس کو ملا جلا کر ماں نے ایک خوبصورت نظم لکھی تھی۔ شاید پاپا کے لیے ہی۔ ماں کے نام خط ہونے کے باوجود خط پاپا نے ہی کھولا ہوگا پھر انھوں نے ماں کے لفظوں کو کیسے نہیں پہچانا؟ ویسے پاپا نے کبھی بچوں کی کاپی دیکھی نہیں تھی۔ ماں نے کبھی پاپا کو خط لکھا نہیں تھا۔ شاید تناؤ کے چلتے پاپا نے ان ٹیڑھے میڑھے لفظوں کو دیکھا نہیں ہوگا۔ لیکن ماں نے ایسا کیوں کیا؟

نیل کنٹھ کو کوئی جواب نہیں سمجھ میں آ رہا تھا۔ چارو لتا کے لفظوں کو لے کر ابھی بھی ان کے من میں شک ہے۔ چارولتا اپنے ہی نام سے ایسا خط کیوں لکھے گی بھلا؟ شاید کوئی اور.....!

چارولتا کو ڈھونڈھنے کے لیے صرف ایک ہی جگہ ہے، بس ایک ہی جگہ۔ وہ ہے ہمالیہ کی تیرتھ بھومی۔

عورتوں کے گھر چھوڑ کر سنیاس لینے کی مثال سے تاریخ خاموش ہے، پھر بھی نیل کنٹھ بچوں کو لے کر تیرتھ یاترا پر نکل پڑے۔ من تھا کہ اب بھی تشویش سے گھرا ہوا تھا، چارولتا نے اگر خود ہی خط لکھا تھا، تو پھر وہ کس کے پاس چلی گئی؟ شاید تیرتھ استھان ہی ہے اس کے ماضی کا عاشق۔ چارولتا کیا سچ میں ہی تیرتھ بھومی ڈھونڈھ رہی تھی؟

ہمالیہ کے برف سے ڈھکی ہوئی ویرانی میں چارولتا انھیں مل گئی، وہ تصورات میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کو باہر کا علم نہیں تھا چارولتا کو باری باری سے سبھی نے چھوا، ہزار بار پکارا، شوہر بچے کسی کے بھی لمس کا اس نے جواب نہیں دیا۔ دینے لینے کی مادّی زندگی کا خاتمہ کر کے چارولتا ابدیت کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔

ہوا لی کر دنیا جہان کے پردے میں مستقل بیٹھی وہ کسی گہرے لمس کا انتظار کر رہی تھی، جو اس کے خوبصورت تن میں جذب ہو کر عشق سے لبریز روح کے اتصال کے لیے ہے، تبھی وہ نجات پا کر دوشیزگی حاصل کر کے جاودانی کی طرف بڑھے گی، شبہے کی پراگندگی سے اوپر، تشویش، بدنامی، نیک نامی، خلش، مداخلت اور موت سے اوپر اٹھ کر یقین کے اس لامتناہی آفاق کی طرف، عشق کی حیاتِ جاودانی کے لیے!

■

Rushda Khatoon D/o Bilal Husain, Ward No: 10, Kharka, Faqeerabad, Sarai Aqil, Koshambi-212216 (UP)

بلال احمد

سوائن فلو

ڈریں نہیں لڑیں!

یہ ایک حاد متعدی تنفّسی مرض ہے جو ایک نئے انفلوئنزا وائرس کے ذریعے پھیلتا ہے اور یہ Swine flu virus/H_1N_1 Novel virus کے نام سے جانا جاتا ہے۔

لیکن یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس نئے Influenza-A virus (H_1N_1) کو Swine flu کا نام کیوں دیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس وائرس کو شروع میں تجربہ گاہ کے اندر isolate کیا گیا تو یہ اندازہ ہوا کہ اس کے زیادہ تر gene اس وائرس کے اندر موجود Gene سے مشابہت رکھتے ہیں جو وائرس بالعموم نارتھ امریکہ کی Pigs کے اندر circulate کرتا ہے لہٰذا اس H1N1 کو بھی North American pig virus کی طرف منسوب کرتے ہوئے اسکا نام Swine flu رکھ دیا گیا۔ لیکن مزید تحقیق اور تجربہ کے بعد یہ نتیجہ سامنے آیا کہ یہ وائرس اپنے Gene کے اعتبار سے Animal virus سے بالکل مختلف ہے کیونکہ Human Influeza A virus کل آٹھ (8) RNA strands gene پر مشتمل ہوتا ہے جس میں سے 5 جین خنزیر سے 2 پرندوں سے اور ایک انسان سے منتقل ہوکر ایک جگہ Rearrange ہوتا ہے اور اس سے ایک نیا وائرس بنتا ہے جو صرف انسانوں کے درمیان ہی پھیلتا ہے۔

سوائن فلو سے پہلے بھی کئی مرتبہ Influenza A وائرس عالمی پیمانے پر پھیل چکا ہے جبکہ اس کے برعکس دوسرے انفلوئنزا وائرس اتنے بڑے پیمانے پر انسانی جان کے لیے خطرے کا باعث نہیں ہوتے کیونکہ تمام انفلوئنزا وائرس اپنے اندر موجود Matrix Protin اور antigin Nucleoprotein کی بنیاد پر الگ الگ خصوصیات کے حامل ہوا کرتے ہیں اور اس میں influnza- A virus اپنی سطح پر موجودہ Haemaglutanin(H), anitigens اور Neuraminadase(N) کی بنیاد پر دوسرے انفلوئنزا وائرس سے مختلف ہوتے ہیں ان میں سے (H)antigen کے ذریعے یہ وائرس Host cell سے منسلک ہوا کرتے ہیں جبکہ (N)antigen کی مدد سے یہ وائرس Host cell کو degen erate کرکے اس بیماری کو پھیلانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ H_1N_1 کے اندر ایک خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ کچھ سالوں کے اندر یہ خود کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اسی بنیاد پر یہ influenza A virus اپنی ہیئت کو تبدیل کرکے وبا پھیلاتے ہیں جو آج تک انسانی جان کے لیے ایک بڑا خطرہ بنا ہوا ہے اور جب بھی کسی نئے وائرس کے خلاف کوئی مضبوط لائحہ عمل بنایا جاتا ہے تب تک وہ وائرس خود کو تبدیل کرچکا ہوتا ہے اور دوبارہ سے وہ نئے وائرس کے طور پر انسانی جان کے لیے ایک بڑا خطرہ بن چکا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر 1918 میں Spanish influenza پھیلا اور پھر 1977 یہاں تک کہ 2009 میں یہ عالمی پیمانے پر وبا کے طور پر پھیلا۔ اس کے علاوہ 1957 میں Asian (H_2N_2) influnza بڑے پیمانے پر پھیلا اور 1968 میں Hong Kong influenza (H3N3) پھیلا۔

علامات و نشانیاں:

• اس مرض کی مختلف علامات یہ ہیں:

Systemic Symptom

(1) درد سر (پورے سر اس کے اگلے حصے میں (2) بخار ٹھنڈک کے احساس کے ساتھ (100-105 °F) (3) بدن میں چستی اور پھرتی کا نہ ہونا۔ (4) عضلاتی درد (پیروں اور پیٹھ) (5) جوڑوں کا درد

تنفسی علامات :Respiratory symptoms

(1) کھانسی (2) گلے میں خراش

تنفّسی علامات آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں اور Systemic علامات دھیرے دھیرے کم ہوتی رہتی ہیں اور تنفّسی علامات ایک ہفتے سے زیادہ قائم رہتی ہیں:

بصری علامات Ocularsignandsymptom

(1) روشنی سے تکلیف ہونا (Photophobia)

(2) آنکھوں میں جلن (Burning of eye)

(3) آنکھوں میں درد (Pain on eye movement)

GIT symptom

(1) قے (vomiting)

(2) اسہال (Diarrhoea)

جسمانی علامات Physical sign

(1) تمتماہٹ (Flushing of face)

(2) جلد کا گرم اور روکھا ہونا (Hot & Dry skin)

(3) گردن کے غدود کا بڑا ہونا (Cervical lymphadenopaty)

تشخیص و امتحان Investigtion

Throat swab , Nasopharyngeal wash

Sputum

مندرجہ بالا طریقوں کی مدد سے Tissue clture کے ذریعے virus کو isolate کرتے ہیں:

Rapid viral Test - immunologic & enzynutic Technique use

Haemaglutanin Inhibition Technique

اس virus کو isolate کرنے کے لیے ہندوستان میں کچھ خاص مرکز Centre ہیں جہاں پر swine flu کے وائرس کو isolate کیا جاسکتا تھا جیسے:

Influenza centre-Coonoor

Haffkin institute - Mumbai

AIIMS - New Delhi

V.B.P. chest institute - New Delhi

Armed force Medical college (Poona)

School of tropical medicine (Kolkata)

سوائن فلو سے کیسے بچیں:

(1) تناؤ (stress) سے محفوظ رہنے کی کوشش کریں کیونکہ ذہنی تناؤ ہمارے مدافعتی نظام کو بھی متاثر کرتا ہے اسی لیے یہ کہا جاتا ہے ''سوائن فلو سے ڈرنا نہیں لڑنا ہے''۔

(2) وزن کو کم کریں تحقیقاتی تجربے سے یہ بات سامنے آئی کہ سوائن فلو سے مرنے والے لوگوں میں موٹاپے کے شکار لوگ زیادہ تھے۔

(3) زیادہ مقدار میں Fluid کا استعمال کریں کیوں کہ زیادہ مقدار میں پانی یا liquid لینے سے بدن کے اندر رطوبت کی کمی نہیں ہوتی ہے اور اس کی مدد سے ہمارے مدافعتی نظام کے زیر اثر بالائی نظام تنفس سے تعدیہ بآسانی washout ہوسکتا ہے۔

(4) اچھی غذا کا استعمال کرنا۔ خاص طور سے پروٹین اور وٹامن۔

(5) ابالے ہوئے پانی (Boiled water) کو Sip کرکے پئیں۔

(6) چائے کا استعمال کریں۔ لیکن Coffee کا استعمال نہ کریں کیونکہ اس کے استعمال سے نظام تنفس Dehyderate ہوجائے گا جو نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔

(7) کھانسی اور چھینک کے وقت منھ کو ڈھک لیں۔

(8) بہتی ناک Running Nose کو Tissue paper سے صاف کرکے کوڑے دان میں ڈالیں۔

(9) جب باہر سے گھر میں داخل ہوں تو ہاتھ کو صابن یا Hand wash سے دھولیں۔

(10) ہر وقت انگلیوں سے ناک منھ اور آنکھ کو مَس Touch نہ کریں۔

(11) بھیڑ بھاڑ Public place پر جانے سے حتی الامکان گریز کریں۔

(12) سفر میں احتیاط رکھیں۔

(13) بھپارہ اور Steam-bath کریں۔

(14) نیم گرم پانی سے غرارہ کریں جس میں کھانے کا نمک 10 گرام، کالی مرچ 10 عدد، سونٹھ 10 گرام شامل کرلیں۔

(15) Mobile Phone کو Disinfect کریں۔

گھریلو ادویات اور غذا

(1) Vitamin C کا استعمال کریں جیسے آملہ، امرود، لیموں، سنترہ وغیرہ۔

(2) ہری سبزیوں اور پھلوں کا زیادہ استعمال کریں۔

(3) شہد کا استعمال کریں۔

(4) ہلکی غذا لیں اور کم مقدار میں کھانا کھائیں۔

(5) Lemon oil کا استعمال کریں۔

(6) زیادہ پکا ہوا کھانا نہ کھائیں۔

(7) کھانے کو کم تیل میں بنائیں۔

(8) ہلدی کے پاؤڈر کو Capsule کی شکل میں دودھ کے ساتھ لیں۔

> **یونانی طب کے نقطہ نظر سے یہ ایک ایسی بیماری ہے جو خلط دم کے فساد کی وجہ سے وجود میں آتی ہے اور اس بیماری کے تعلق سے یونانی کتابوں میں جو کچھ مواد موجود ہے وہ نزلہ حار اور نزلہ وبائیہ کے نام سے موسوم ہے۔ Swine flu میں Blood cell کے اندر خرابی لاحق ہوتی ہے اور نزلہ وبائیہ میں بھی خون کے فساد کا ذکر ہے لہٰذا اسی اصول علاج کو سامنے رکھتے ہوئے اگر سوائن فلو کا علاج کریں تو Virus کے اثرات سے جسم انسانی کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے کیونکہ اگر ہم آج یہ جان گئے ہیں کہ یہ ایک Viral disease ہے اور اس کا علاج Antiviral سے ممکن ہے**

(9) شراب نوشی سے مکمل پرہیز کریں۔

(10) خنزیر کے گوشت سے پرہیز کریں۔

سوائن فلو پھیلنے کے دوران یہ بات Internet اور Magazine کے ذریعے تشہیر کی گئی کہ سوائن فلو اور Pork meet میں کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے اس کا گوشت کھانے سے فرق نہیں پڑتا لیکن جہاں تک ہماری رائے ہے کہ ایسا اس لیے کیا گیا کیونکہ بہت سارے ممالک میں اس کا گوشت بڑی مقدار میں کھایا جاتا ہے اور ان ممالک کی معیشت کافی حد تک اس کے گوشت پر منحصر ہوتی ہے اس لیے ان حکومتوں نے ایسی خبریں شائع کراکے اپنی معیشت کو بچانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ اس وائرس کے Component میں خنزیر کے اندر پایا جانے والا وائرس ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتا ہو اور اس کا گوشت کھانے سے کوئی نقصان نہ ہو یا اس کے آس پاس رہنے سے اس وائرس کے ذریعے پھیلنے والی بیماری کا خدشہ نہ ہو۔

یونانی طبی نقطہ نظر

یونانی طب کے نقطہ نظر سے یہ ایک ایسی بیماری ہے جو خلط دم کے فساد کی وجہ سے وجود میں آتی ہے اور اس بیماری کے تعلق سے یونانی کتابوں میں جو کچھ مواد موجود ہے وہ نزلہ حار اور نزلہ وبائیہ کے نام سے موسوم ہے۔

Swine flu میں Blood cell کے اندر خرابی لاحق ہوتی ہے اور نزلہ وبائیہ میں بھی خون کے فساد کا ذکر ہے لہٰذا اسی اصول علاج کو سامنے رکھتے ہوئے اگر سوائن فلو کا علاج کریں تو Virus کے اثرات سے جسم انسانی کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے کیونکہ اگر ہم آج یہ جان گئے ہیں کہ یہ ایک Viral disease ہے اور اس کا علاج Antiviral سے ممکن ہے لیکن ہمیں یہ بھی سوچنا ہوگا کہ اس وائرس کے ذریعے Blood cell کی Chemistry میں اگر خرابی لاحق ہوتی ہے تو اس فساد دم کو درست کرنا اولین مقصد ہونا چاہیے تاکہ خون کا مدافعتی نظام بہتر ہوسکے اور اس بیماری سے آزاد ہونے کے لیے ہمارے جسم کا نظام کمزور نہ پڑنے پائے لہٰذا آج اگر ہم اس وائرس کے اثرات سے پورے طور پر بچنا چاہتے ہیں تو یونانی طریقہ علاج کو اپنائے بغیر ممکن نہیں۔

یونانی علاج

برگ تلسی 5 گرام عناب 5 عدد، بہدنہ 6 گرام، سپستاں 9 عدد، ایرسا 6 گرام، فلفل سیاہ 5 عدد، اصل السوس 6 گرام، زنجبیل 6 گرام کو پانی میں جوش دے کر صاف کریں پھر شہد کے ساتھ صبح شام پلائیں

کچھ مرکب ادویہ یہ کبھی بھی استعمال کی جاسکتی ہیں۔

انفیوزا، تریاق نزلہ، لعوق خشخاش، شربت اڑوسہ، شربت زنجبیل، حب سعال، شربت بنفشہ، لعوق نزلی آب تربوز والا۔

اگر Swine flu, WHO سے بچنے کے لیے مزکورہ بالا تدابیر کی روشنی میں یونانی طریقہ علاج کو ملحوظ رکھے تو اس کے بہتر نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

■

Dr. Belal Ahmad (Guest Faculty), Do/Amraze Jild, AKTC, AMU, Aligarh, 202001- (UP)

رضی شہاب

قوالی کی روایت
اور
ہندوستانی مشترکہ تہذیب

برصغیر ہندو پاک میں جب مسلمانوں کی آمد ہوئی تو یہاں کے سیاسی منظرنامے کے ساتھ ساتھ تہذیبی و سماجی فضا بھی دھیرے دھیرے بدلنے لگی۔ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہر فاتح قوم مفتوح قوم کی تہذیب وتمدن کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب دو تہذیبیں آپس میں شیر و شکر ہو جاتی ہیں اور پھر اس ملے جلے خمیر سے ایک الگ تصویر متشکل ہو کر عوام کی چشم بینا کے سامنے آتی ہے۔ کچھ ایسے ہی پس منظر میں ہماری گنگا جمنی تہذیب نے جنم لیا۔ یہ تہذیب مسلمانوں کی تھی نہ ہندوؤں کی اور نہ ہی سکھوں کا اس پر قبضہ تھا۔ یہ تہذیب ہر خاص و عام ہندوستانی کی پہچان تھی۔ فن موسیقی جس کی ہمارے یہاں ایک قدیم تاریخ رہی ہے، اس پر بھی باہر سے آنے والی قوموں کی تہذیب کا اثر ہوا۔ قوالی بھی موسیقی کی ایسی ہی ایک صنف ہے جو ہماری مشترکہ تہذیب کی ایک اہم نشانی اور یادگار ہے۔

’قوالی‘ لغت کے اعتبار سے اردو زبان کا لفظ ہے جو عربی لفظ ’قول‘ سے ماخوذ ہے۔ قول کے معنی بات کہنا، اظہار کرنا، تائید کرنا، تعلیم دینا اور گفتگو وغیرہ ہیں۔ اسی سے لفظ ’قوّال‘ بنا ہے۔ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ اس میں جو الفاظ ’فعّال‘ کے وزن پر ہوتے ہیں یا تو وہ مبالغے کے لیے ہوتے ہیں یا پھر ان سے کسی پیشے کا اظہار ہوتا ہے۔ جیسے اکّال (بہت زیادہ کھانے والا)، طبّاخ (باورچی یا کھانا بنانے والا)۔ ایسی صورت میں قوال کے معنی یا تو فراٹے سے بولنے والا ہوگا یا پھر ایک خاص قسم کے نغمات گانے والے کو قوّال کہیں گے۔ عام طور پر قوالی کے عام معنی صوفیانہ نغمہ، عارفانہ کلام یا گیت کے لیے جاتے ہیں جبکہ اسے گا کر سنانے والا قوّال کہلاتا ہے اور قوال جو کلام گاتے ہیں اسے ’قول‘ کہا جاتا ہے۔

قوالی موسیقی کی ایک قسم ہے جو ’عراقی موسیقی کی نقل‘ ہے (قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، 210)۔ دراصل یہ پر عقیدت اور وجد و حال میں ڈوبی موسیقی ہوتی ہے جو بندے کو خدا سے جوڑتی ہے۔ یہ عابد اور معبود کے بیچ ایک کڑی ہے۔ عبادت اور دعا کا ایک روپ سمجھی جاتی ہے۔ قوالی کو علم و عرفان اور معرفت کا ایک ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں شبدوں (قول) کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ قوالی کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں الفاظ کو الگ الگ طریقے سے نکھار نکھار کر گایا جاتا ہے اور ہر بار کسی خاص مقام پر خیال مرکوز کرنے کی وجہ سے مختلف قسم کے احساسات جنم لیتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے قوال قول کو دہراتا ہے، شبد بے معنی ہوتے جاتے ہیں اور سننے والوں کے لیے فقط ایک پرسکون احساس باقی رہ جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر گانے اور سننے والے سبھی بے خودی کی کیفیت میں ڈوب جاتے ہے۔ یہی قوالی کی کامیابی بھی ہوتی ہے جب قوال اور سامع سبھی ایک ہی حالت سے محظوظ ہو رہے ہوتے ہیں۔ قوالی میں جو قول یا شبد گائے جاتے ہیں ان کے موضوعات مخصوص ہوتے ہیں مثلاً حمد، جس میں خدائے عز وجل کی حمد و ثنا اور تعریف و توصیف بیان کی جاتی ہے۔ نعت، جس میں محبوب خدا، نبی محترم کی خدمت میں عقیدت و محبت کے پرخلوص نذرانے پیش کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح سے منقبت و مناجات وغیرہ کو قوالی میں پیش کیا جاتا ہے۔ موسیقی کی یہ صنف صوفیائے کرام کی سرپرستی میں پروان چڑھی۔ خدائے واحد کی جستجو میں سرگرداں صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں اس نے اپنا سفر شروع کیا اور سن بلوغ کو پہونچی۔

ہندوستان سے قبل ایران، افغانستان، عراق اور مشرق وسطی میں قوالی کا بڑا زور وشور تھا۔ چونکہ ان ممالک میں یہود و نصاری جیسی قومیں آباد تھیں جن کی عبادات میں موسیقی و راگنی وغیرہ کو اہم مقام حاصل ہوتا ہے۔ (قوالی اور اسلام، ص 25) دسویں صدی عیسوی سے پہلے اس کا وجود عرب میں پایا جاتا تھا۔ اس بات کا سراغ موسیقی کے موضوع پر عربی زبان میں لکھی گئی قدیم کتاب ’الاغانی‘ میں ملتا ہے۔ اس میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ اس زمانے کے موسیقار ٹولیاں بنا کر گاتے تھے۔ موسیقاروں

کی یہ ٹولیاں ایک ہی گانے میں یکے بعد دیگرے شامل ہوتی تھیں اور گانے کے مختلف حصے گایا کرتی تھیں۔ ایسی ٹولیوں کو عربی میں 'نوبا' کہتے تھے۔ (امیر خسرو اور ہمارا مشترکہ کلچر، ص۔ 74) آٹھویں صدی میں سنگیت کی اس صنف نے ایران میں دستک دی۔ گیارہویں صدی میں ایران سے اس طرز نے ترکی اور ازبکستان کا سفر کیا اور تیرہویں صدی میں اس نے ہندوستان میں اپنا جلوہ بکھیرا۔ مگر یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آج ہندوستان کے اندر جو قوالی موجود ہے وہ بلاد اسلامیہ اور ایران کے تمام ممالک سے مختلف اور جدا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ 'یہ از روئے آغاز و چلن اول و آخر برصغیر کی اپنی چیز ہے'۔ (ہند اسلامی تہذیبی ارتباط اردو غزل اور قوالی کا چلن، ماہنامہ آجکل، جنوری 2004، ص 3) جبکہ ہندوستان میں قوالی کے آغاز کی تاریخ کے سلسلے میں آتا ہے کہ جب مسلمانوں کی آمد ہندوستان میں ہوئی اور انہوں نے دیکھا کہ یہاں آباد قوموں کی عبادتوں میں بھجن، کیرتن، راگ، گانا، موسیقی، رقص اور ناچ وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے تو انھوں نے اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے یہاں موجود لوگوں کی ذہنیت اور نفسیات کے پیش نظر اسلام کو منظوم طور پر پیش کرنا شروع کیا اور دینی اشعار کو خوش کن آواز اور خوش الحانی سے پیش کرنے لگے۔ البتہ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس میں موسیقی وغیرہ کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ صوفیا کی اصطلاح میں یہ چیز 'سماع' کہلاتی تھی۔ سماع کے معنی سننا اور رقص و سرود کے ہیں۔ صوفیوں کے یہاں اس کا معنی ہوتا ہے 'دھیان کی حالت میں پرعقیدت موسیقی میں ڈوب جانا' (قوالی کا سفر، آج کل جنوری، 2003، ص۔ 13) یا 'ایسے قول یا اشعار وغیرہ کا سننا جن سے روح میں اہتزاز ہو، کچھ لذت محسوس ہو اور قبض کی کیفیت دور ہو کر بسط پیدا ہو جائے'۔ (خواجہ نظام الدین اولیا اور سماع صوفیہ، ماہنامہ آجکل، جنوری 2003، ص 12)

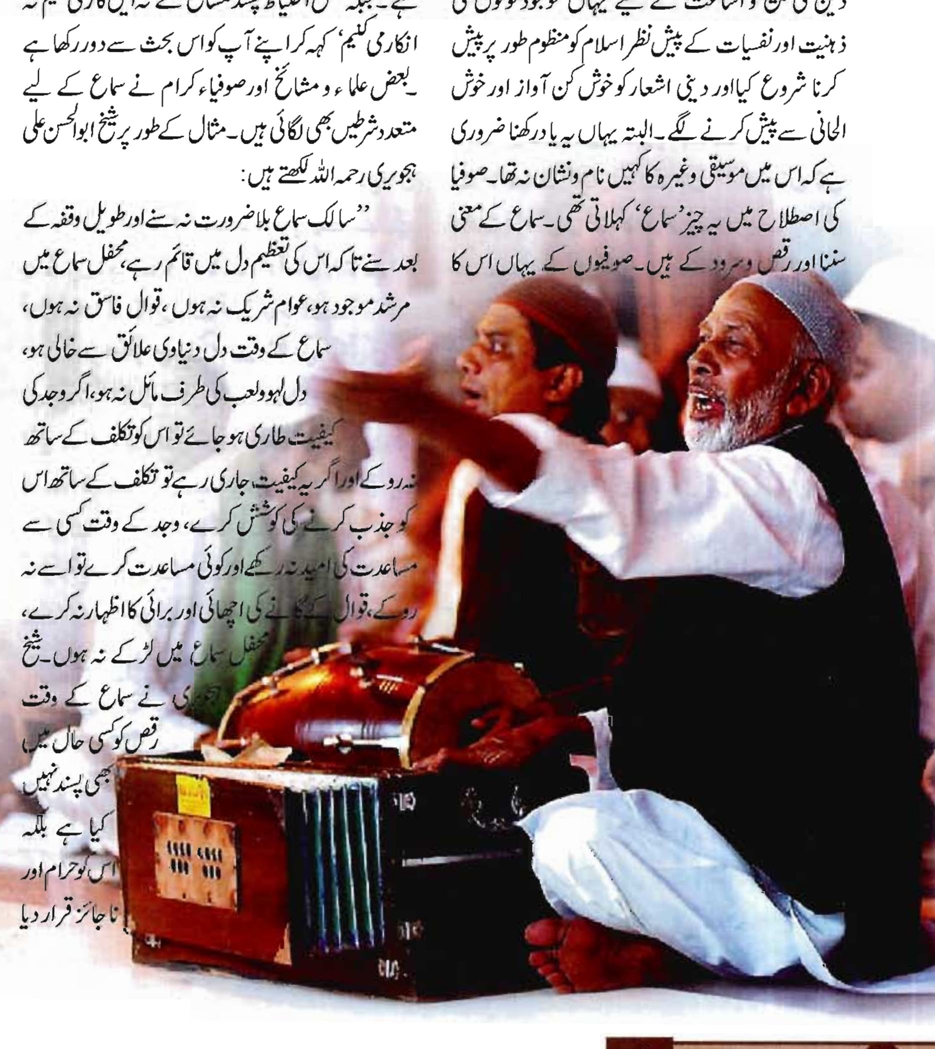

موسیقی کی قسم جسے ہم قوالی (سماع) کہتے ہیں وہ صوفیوں، فقیروں اور بزرگوں کی دین ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ آج قوالی کی موجودہ شکل کو ہم سماع کا نام نہیں دے سکتے، جو قوالی کی اصل ہے۔ تقریباً سبھی صوفی سلسلے میں سماع موجود ہے۔ سلسلۂ چشتیہ کو اس میں اولیت حاصل ہے۔ چونکہ ان کے یہاں سماع جائز تھا، اسی لیے ان کے یہاں ذوق سماع اتنا بڑھا کہ وہ ان کی خانقاہوں کی پہچان اور خاص حصہ بن گیا۔ جبکہ قادری، نقشبندی اور سہروردی سلسلے کے بعض خانوادوں میں سماع نہیں ہے، بعض میں ہے۔ اسی طرح بعض مشائخ نے اسے روحانی ترقی کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ بعض کے یہاں یہ حرام ہے، بعض نے اسے مزامیر کے ساتھ ممنوع قرار دیا ہے۔ جبکہ بعض احتیاط پسند مشائخ نے 'نہ ایں کار می کنیم نہ انکار می کنیم' کہہ کر اپنے آپ کو اس بحث سے دور رکھا ہے۔ بعض علماء و مشائخ اور صوفیاء کرام نے سماع کے لیے متعدد شرطیں بھی لگائی ہیں۔ مثال کے طور پر شیخ ابوالحسن علی ہجویری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''سالک سماع بلاضرورت نہ سنے اور طویل وقفہ کے بعد سنے تاکہ اس کی تعظیم دل میں قائم رہے، محفل سماع میں مرشد موجود ہو، عوام شریک نہ ہوں، قوال فاسق نہ ہوں، سماع کے وقت دل دنیاوی علائق سے خالی ہو، دل لہو و لعب کی طرف مائل نہ ہو، اگر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے تو اس کو تکلف کے ساتھ نہ روکے اور اگر یہ کیفیت، جاری رہے تو تکلف کے ساتھ اس کو جذب کرنے کی کوشش کرے، وجد کے وقت کسی سے مساعدت کی امید نہ رکھے اور کوئی مساعدت کرے تو اسے نہ روکے، قوال کے گانے کی اچھائی اور برائی کا اظہار نہ کرے، محفل سماع میں لڑکے نہ ہوں۔ شیخ ہجویری نے سماع کے وقت رقص کو کسی حال میں بھی پسند نہیں کیا ہے بلکہ اس کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے۔'' (رسالہ کشف الاسرار بحوالہ بزم صوفیہ، ص 40)

خواجہ نظام الدین اولیا نے سماع کے لیے حسب ذیل شرطیں لازمی قرار دی ہیں۔

1. مسمع یعنی سنانے والا لڑکا اور عورت نہ ہو۔
2. مسموع یعنی جو چیز سنی جائے وہ ہزلیات اور فواحش سے پاک ہو۔
3. مستمع یعنی جو سنے وہ صرف خدا کے لیے سنے۔
4. آلات سماع مثلاً چنگ، رباب اور دوسرے مزامیر نہ ہوں۔ (فوائد الفوائد، ص 246، بحوالہ بزم صوفیہ، 276)
5. محفل سماع میں عورتیں نہ ہوں۔ (فوائد الفوائد، ص 95، بحوالہ بزم صوفیہ، 276)

اسلامی شریعت کی رو سے سماع کے جواز و عدم جواز سے قطع نظر میں یہ بیان کرتا چلوں کی صوفیائے کرام کی ایک لمبی فہرست ہے جو سماع کا ذوق رکھتے تھے اور ان کے یہاں سماع کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی، حضرت امیر حسن سنجری، حضرت فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیا، خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی، حضرت شرف الدین احمد ابن یحییٰ منیری، حضرت سید محمد گیسو دراز، حضرت شیخ احمد عبد الحق نوشہ ردولوی، شاہ برہان الدین جانم، شیخ بہاؤ الدین باجن، حضرت شاہ بیدار دہلوی، حاجی وارث علی شاہ، بلھے شاہ، بہلول شاہ صاحب، میراں شاہ، میراں جی بھیک شاہ وغیرہ کے علاوہ ایک طویل فہرست ہے جو سماع کا اعلی ذوق رکھتے تھے اور ان پر سماع کی محفلوں میں وجد و حال کی کیفیتیں طاری ہوتی تھیں۔ ایسے بے شمار واقعات تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں جو ہمیں بزرگان دین کے دوران سماع کے احوال بتاتے ہیں۔ صوفیا کے تذکروں میں آتا ہے کہ دوران سماع ایسے حالات بھی وقوع پذیر ہوئے ہیں جب وجد و حال کی کیفیت سے گزرتے ہوئے کسی درویش کی روح مالک حقیقی سے جا ملی، خود خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کا وصال دوران سماع ہی ہوا تھا۔ صوفیا کرام پر سماع کا اس قدر اثر ہوتا تھا کہ وہ کئی کئی دنوں تک حال کی کیفیت میں رہتے تھے۔ طوالت کے خوف سے ان واقعات کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے جو تہذیب ہندوستان میں رائج ہوئی اسی کا ثمرہ قوالی بھی ہے۔ جس نے خانقاہ شیخ اور سرود و سماع کے تیور ہی بدل دیے۔ جب خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے 1153 میں اپنے آبائی وطن چشت نگر کو الوداع کہہ کر اجمیر کو اپنا

مسکن بنایا، اس وقت سب سے پہلے ہندوستان میں قوالی کا ابتدائی روپ سامنے آیا۔ سوامی واحد کاظمی لکھتے ہیں:

''ان کی خانقاہ میں پہلی بار کچھ ایسی آوازیں اور سروں میں روحانی نغمے سنے گئے جن میں بھکتی تحریک کے بھکت شعرا کی دھڑکنوں جیسے خواص بھی تھے۔ یہ انداز ایسا تھا جیسے دھیرے دھیرے ایک نئی آواز میں کچھ نئے سر یا نئے ڈھنگ اور نئے راگ ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہوں۔ یہ آواز، یہ نیا نغمہ، یہ نیا سر قوالی کا ابتدائی روپ یعنی شکل تھے۔ سب سے پہلے اجمیر کی خانقاہ سے ہندوستان میں مروج ہوئے''۔ (قوالی کا سفر، ماہنامہ آجکل، جنوری 2003، ص 14)

اس وقت کی قوالی کی ہیئت کے بارے میں آگے لکھتے ہیں:

''اجمیر کی خانقاہ میں جو قوالی گائی جاتی تھی اس میں تال کا کام صرف کرخت آواز یعنی ایک خاص ڈھنگ سے تالی بجا کر لیا جاتا تھا۔ سروں کے بھراؤ کے لیے بھی کوئی آلہ استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ اس پورے گانے میں گانے والے صرف اپنی آوازوں سے سر بھرتے تھے۔ شاید اس زمانہ میں گیت کو قوالی کہا بھی نہیں گیا ہوگا کیونکہ قوالی نام بہت بعد کو حضرت امیر خسرو کی دین بتائی جاتی ہے''۔ (قوالی کا سفر، ماہنامہ آجکل، جنوری 2003، ص 14)

بعض مورخین کا ماننا ہے کہ امیر خسرو قوالی کے موجد ہیں۔ جبکہ قوال تو امیر خسرو کو ہی اپنا ابو الآبا سمجھتے ہیں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

''کہا جاتا ہے کہ قوالی میں غزل کا حسن، موسیقی کا روپ اور ارباب دل کا کیف شامل ہوتا ہے، امیر خسرو غزل گو تھے، موسیقی کے ماہر بھی تھے اور صاحب دل بھی تھے۔ اسی لیے قوالی کی ایجاد کے لیے وہ موزوں ہو سکتے تھے۔ وہ اپنے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی مجلس سماع میں مست اور بے خود ہو کر گاتے تے''۔ (سیر الاولیا، ص 16، 515 بحوالہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص 530)

الغرض یہ کہ قوالی موسیقی کی ایک اہم صنف ہے۔ اس کا آغاز ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہوا۔ صوفیا کی سرپرستی میں پلنے والی اس صنف پر ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے اثرات مرتب ہوئے اور اس میں کئی طرح کی تبدیلیاں آئیں۔ یہ وہ تبدیلیاں ہیں جن سے قوالی کو ہندوستان کی اپنی چیز بنا دی۔ ذیل میں ہم ان اثرات اور تبدیلیوں کی بابت مدلل گفتگو کرنے کی سعی کریں گے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں:

''لفظ قوالی غالباً پہلے پہل ترکی میں جلال الدین رومی کے پیروکار، رقصاں اور نغمہ کناں درویشوں (singing and dancing darvishes) کے لیے استعمال ہوا ہوگا، لیکن ہندوستان تک آتے آتے یہ کیا سے کیا ہو گیا اور خانقاہی تصوف کا باقاعدہ حصہ بن گیا۔ اپنی موجودہ شکل میں قوالی اول و آخر ہندوستانی موسیقی اور کلچر کو ہند اسلامی ربط و اختلاط کا حسین تحفہ ہے۔ قوالی بطور دبستان مسلمانوں کی اپنی چیز ہے جو مسلمانوں کی آمد ہند کے بعد عہد وسطی میں ارتقا پذیر ہوئی۔'' (ہند اسلامی تہذیبی ارتباط اردو غزل اور قوالی کا چلن، ماہنامہ آجکل، جنوری 2004، ص 3)

مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستان میں جو مشترکہ تہذیب مروج ہوئی اس کا اثر قوالی پر بھی پڑا۔ ہندوستان میں قوالی کے رواج سے قبل 'قول' دراصل رباعی گانے کا ڈھنگ تھا، جبکہ یہ رباعی عربی زبان میں ہوتی تھی، مجالس سماع میں عربی حرف وصوت کا استعمال زیادہ ہوتا تھا، جنھیں حجاز و عراق والوں کے لحن سے ادا کیا جاتا تھا۔ لیکن وقت کی رفتار کے ساتھ رباعی کی جگہ غزل نے لے لی اور قوالی جس میں پہلے عربی فارسی کا غلبہ ہوتا تھا وہ اس سے یکسر آزاد ہو گئی۔ اب اس میں گایا جانے والا قول عربی، فارسی، برج، ہندوی یا اردو کا کوئی بھی فقرہ ہو سکتا تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ دراصل قوالی کے اندر آنے والی یہ تبدیلی یا لسانی پیوندکاری کی یہ صورت ہی دراصل اس کی اہم خصوصیت ثابت ہوئی اور اس نے ہی اسے لوک کلچر کا حصہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ قول کے ساتھ ہندوستانی راگ راگنیوں اور موسیقی کے استعمال اور مختلف زبانوں میں مختلف مضامین کی شمولیت نے اس کا دائرہ وسیع کر دیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ بلا اختلاف مذہب و ملت قوالی یکساں طور پر مقبول ہوتی چلی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صوفیا کرام (جو دراصل قوالی کے روح رواں تھے) نے یہاں پر آباد لوگوں کی زبان، فہم اور ان کے طبعی میلان کے مطابق قوالی کے قول اور اس کی موسیقی میں کئی اہم اضافے کیے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے بارے میں آتا ہے کہ ان کی اکثر ہندی (دکنی) شاعری موسیقی یعنی راگ راگنیوں کے تابع تھی۔ انھوں نے ہندی اور سنسکرت زبانوں اور ہندی سماع اور موسیقی کو غیر مسلموں پر اثر انداز ہونے کے لیے بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ (رودِ کوثر از شیخ محمد اکرام بحوالہ تصوف اور ادب کا باہمی رشتہ، ص 69-68)

''کہا جاتا ہے کہ قوالی میں غزل کا حسن، موسیقی کا روپ اور ارباب دل کا کیف شامل ہوتا ہے، امیر خسرو غزل گو تھے، موسیقی کے ماہر بھی تھے اور صاحب دل بھی تھے۔ اسی لیے قوالی کی ایجاد کے لیے وہ موزوں ہو سکتے تھے۔ وہ اپنے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی مجلس سماع میں مست اور بے خود ہو کر گاتے۔''

شیخ بہاء الدین باجنؒ فارسی اور ہندی دونوں کے شاعر اور صوفی تھے۔ باجن ان کا تخلص تھا جس کے معنی ساز ہیں۔

موسیقی ہندوستان میں برسوں سے ایک مقدس روایت کی حیثیت سے رائج ہے۔ یہاں کی عبادات کا تصور موسیقی کے بغیر ممکن نہیں۔ بھجن کیرتن صدیوں سے ہمارے مندروں کا حصہ ہیں، قوالی کو بھی اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے جو خانقاہوں میں صدیوں سے زندہ ہے۔

حضرت امیر خسرو جنھیں قوالی کا موجد بھی مانا جاتا ہے، بڑے صوفی اور شاعر تھے۔ موسیقی سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے راگوں میں امتزاج پیدا کرنے والوں میں سب سے ممتاز نام انہی کا ہے۔ ان کے زمانے میں سنسکرت میں دھروپد زیادہ گایا جاتا تھا جو زیادہ تر ہندوؤں کی مذہبی روایتوں پر مبنی ہوتا ہے، مسلمان دھروپد کے تقدس اور اس کی کلاسیکی اہمیت سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا امیر خسرو کے اختراع پسند ذہن نے دھروپد کی جگہ 'خیال' ایجاد کیا۔ جبکہ بعض لوگ اسے امیر خسرو کی ایجاد نہیں مانتے۔ ڈاکٹر سمتی مٹاٹکر کا بیان ہے کہ 'قوالی کے چلنت بولوں اور جزئیات سے خیال کا وجود ہوا۔ اس لحاظ سے بھی خیال امیر خسرو ہی کی ایجاد ہے کیونکہ قوالی بھی خسرو کی اختراع ہے'۔ 'بادشاہ نامہ' کے مصنف لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں خسرو سے پہلے گیت، چند، دھروپد اور اسقت گائے جاتے تھے لیکن خسرو نے کئی خاص چیزیں ایجاد کیں۔ اس نے خاص طور پر چار نام درج کیے ہیں۔ (1) قول، جس میں فارسی اور عربی کے اشعار ہوتے ہیں جو ایک سے چار تال پر گایا جاتا ہے۔ (2) دوسری چیز کا نام لیے بغیر لکھتا ہے کہ اس میں فارسی اشعار ترانہ کے ساتھ ایک تال پر گائے جاتے تھے، شاید قلبانہ ہو۔ (3) ترانہ اس میں اشعار نہیں ہوتے تھے لیکن ایک تال پر گایا جاتا تھا۔ (4) خیال۔ (بادشاہ نامہ ص 6-5 بحوالہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ص 527)

یہ تمام چیزیں قوالی کے قدیم انگ ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں ہیں جن کو امیر خسرو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور وہ قوالی کا حصہ ہیں۔ مثلاً 'من کنت مولاہ، فعلی مولاہ' (میں جس کا مولا و مددگار ہوں یہ علی بھی اس کے مولا و مددگار ہیں) قول کے طور پر کئی صدیوں سے گایا اور پسند کیا جاتا ہے۔ اسی طرح 'چھاپ تلک سب چھین لی رے موسے نیناں ملا کے' بطور سہیلا گائے جاتے ہیں۔ کلاسیکی موسیقی اور گیتوں میں 'خسرو نظام کے بل بل جاؤں' اور 'نظام الدین جگ اجیارو، جگت اجیارو' اور اس طرح کے دیگر بول بکثرت گائے جاتے اور قوالی کا حصہ ہیں۔ امیر خسرو نے کئی اہم ساز بھی ایجاد کیے۔ مثلاً قوالی کی ڈھولک اور ستار وغیرہ کو انہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اگرچہ ہندستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مذہبی سطح پر امتزاج نہ ہوسکا مگر فنون لطیفہ اور موسیقی میں دونوں شیر وشکر ہوکر مکمل طور پر سامنے آئے۔ اسی لیے ہم فنون لطیفہ کی شکل میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے ذہنی امتزاج، ہم آہنگی اور یکسانگی کو واضح شکل میں دیکھ سکتے ہیں۔ 'خیال' مسلمانوں کی ایجاد ضرور ہے تاہم اس کے ہندو بھی متوالے ہیں، دھروپد قدیم اور مقدس ہندو طرز ضرور ہے تاہم مسلمانوں نے اسے اپنانے میں کوئی کوتاہی بھی نہیں کی ہے۔ ہندوستانی موسیقی کی دنیا میں ایسے کئی امیر خسرو، تان سین اور مان سنگھ گوالیاری ہیں جن کو بلا تفریق مذہب یکساں طور پر پسند کیا گیا۔ یہ ہماری گنگا جمنی تہذیب کا اثر ہے کہ استاد بڑے غلام علی 'ہری اوم تست' اور شنکر شمبھو 'من کنت مولا' جیسی قوالیاں گا کر جھومتے اور وجد و حال کی کیفیت سے گزرتے نظر آتے ہیں۔ امیر خسرو کے سارے راگ اور راگنیاں پوربی میں گائے جاتے ہیں۔ گیت اور بھجن بھی اسی میں گائے جاتے ہیں۔ اسی راگ میں حضرت نظام الدین اولیا 'الست بربکم' کی صدا سنتے ہیں، اسی راگ سے میرا بائی نے کرشن کی بنسری سنی تھی اور گورو ہری داس نے گوالوں کی پکار۔ دراصل یہ موسیقی کی وہی دنیا ہے جہاں مسلمانوں اور ہندوؤں میں فرق مٹ سا گیا اور اس کی محفلوں میں ایک ساتھ ان سبھوں کے جذبات کی ترجمانی ہونے لگی۔ قوالی کی یکساں مقبولیت اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ دراصل یہ ہماری مشترکہ تہذیب کا ہی اثر ہے کہ اس دور میں جب فارسی فہمی برائے نام باقی ہے، جب بھی قوال امیر خسرو کا فارسی کلام گانا شروع کرتا ہے تو سامعین جھوم اٹھتے ہیں۔ اسی منظر نامے کو دھیان میں رکھ کر مشہور ناقد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''غالباً قوالی میں برصغیر کے ہندو اور مسلمانوں کے اجتماعی لاشعور کے سر گھلے ملے ہوئے ہیں، اس لیے قوالی بلا لحاظ مذہب و ملت سب کو مرغوب ہوتی چلی گئی اور بیسویں صدی میں غزل کی مقبولیت اور تھیٹر، فلم اور ماس میڈیا کے برقیاتی ذرائع کے ساتھ مل کر قوالی اب مذہبی کے علاوہ سیکولر ہندوستانی سنگیت اور pop culture کا بھی حصہ بن چکی ہے'۔ (ہند اسلامی تہذیبی ارتباط اردو غزل اور قوالی کا چلن، ماہنامہ آجکل، جنوری 2004، ص 3)

ہندوستان قدیم زمانے سے ہی صوفی، سنت، درویش، فقیر، اولیا، ملنگ، یوگیوں اور رشی منیوں کا محبوب مسکن رہا ہے۔ جذبۂ محبت، تصورِ عشق یا بھکتی بھاؤ یہاں ہمیشہ ہی موجود رہے ہیں۔ قدیم زمانے سے ہی مندروں میں بھجن کیرتن کا رواج تھا۔ ڈھولک، جھانجھ، مجیرے اور مردنگ وغیرہ کا استعمال برسوں سے عبادت گاہوں کی سنسکرتی کا حصہ تھا۔ کچھ اسی طرح کی چیز ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ان کے یہاں بھی صوفیا کی کوششوں سے رائج ہوئی، جسے 'ذِکر' کہا جاتا ہے جو کیرتن کے ہم معنی بتایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ماجدہ اسد نے رس خان پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا۔ اس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ رس خان کی برج شاعری میں ذکر کیرتن کا ہی روپ ہے۔ رس خان نے سری کرشن کے وسیلے سے الوہی اسرار کا بیان کیا ہے۔ عبدالواحد بلگرامی نے 'حقائق ہندی' نامی اپنی مشہور کتاب میں ان لفظوں میں پوشیدہ اسرار کی گرہ کشائی کی ہے جو صوفیوں کے تخلیق کردہ غنائیہ تخلیقات میں مستعمل ہوئے ہیں۔ سری کرشن اور رادھا کی محبت کی داستانیں اور راس لیلائیں ان پر اسرار صوفیوں کے دنیاوی واقعات میں الوہی اسرار سے شرابور لگتی ہیں۔ (قوالی کا سفر، ماہنامہ آجکل، جنوری 2003، ص 17)

بھجن کیرتن اور قوالی میں مشابہت بہت حد تک موجود ہے۔ البتہ یہ کہ جانکار لوگ قوالی اور بھجن کے مرتبے میں تفریق کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مشہور ناقد موسیقی مکیش گرگ کا ماننا ہے کہ 'کیرتن کے مقابلے میں قوالی ایک بے مثال گائیکی ہے۔ کیرتن میں بھگوان کے نام کی تال بند طریقہ سے بار بار تکرار کی جاتی ہے قوالی میں بھی یہ ہوتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ بھی اس میں بہت کچھ ہوتا ہے جو کیرتن میں نہیں ملتا۔ ادب کا جیسا لطف قوالی میں ممکن ہے کیرتن میں دکھائی نہیں دیتا'۔ (قوالی کا سفر، ماہنامہ آجکل، جنوری 2003، ص 18) البتہ اتنا ضرور ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے بہت زیادہ الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

الغرض یہ کہ قوالی مسلمان صوفیا کا عطیہ ہے جو ہماری مشترکہ تہذیب کا حصہ ہے۔ اسے سنوارنے، سجانے اور مقبولیت دلانے میں پورے ہندوستان کی محبت شامل ہے۔ موسیقی کی یہ صنف ہماری قدیم تہذیبی و ثقافتی میراث ہے۔ آج جب ہم قوالی کی موجودہ صورت حال پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک لمحہ یہ احساس ہوتا ہے کہ قوالی نے عروج وارتقا کے نئے مدارج طے کیے ہیں، مقبولیت کے نئے منازل حاصل کیے ہیں، سنیما، تھیٹر، ٹیلی ویژن نیز دیگر ذرائع ابلاغ تک رسائی حاصل کر کے موسیقی کی دنیا میں دھوم مچا دی ہے، ہوٹلوں، شادیوں میں اس کی پیشکش نے اس کا معیار بلند کر دیا ہے، آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں نے قوالی کو ہر فرد تک پہنچا دیا ہے، مضامین کے اندر بے تحاشا تبدیلیوں نے اسے مزید عام کر دیا ہے۔ مگر کبھی جب اس کی اصل کی طرف نگاہ لوٹتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ اس قوالی میں تو وہ باتیں ہیں ہی نہیں جو اس صنف کی خاصیت، انفرادیت اور پہچان تھیں۔ اب قوالی محض ایک گانا بن گئی ہے۔ ایسی صورت میں فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ اس تہذیبی ورثے کا مستقبل کیا ہوگا جو تصوف اور بھکتی کے ملن کے زیر اثر ہماری روحانی تربیت کر رہا تھا۔ کیونکہ اب اس کا اصل روپ فقط کچھ مندروں، خانقاہوں اور درگاہوں میں ہی باقی ہے۔

مراجع و مصادر:

1. سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم صوفیہ، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ
2. سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ
3. سوامی واحد کاظمی، قوالی کا سفر، ماہنامہ آجکل، نئی دہلی، جنوری 2003
4. کے کے کھلر، امیر خسرو اور ہمارا مشترکہ کلچر، سیمانت پرکاشن، دریا گنج، نئی دہلی 2، 1983
5. ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ہند اسلامی تہذیبی ارتباط، اردو غزل اور قوالی کا چلن، ماہنامہ آجکل، نئی دہلی، جنوری 2004
6. محمد اشفاق حسین، قوالی اور اسلام، الدار السّلفیہ ممبئی، مارچ 2003
7. پروفیسر نثار احمد فاروقی، خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور سماع صوفیہ، ماہنامہ آجکل، نئی دہلی، جنوری 2003
8. ڈاکٹر نفیس اقبال، تصوف اور ادب کا باہمی رشتہ، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، 2012

■

Razi Shahab, Center of Indian Languages, Jawaharlal Nehru University, New Delhi 67

اسرارِ کائنات

محمد حازم کمال

بطلیموس (Claudiue Ptolemy) نزولِ قرآن کے وقت کے ایک مشہور یونانی ہیئت داں گزرے ہیں۔ انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین کائنات کا مرکز ہے۔ سورج اور دیگر تمام سیارے اس کے مدار میں گردش کرتے ہیں کوپرنکس (Copernicus) پولینڈ کے ایک مشہور ہیئت داں تھے۔ انھوں نے بطلیموس کے نظریے کو ایک نئی شکل دی اور واضح کیا کہ کائنات کا مرکز سورج ہے نہ کہ زمین۔ انھوں نے کائنات کے مرکز کو بدل دیا لیکن اس کی حد اور وسعت کو نہ بدل سکے۔ کوپرنکس کا کائنات سے متعلق اصول اب بھی مساواتِ نظامِ شمسی کی شکل میں موجود ہے۔ 1925 میں امریکی ہیئت داں ایڈون پی ہبل Eduin P Hubble نے فلکیات کی دنیا میں ایک نیا انکشاف کیا کہ کائنات میں دودھیاراہ Milky way کی مانند بہت سی کہکشائیں موجود ہیں۔ 1929 میں انھوں نے یہ ثابت کردیا کہ تمام کہکشائیں ایک دوسرے سے پرے ہٹتے ہوئے پرواز کررہی ہیں اور رفتار کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی درمیانی مسافت بڑھ رہی ہے۔ ان کا یہ نظریہ علم فلکیات کی دنیا میں میل کے پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ کائنات سے متعلق دورِ حاضر کے نظریات کہکشاؤں کی اسی پرواز پر منحصر ہیں۔ یعنی مادہ تیزی کے ساتھ پھیلنے کی حالت میں ہے۔

کائنات کی تخلیق سے متعلق سب سے اعلیٰ نظریہ بیلجیم کے مشہور ہیئت داں ایب جارج لیمیٹر Abb Georges Lemaitre نے 1927 میں دیا تھا جب کہ جارج گیمو George Gamow نے 1848 سے ترقی یافتہ شکل دی اور برٹش ہیئت داں فریڈ ہائل نے اس کو Big bang Theory کا نام دیا۔

اس نظریے کے مطابق کاسمک Cosmic مادہ یعنی پوری کائنات آج سے پندرہ ارب سال قبل مٹر کے ایک کثیف دانے کے روپ میں سمٹی ہوئی تھی۔ کسی وجہ سے وہ دانہ پھٹا اور الیکٹرانوں electrons اور اٹامک نیوکلیائی atomic nuclei کا گرم سوپ soup ہر چہار سو پھیل گیا۔ یہ ذرات لگاتار فوٹون photon سے ٹکراتے رہے۔ اس وقت ان کا درجۂ حرارت 3000°c تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اربوں سال بعد یہ سوپ اتنے ٹھنڈے ہوگئے کہ الیکٹران نیوکلس (nucleus) کے محور میں گردش کرنے لگے۔ اس طرح سالمہ کی تخلیق ہوئی چونکہ سالمہ برقی حس کے معاملے میں غیر جانب دار ہوتا ہے، اس لیے ان کے ساتھ فوٹانوں کا تصادم ہوگیا۔ ان سالموں سے متفرق مادے بنے اور انھیں مادوں سے سیارے، نجوم اور کہکشاں جیسے اجرام فلکی کا وجود عمل میں آیا۔ اس طرح کائنات کی تعمیر ہوئی۔

Big bang کے اس نظریے کے ثبوت میں مستحکم دلائل معدوم تھے البتہ ہیئت دانوں کا یہ خیال تھا کہ Big bang حادثہ کے رونما ہونے کے وقت پیدا ہونے والے ریڈی ایشن Radiation کو کائنات میں موجود ہونا چاہیے۔

Big bang کی شہادت کے لیے امریکہ نے نومبر 1989 میں ایک مصنوعی سیارہ Cosmic background exploren (COBE) کو خلا میں پرواز کرایا جس کا مقصد کائنات میں موجود ریڈی ایشن Radiation کو دریافت کرنا تھا۔ یہ 360 دائرے میں کائنات کی تصویر لے رہا ہے، اس سے منسلک DMR (Differential Microwave Radiometer) اتنا حساس ہے کہ مائیکرو ویو Microwave کے درجہ حرارت میں I°c کے لاکھوں حصے کا فرق ہونے پر بھی وہ اجرام فلکی کی تصویر لے سکتا ہے۔ COBE نے آج سے تقریباً 13 ارب سال پہلے موجود ابتدائی کائنات کی تصویر لی۔ اس وقت کہکشائیں بے حد گرم تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ سرد ہوتی

گئیں اس طرح ہماری موجودہ کائنات وجود میں آئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری کائنات کی فطرت کیسی ہے؟ اس سلسلے میں ماہرین نے تین نظریات پیش کیے ہیں۔

(1) کائنات کی غیرمتبدل فطرت (Steady state nature): اس ماڈل کے مطابق کائنات میں جو بھی وسعت اور تبدیلی ہونی تھی۔ وہ سب ہو چکی اور اب وہ غیرمتبدل صورت میں موجود ہے۔

(2) کائنات کے پھیلنے اور سکڑنے کی فطرت (Oscillating nature of universe): کائنات کے اندر غبارے کی مانند پھیلنے اور سمٹنے کی صلاحیت ہے۔ اس بنا پر کہکشائیں متصادم ہوکر درہم برہم ہو جائیں گی اور پوری کائنات کالعدم ہوجائے گی۔ اس کے بعد اگر کائنات کی دوبارہ تخلیق ہوئی تو اس کی فطرت آج سے بالکل مختلف ہوگی اور ہماری زمین جیسی دوسری زمین کا وجود عمل میں نہیں آپائے گا۔

(3) کائنات کی توسیعی فطرت (Expanding nature of universe): کائنات میں موجود تمام اجرام فلکی ہم سے دور بھاگ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات لگاتار پھیل رہی ہے اس توسیعی عمل کی وجہ سے Radiation ٹھنڈا ہوتا چلا جارہا ہے۔ درجۂ حرارت Temperature absolute تک پہنچ جانے پر کائنات برف بن جائے گی کیونکہ اس درجۂ حرارت پر گیسوں کی جوہری حرکت بند ہوجاتی ہے۔ کائنات کے برف ہونے سے مراد کائنات کا ختم ہوجانا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کائنات کے پھیلنے کی کوئی انتہا بھی ہے یا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا؟ ابھی تک سائنسدانوں کو اس کی توسیعی حدود کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔

ان تینوں ماڈلوں میں کائنات کا توسیعی ماڈل سب سے زیادہ قابل قبول ہے۔ اسے ثابت کرنے کے لیے تین سائنسدانوں، امریکہ کے سال پرلمٹر Saul Perlmutter امریکی آسٹریلیائی سائنس داں براین ایشمٹ (Brian Achmidt) اور امریکی سائنس داں ایڈم ریس (Adam Riess) کو 1911 میں علم طبیعیات کے نوبل انعام سے نوازا گیا اور انھیں پندرہ لاکھ امریکی ڈالر عطا کیے گئے۔ ان تینوں سائنسدانوں نے مستعر اعظم (Super Nova) تاروں کے انشقاق پر تجربات کیے اور کائنات کے توسیعی عمل کو ثابت کیا۔

سال پرل مٹر کے تجربات: جب کوئی white dwarfstar اپنے پڑوسی تارے سے اتنا mass حاصل کرلیتا ہے کہ وہ چندر شیکھر حد کو عبور کر جائے تب مستعر اعظم کا وجود عمل میں آتا ہے۔ سبھی قسم کے مستعر اعظم (la super nova) کی اصلی چمک (instrinsic luminosity) تقریباً ایک جیسی ہوتی ہے۔ زمین سے دھماکے کی ظاہری چمک (apparent luminosity) تقریباً ایک جیسی ہوتی ہے۔ زمین سے دھماکے کی ظاہری چمک (apparent luminosity) کو ناپ کر تجربہ کاروں نے مستعر اعظم کی دوری نکالی۔ سال پرل مٹر اور دوسرے تجربہ کاروں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مستعر اعظم کے وجود میں آنے سے تقریباً دس کھرب سال قبل کائنات میں توسیعی عمل کا آغاز ہو چکا تھا۔

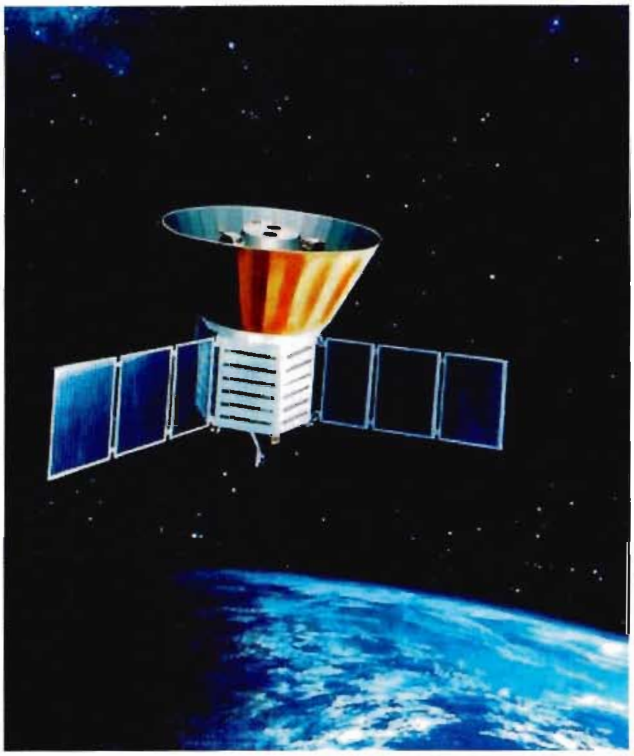

Cosmic background exploren (COBE) ایک مصنوعی سیارہ

ایشمٹ کے تجربات: علم طبیعات کے اصول کے مطابق ستارے جو سرخی مائل ہیں نہایت تیزی کے ساتھ ہم سے دوری اختیار کرتے جارہے ہیں اور redshift کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ دور واقع اشیا (distant object) کی مسافت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسی قاعدہ کلیہ کے تحت سمٹ (Schmidt) نے مستعر اعظم (super nova) کے ریڈشفٹ کو ناپ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دس کھرب سال پہلے دھماکے سے بنے ستارے اور کہکشائیں کافی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے پرے ہٹتے جارہے ہیں۔ یہ نتیجہ بھی سال پرلمٹر (Saul perlmutter) کے اس نظریے کی تائید کرتا ہے جس کو انھوں نے super nova cosmology project سے حاصل کیا ہے۔

ایڈم ریس کے تجربات: ایڈم ریس (Adam Riess) نے High-z Supernova Search Team کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنا نظریہ پیش کیا کہ کائنات تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے، اور پھیلنے کا یہ عمل ڈارک توانائی (dark energy) جس سے کائنات پُر ہے، کے ذریعے انجام پذیر ہورہا ہے۔ لیکن ڈارک توانائی سے متعلق بہت سے پیچیدہ مسائل اب بھی باقی ہیں جنھیں ایڈم ریس کی جماعت حل کرنے میں کوشاں ہے۔ اس طرح سائنس دانوں نے مستعر اعظم (super nova) تاروں کے انشقاق (Fission) پر تجربات کرنے کے بعد کائنات کے توسیعی عمل والے نظریے پر اتفاق رائے کردیا۔ رائل سویڈش اکادمی آف سائنسز نے ان تینوں سائنسدانوں کی تعریف کرتے ہوئے ان کے نظریات کو یوں پیش کیا ہے۔ پچاس سے زائد مخصوص مستعر اعظم (super nova) سے نکل رہا ریڈی ایشن ضرورت سے کم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات تیزی سے پھیل رہی ہے۔ ایک مستعر اعظم (super nova) سے خارج ہونے والی ریڈی ایشن کی مقدار ایک کہکشاں کے اخراجی ریڈی ایشن کے مساوی ہوتی ہے۔ مستعر اعظم (super nova) کے ریڈی ایشن میں لگاتار ہورہی کمی اس بات کا ثبوت ہے کہ کائنات کی وسعت میں روزافزوں ترقی ہورہی ہے اور یہی ترقی ایک دن کائنات کے خاتمے کا سبب بنے گی۔

◘

Mohammad Hazim Kamal, Qasimpura, Chauphal, Maunath Bhanjan, Distt. Mau - 275101 (UP)

تبصرہ و تعارف

ڈیوڈ کاپر فیلڈ (جلد دوم)

مصنف: چارلس ڈکنس، مترجم: فضلِ حسنین
صفحات: 618، قیمت: 170 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر محمد شفقت کمال، شعبۂ اردو، ٹی ڈی بی کالج
رانی گنج، بردوان، ویسٹ بنگال

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے گزشتہ کئی برس سے اردو میں تراجم کے ذخیرے کو مزید وسیع کیا ہے اور قارئین کو مختلف زبانوں کے نایاب فن پارے سے روشناس کرایا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب 'ڈیوڈ کاپر فیلڈ' اس ذخیرے میں مزید اضافہ کرتی ہے جس کے مصنف جناب چارلس ڈکنس ہیں۔ اس ناول کو فضلِ حسنین نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے، مذکورہ ناول دو جلدوں میں منقسم ہے۔ اس کی پہلی جلد اردو میں 2005 میں منظرِ عام پر آچکی ہے اور اب اس کی دوسری جلد عرضِ مترجم کے ساتھ قارئین کے پیشِ نظر ہے۔

'ڈیوڈ کاپر فیلڈ' چارلس ڈکنس کا آٹھواں شاہکار ناول ہے۔ اس ناول کے واقعات کا تعلق ان کی ذاتی زندگی سے ہے اس لیے بعض ناقدین اسے چارلس ڈکنس کی خودنوشت تصور کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں جان فاسٹر جو ڈکنس کے قریبی دوستوں میں سے تھے، جنھوں نے ان کی سوانح بھی لکھی ہے کا کہنا ہے کہ ہیرو کے ساتھ ڈکنس کی مکمل مشابہت ہے اور ان کی ذاتی زندگی کے واقعات و تجربات کی بھی بہترین عکاسی اس ناول میں موجود ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈیوڈ کاپر فیلڈ چارلس ڈکنس کا ایک سوانحی ناول ہے۔ ڈکنس کے دوسرے ناولوں کی طرح یہ ناول بھی پہلی بار 1848 اور 1850 کے درمیان اخبار میں قسط وار شائع ہوا۔ اس کے بعد نومبر 1850 میں Brand Burney اور Evans نے اسے مکمل طور پر شائع کیا۔ یہ ایک ضخیم ناول ہے جسے ڈکنس نے دو جلدوں میں منقسم کیا ہے۔ جلد دوم 618 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں کل 36 ابواب ہیں اور ہر باب کا عنوان الگ الگ قائم کیا گیا ہے۔

ڈیوڈ کاپر فیلڈ کی اس جلد میں اس کے ایامِ طالب علمی کے بعد کے واقعات قلم بند ہیں۔ کہانی کی شروعات ڈیوڈ کاپر فیلڈ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لندن آنے سے ہوتی ہے۔ یہاں وہ ایک نامور سرکاری وکیل کے دفتر میں ایک کلرک کی حیثیت سے کام کرتا ہے اور دریں اثنا اس کی بیٹی ڈورا کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہ خبر ڈورا کے والد کو ناگوار گزرتی ہے لیکن اس کی موت کے بعد ڈیوڈ اس سے شادی کر لیتا ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد ان دونوں کی ازدواجی زندگی ناخوشگوار ہو جاتی ہے لیکن ڈیوڈ کی سوجھ بوجھ سے یہ رشتہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ وہ اپنی گھریلو زندگی کو بہتر بنانے کی غرض سے کافی محنت و مشقت کرتا ہے یہاں تک کہ کہانیاں بھی لکھتا ہے اور بہت جلد ایک نامور ادیب بن کر ابھرتا ہے۔ اس طرح اس کا پہلا ناول منظرِ عام پر آتا ہے جسے کافی شہرت ملتی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب چارلس ڈکنس کے لڑکپن، جوانی اور ادھیڑ عمر کی زندگی کی دھوپ چھاؤں کی مکمل داستان ہے۔ اس میں ان کے خاندانی حالات کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے سیدھے سادے معاملات اور روزمرّہ کے واقعات کو ایک نئے آب و تاب اور ایک نئی معنویت کے ساتھ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نشاط و مسرت کے حسین لمحوں کے ساتھ ساتھ کرب کی عظیم داستانوں کا بھی ذکر بڑی بے باکی اور حق گوئی سے کیا ہے۔ گویا کہ انھوں نے اپنی روح کی صداقت کو بڑے پرخلوص انداز میں بیان کر دیا ہے اس لیے اس میں ان کے خارجی وجود کے ساتھ ساتھ ان کے باطنی وجود کا بھی پورا حساب کتاب ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے عہد وکٹوریہ کے حالات، واقعات، رہن سہن، تہذیب و تمدن اور کلچر و ثقافت کو بہت خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ ان کے کردار اکثر آلام و مصائب میں گھرے رہتے ہیں اور مسلسل جد و جہد کرتے رہتے ہیں لیکن ان کا کوئی بھی کردار اس طبقاتی بیداری اور سماجی ناانصافی کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔

اس کتاب کے مترجم جناب فضلِ حسنین نے اس خودنوشت کو اردو کا جامہ عطا کرنے میں جس نفاست و فنکاری سے کام لیا وہ قابلِ تعریف ہے۔ ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ ان کا یہ ترجمہ اردو نثر کے مزاج و اسلوب کے موافق ہو۔ انھوں نے کرداروں اور مقامات وغیرہ کے نام انگریزی میں بھی درج کر دیے ہیں اور کہیں کہیں اس کی وضاحت بھی کر دی ہے تاکہ قارئین کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ ان کی زبان نہایت ہی سلیس اور سادہ ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب فضلِ حسنین کی نثری پختگی کی عمدہ مثال ہے۔

یہ کتاب معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری و صوری خصوصیات کی بھی حامل ہے۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے، کاغذ معیاری ہے اور جلد خوبصورت ہے۔ اس لحاظ سے اس کی قیمت 170 روپے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اس کتاب میں چند پروف کی غلطیاں بھی نظر آجاتی ہیں مثلاً گہرائیوں (گہرائیں داں) ص 660، بیوقوف (بوقوف) ص 666، رہوں گا (رہوگا) ص 903، ڈاک (ڈک) ص 1041۔ اس کے باوجود مجموعی طور پر یہ ترجمہ قابلِ ستائش ہے۔

منتخب التواریخ (اوّل، دوم، سوم)

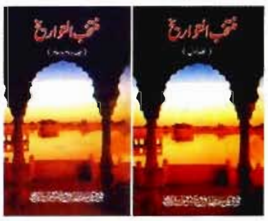

مصنف: ملا عبدالقادر بدایونی، مترجم: علیم اشرف خان
صفحات: جلد اوّل: 409، جلد دوم سوم: 620،
قیمت: جلد اوّل: 110، جلد دوم سوم: 155 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: مغیث احمد علیگ، معرفت ڈاکٹر عبدالحلیم B-58، مجیب باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

ترجمہ نگاری کے ذریعے ہم کسی بھی شاہکار کی اچھی طرح ترجمانی کر سکتے ہیں۔ یہ وہ نسخہ کیمیا ہے جس کے ذریعے ہم مدفون علوم و فنون میں نئی روح پھونک کر مختلف اقوام و ملل کے افکار و خیالات اور رجحانات سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ عرب مترجمین نے ترجمے کے ذریعے ہی ہمیں یونانی مفکرین، فلسفیوں اور حکما کے افکار و خیالات سے متعارف کرایا۔

پیشِ نظر کتاب 'منتخب التواریخ' کا ترجمہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ 'منتخب التواریخ' دراصل عہدِ اکبری کے ایک بے باک قلمکار، دینی حمیت سے سرشار ملا عبدالقادر بدایونی کی

تالیف ہے۔ فارسی ادب اور تاریخ سے تعلق رکھنے والوں کے لیے 'منتخب التواریخ' نہ تو کوئی نئی کتاب ہے اور نہ ہی ملا عبدالقادر کی شخصیت ہی غیر معروف ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی کی شخصیت اور علمی لیاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ دربار اکبری جہاں 'سواطع الالہام' کے نام سے تفسیر بے نقط لکھنے والے ملک الشعرا فیضی، 'توزک بابری' کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کرنے والے شیخ زین العابدین وفائی خوافی اور عبدالرحیم خانخانان اور 'اکبرنامہ و آئین اکبری' کے مصنف ابوالفضل جیسے مشاہیر موجود ہوں، اس دربار میں ملا جی کو 'امام اکبرشاہ' کا خطاب دیا جائے یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ ملا جی کا پورا نام عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی اور تخلص قادری ہے۔ ملا جی کو عقلی و نقلی دونوں علوم پر عبور تھا، عربی و فارسی میں مہارت کے ساتھ سنسکرت سے بھی بخوبی واقفیت تھی، ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ صاحب طرز ادیب اور نثار بھی تھے۔ شہنشاہ اکبر کے دربار میں ترجمہ، تالیف اور تصنیف کے کام پر مامور تھے۔ انھوں نے 'مہابھارت' اور 'رامائن' کا ترجمہ کیا۔ 'نجات الرشید' اور 'انتخاب تاریخ کشمیر' لکھا اور 'کتاب الاحادیث' کو ترتیب دیا۔ 'تاریخ الفی' کی جمع و تدوین اور 'معجم البلدان' کی ترجمہ نگاری میں بھی آپ کا اہم رول رہا ہے۔

'منتخب التواریخ' ملا موصوف کا عظیم شاہکار ہے، جس میں انھوں نے عہد اکبری کا بیش بہا خزانہ یکجا کردیا ہے۔ یہ شہنشاہ اکبر کے عہد کی اہم ترین تاریخی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اسے 'تاریخ بدایونی' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے اندر مصنف نے سلطان محمود کے والد سبکتگین کے عہد حکومت یعنی 998 عیسوی سے لے کر اکبر کے عہد حکومت کے 40 ویں جلوس یعنی تقریباً 60 برسوں کی تاریخ کا تجزیاتی اور ناقدانہ طور پر احاطہ کیا ہے۔ ملا صاحب کے مطابق انھوں نے اس کتاب میں اکبر کے 38 سالہ احوال اور مہمات بادشاہی کو حضرت خواجہ نظام الدین کی تصنیف سے اخذ کیا ہے۔ جب کہ باقی دو برس کا حال انھوں نے خود سے ہی جمع کیا ہے۔

'منتخب التواریخ' تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ 430 صفحات پر مشتمل پہلی جلد عہد غزنوی سے شروع ہوکر عہد ہمایوں پر ختم ہوتی ہے۔ جس میں عہد ہمایوں کے شعرا جنوبی بدخشی، وفائی، نادری، فارغی، جاہی، حیدر تونی، طاہر دکنی، خواجہ ایوب کا خاطر خواہ ذکر ہے۔ دوسری جلد شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی تخت نشینی سے شروع ہوتی ہے اور ملک الشعرا فیضی کے انتقال پر ختم ہوتی ہے۔ موصوف نے اس کے اندر دلچسپ واقعات و لطائف، مختلف فتوحات اور متعدد معاصرین جیسے شیخ سلیم الدین چشتی، شیخ داؤد علی جہنی، حکیم ابوالفتح گیلانی، ابوالفضل، شیخ مبارک اور ملک الشعرا فیضی وغیرہ کا ذکر کیا ہے، جب کہ تیسری جلد میں اس 60 سالہ عہد کے ادبا، شعرا، علما، حکما اور مشائخ کے احوال کا تذکرہ ہے۔ گویا یہ کتاب اس عہد کی بہترین عکاس ہے۔ اس میں اگرچہ تاریخ کے ہر پہلو کو نہ سمیٹا گیا ہو لیکن اس کے طرز تحریر سے اتنی بات ضرور ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد دربار اکبری اور عہد اکبری کا نقشہ ضرور ہمارے ذہنوں میں متصور ہوجائے گا۔ انھوں نے اپنے عہد کے ہر ماجرے اور معاملے کو اسی ناز و انداز سے بیان کیا ہے۔ انداز بیان کچھ اس قدر دلچسپ اور شوخ ہے کہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے کبھی سوئی چبھوتے ہیں تو کبھی نرم سنگ گاہٹ کا احساس دلاتے ہیں اور کبھی خنجر سے بھی وار کردیتے ہیں اور وہ بھی اس خوبصورتی سے کہ شکار زخموں کی ٹیس لیے بھی لوٹ پوٹ ہوجاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ملا موصوف نے اپنی اس تالیف کو تاحیات صیغۂ راز میں رکھا کہ کہیں حق گوئی کے باعث عتاب کا شکار نہ ہوجائیں۔ لیکن ان کی کتاب کے جملہ مواد میں جو چیز قدرے مشترک ہے وہ مصنف کی حق گوئی، حق بینی، عادلانہ مزاج اور شرافت۔ وہ اپنی کسی بھی تحریر میں ان چیزوں کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کے تیر و نشتر کا شکار اگر ان کا رقیب ہوتا ہے تو رفیق بھی محفوظ نہیں رہتا، اسی طرح ان کی مدحت سرائی کا شرف اگر ان کے اعزا واقربا کو ہوتا ہے تو اغیار بھی محروم نہیں رہتے۔

فارسی کے اس عظیم شاہکار کو علیم اشرف خاں نے اردو کا دلکش لباس پہنایا ہے جو بلاشبہ لائق تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مترجم موصوف نے واقعتاً عرق ریزی اور خلوص سے کام کیا ہے، ہاں ایک بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ اگر مترجم موصوف کتاب میں مذکور فارسی و عربی اشعار کا بھی اردو میں ترجمہ کردیتے تو یہ کتاب مزید مفید ہوسکتی تھی۔ بہرحال ان کی یہ کتاب بلاشبہ آپ کے گھر کی زینت بننے کے لائق ہے اور ان کی یہ کاوش اردو، فارسی، علوم اسلامی اور تاریخ کے طلبا کے لیے یقیناً ایک تحفہ ہے۔

تین جلدوں پر محیط اس ہزار صفحاتی کتاب کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے تخیلاتی عکس کا استعمال کرکے خوبصورت سرورق کے ساتھ شائع کیا ہے، جس کے مکمل سیٹ کی قیمت محض -/265 روپے ہیں، جو بلاشبہ مناسب ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے تبصرے

مصنف: ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، ترتیب وادارات: محمد عارف اقبال
صفحات: 264، قیمت: 220 روپے
ناشر: ایپلائڈ بکس نیو کوہ نور ہوٹل، پٹوڈی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی 2
مبصر: عابد انور، D-64، فلیٹ نمبر 10، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی (پیدائش 31 مارچ 1921) کا شمار قابل قدر استاذ اور سیاسی مدبر کے طور پر ہوتا ہے۔ وہ قدوائی گھرانے کے چشم و چراغ اور مشہور ادیب، صاحب طرز انشا پرداز اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی کے بھتیجے اور داماد ہیں۔ وہ 1948 سے 1982 تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاذ رہے اور 1984 سے 1990 تک راجیہ سبھا کے رکن رہے۔ اس وقت 92 برس کی عمر میں بھی لکھنے پڑھنے کا سفر جاری ہے۔ ان کا خاص میدان علم سیاست ہے اور علی گڑھ میں سیاسیات ہی پڑھاتے تھے۔ اس موضوع پر موصوف کی متعدد کتابیں جمہوریہ ہند کا دستور اساسی، اصول سیاسیات، یوروپ کے عظیم سیاسی مفکر، دنیا کی حکومتیں اور 'ہند جدید کے سیاسی اور سماجی افکار' شائع ہوچکی ہیں۔ موصوف کا شمار بہترین تبصرہ نگاروں میں بھی ہوتا ہے۔ تبصرہ کرتے وقت موصوف خوبی اور خامیوں پر گہری نظر ڈالتے ہیں۔ وہ صرف غلطی کی طرف نشاندہی نہیں کرتے ہیں بلکہ اصلاح کرتے ہوئے حقائق بھی پیش کرتے ہیں۔ کتاب کے پیش لفظ میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''ایم اے میں سیاسی فلسفہ (Political Thought) ہندوستانی سیاست اور دستور پڑھایا اس کے ساتھ مسلم سیاسیات اور ہندوستانی سیاسیات پر کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان کتابوں کے مطالعے سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ بیشتر مصنفین واقعات سے لاعلم ہیں خاص طور پر مسلمانوں سے متعلق۔ نیز مسلمانوں سے متعلق ان کتابوں میں تعصب اور تنگ نظری سے لکھا گیا ہے۔ ان میں سے اکثر کتابوں پر راقم الحروف کے مفصل تبصرے روزناموں اور جرائد میں شائع ہوئے۔ سب سے معرکۃ الآرا ریویو بین الاقوامی شہرت کے مالک صحافی درگا داس کی تالیف سردار پٹیل کی خط و کتابت پر شائع ہوا جو دس جلدوں پر مشتمل تھی۔ کتاب کے مولف ہندوستان ٹائمز کے برسوں مدیر رہے۔ اس کتاب میں سنگین واقعاتی غلطیاں تھیں''۔

زیر تبصرہ کتاب میں اپنے پہلے تبصرے میں اسی طرح موصوف نے 'علیم صاحب' غلطی کی اصلاح کرتے ہوئے اپنے تبصرے میں لکھا ہے کہ '' صفحہ 310 پر یہ بیان کہ نواب علی یاور جنگ کے زمانے میں میڈیکل کالج میں داخلوں کی وجہ سے اپریل

1965 کا واقعہ پیش آیا، بالکل غلط ہے۔ داخلوں میں اندرونی طلبا کا تناسب 75 فیصدی سے گھٹا کر 50 فیصدی کر دیا گیا تھا اس پر ایجی ٹیشن شروع ہوئی جس نے 25 اپریل 1965 کے افسوسناک ہنگامے کی صورت اختیار کی۔ اسی طرح اس صفحے پر بیان بھی بالکل خلاف واقعہ ہے کہ علیم صاحب نے یونیورسٹی کیمپس سے پولیس ہٹوائی۔ پولیس نواب علی یاور جنگ ہی کے زمانے میں ہٹا دی گئی تھی''۔ ہاشم قدوائی نے جس طرح اپنے تبصرے میں اس غلطی کی گرفت کی ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ کے علم میں یہ واقعہ ہو یا اس طرح کے حالات پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ ہاشم صاحب کے تبصرے میں یہ باتیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر ہاشم قدوائی نے 'مختار احمد انصاری' کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ الہ آباد کے جس کالج میں ڈاکٹر انصاری نے تعلیم حاصل کی تھی، اس کا نام میور سنٹرل کالج تھا نہ کہ میسر کالج جیسا کہ صفحہ 12 پر درج ہے۔ اغلاط کی نشاندہی ہی نہیں بلکہ ہر جگہ اس کی تصحیح بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی باب میں تیسری کتاب 'سیرت بانی دارالعلوم' پر تبصرہ ہے جس پر موصوف نے بہت ہی خوبصورت انداز میں کتاب کا تعارف کرایا ہے۔ ان کا تبصرہ کرنے کا انداز دوسرے تبصرہ نگاروں سے جداگانہ ہے۔

جیسا کہ کتاب کے مرتب عارف اقبال نے ڈاکٹر ہاشم قدوائی کے تعلق سے لکھا ہے کہ ''ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے تبصروں میں چند باتیں خصوصیت کے ساتھ ہماری توجہ مرکوز کراتی ہیں۔ اول یہ کہ وہ کسی بھی کتاب کے تاریخ علمی تسامح سے صرف نظر نہیں کرتے اور دیانت داری کے ساتھ اس کی نشاندہی کرنا اپنا علمی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں بڑی سے بڑی علمی وادبی شخصیت بھی ڈاکٹر قدوائی کو متاثر نہیں کرتی۔'' ہاشم صاحب نے جس ذمہ داری کے ساتھ کتابوں پر تبصرے کئے ہیں عام طور پر ایسا نہیں کیا جاتا۔ زیادہ تر تبصرے تعریف توصیف سے عبارت ہوتے ہیں جس میں کتاب کی کم مصنف کی زیادہ پذیرائی کی جاتی ہے لیکن ہاشم قدوائی کے تبصرے ان سب چیزوں سے مبرا نظر آتے ہیں۔ پروفیسر شیث محمد اسمٰعیل اعظمی نے ڈاکٹر ہاشمی قدوائی کے تبصرے کے مجموعے میں حرفے چند کے تحت لکھا ہے ''تبصرے جن کا لکھنا بہت آسان اور بہت عام ہے لیکن اس کی دیانت دارانہ ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ آج کسی کے مندرجات کو بالاستیعاب پڑھنا اور اس پر بے کم کاست عالمانہ رائے کا اظہار کرنا بڑی آزمائش کا کام ہے''۔ سب سے اچھی بات ان تبصروں میں یہی ہے کہ ڈاکٹر ہاشم قدوائی ان مندرجات پر کھرے اترتے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر ہاشم قدوائی نے کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد ان پر بتصرہ کیا ہے۔ وہ اپنے تبصروں میں جہاں کتاب کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر ڈالتے ہیں وہیں وہ نظریات سے بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے تمام تبصرے ذوق مطالعہ کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس کتاب میں جن کتابوں کے تبصروں کا احاطہ کیا گیا ہے وہ ان کتابوں کا مکمل تعارف ہیں اور قاری ان کتابوں کے بارے میں واقف ہو جائے گا۔

تبصروں کا مجموعہ زیر تبصرہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب شخصیات: حیات و خدمات رسوانح دوسرا باب تاریخ رتذکرہ رآپ بیتی رخاکے، تیسرا باب تحقیق وتنقید ر لسانیات رشعر ب ادب چوتھا باب سفرنامہ، پانچواں باب مکتوباتی ادب، چھٹا باب اسلامیات، ساتواں باب تعلیم رسماجیات اور آٹھواں باب رسائل ہیں۔ مجموعی طور پر 76 کتابوں پر کیے گئے تبصرے ہیں جن میں دو رسائل بھی شامل ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کی قابل ستائش کوشش ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ شعری، مضامین، مقامات اور انٹرویو کے مجموعے کی طرح تبصرے کا مجموعہ بھی منظر عام پر آنے لگا ہے۔ اس کو اردو بک ریویو کے ایڈیٹر عارف اقبال نے ترتیب دیا ہے۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب ہے۔ قیمت کچھ زیادہ ہے۔

کمان: شعری کلیات (جلد اوّل)

شاعر: مظفر حنفی، ترتیب وتدوین: فیروز مظفر
صفحات: 496، قیمت: 226 روپے
ناشر: مصنف، زیر اہتمام: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: ممتاز الحق، E-227، ابوالفضل انکلیو II، نئی دہلی 25

پروفیسر مظفر حنفی کا شمار ہمارے عہد کے معتبر ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے وہ پچھلے ساٹھ برس سے بے تکان لکھ رہے ہیں ان کی تصنیفات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سنہ 1970 کے آس پاس شمس الرحمان فاروقی نے لکھا تھا کہ ''مظفر حنفی اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ شائع ہونے والے شاعر ہیں۔ مشاعرہ باز شاعروں کے مقابلے میں مظفر حنفی کی شرکت مشاعروں میں کم رہی ہے مگر ان کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جو مشاعرے کے سنجیدہ سامعین میں بے حد پسند کیے جاتے ہیں۔ مظفر حنفی کے اب تک تیرہ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں پہلا مجموعہ 'پانی کی زبان' ہے جو 1967 میں شائع ہوا۔ حالانکہ اس سے پہلے تین مجموعے ترتیب پا چکے تھے، تیکھی غزلیں، عکس ریز اور صریر خامہ، جو بوجوہ بعد میں منصۂ شہود پر آئے۔ کلیات کے سلسلے میں اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے مظفر حنفی نے لکھا ہے:

''جی چاہتا تھا تمام شعری سرمایہ یکمشت کلیات کی شکل میں چھپ کر منظر عام پر آجائے تاکہ نئی نسل کو بھی میری تخلیقی تگاپو کا اندازہ ہو سکے۔''

کلیات جلد اوّل کی اشاعت اسی خواہش کی عملی شکل ہے جسے موصوف کے لائق فرزند فیروز مظفر نے مرتب کیا ہے اس جلد میں ابتدائی پانچ مجموعہ کلام جن میں ابتدا سے 1971 تک کی تخلیقات اور ادب اطفال سے متعلق نگارشات شامل ہیں۔ ساتھ ہی غیر مطبوعہ تخلیقات جو کسی مجموعے میں شامل نہیں تھیں انھیں رسائل اور بیاضوں سے تلاش کر کے کلیات کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کلیات (جلد اوّل) کی ضخامت 496 صفحات ہوگئی ہے۔ اس جلد میں جن مجموعہ ہائے کلام کی تخلیقات شامل کی گئی ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

تیکھی غزلیں: 181 غزلیں، عکس ریز: آٹھ مصرعوں پر مشتمل 124 کیرکٹرز کا طنزیہ خاکہ، صریر خامہ: 150 غزلیں، پانی کی زبان: 71 غزلیں، 72 نظمیں، کھیل کھیل میں: 87 نظمیں (بچوں کے لیے)، طلسم حرف: 198 غزلیں، 35 نظمیں 33 رباعیات، متفرقات غیر مطبوعہ: 60 نظمیں، 15 دوہے۔

1971 کے بعد مرتب شعری مجموعے دیپک راگ، یم بہ یم، کھل سا سم سم، پردہ سخن کا، یا اخی، ہاتھ اوپر کیے اور آگ مصروف ہے کو شعری کلیات (جلد دوم) میں شامل کیا جائے گا۔ اس جلد کی ضخامت بھی تقریباً 500 صفحات ہوگی۔

کلیات کی اس جلد کا دیباچہ محترم شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے انھوں نے اردو غزل کے کلاسیکی سرمایے کے پس منظر میں مظفر حنفی کی غزل کا جائزہ لیا ہے۔

ان کا خیال ہے کہ مظفر حنفی سوچ سوچ کر اور عقل کا استعمال کر کے شعر کہتے ہیں۔ وہ طنز کہیں یا نہ کہیں لیکن وہ خیال اور عقل کے شاعر پہلے ہیں، باقی سب بعد میں ہیں۔ خیال بندی کی خصوصیت کی بنا پر فاروقی صاحب مظفر حنفی کو ناسخ اور آتش کا معنوی شاگرد قرار دیتے ہیں، مضمون کی تلاش اور نادر بات کہنے کا ذوق، ظرافت تجسس اور تفکر وغیرہ خیال بندی کے اہم عنصر ہیں ان میں سے اکثر خصوصیات مظفر حنفی کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

فاروقی صاحب شاکی ہیں کہ مظفر حنفی کے یہاں عشقیہ اشعار کی کمی ہے اس سلسلے میں موصوف نے ان کا ایک شعر پیش کیا ہے:

سچ مچ وہ تغافل سے کنارہ ہی نہ کر لے
میں سوچنے بیٹھا تو پسینہ نکل آیا

اس شعر کا غالب کے شعر سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا کہ غالب کا شعر خیال بندی میں عشقیہ شاعری کی اچھی مثال ہے۔ لیکن مظفر حنفی نے ایک بالکل نئی بات نکالی ہے اس میں پورا وقوعہ نظم ہوگیا ہے۔ معشوق کی طرف سے کبھی کبھی اشارہ ملتا تھا کہ میرا تغافل دراصل ایک ادائے ناز ہے۔ اب کسی باعث وہ اشارے نہیں مل رہے ہیں یا ہوسکتا ہے متکلم نے کبھی جھلا کر معشوق سے کہہ دیا ہو کہ جان کر کیجیے تغافل، لیکن اس کا اثر شاید کچھ الٹا پڑا ہے اور اب آثار ہیں کہ وہ تغافل بھی ترک کردے گا اب تب یہ امکان متکلم پر روشن ہوا تو اس کا تاثر انتہائی غیر معمولی ہے اسے پسینہ آجاتا ہے ... شعر کی برجستگی اور اپنی حماقت پر متکلم کی تشویش قابل داد ہے۔

آگے اسی غزل کے ایک اور شعر کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس کی وضاحت ایسے خوبصورت پیرایے میں کی گئی ہے جس سے مظفر حنفی کا شعری امتیاز نکھر کر سامنے آتا ہے:

پھر کوہکنی ڈھال رہی ہے نئے تیشے　　　پھر فخر سے چٹان کا سینہ نکل آیا

''یہ مضمون مجھے تو کہیں نہیں ملا، نہ فارسی میں نہ اردو میں اور اس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ فنکار کا وسیلہ فن (موقلم، کاغذ، رنگ، قلم، روشنائی، چھینی، کنی، بربط، ستار وغیرہ) فنکار پر ناز کرے، یہ بات تو پھر بھی سمجھ میں آتی ہے لیکن یہاں تو چٹان جسے تراش کر دودھ کی نہر نکالی جائے گی، یا کوئی شبیہ بنائی جائے گی، وہ ناز کررہی ہے کہ اب میرے امکانات ظاہر ہونے والے ہیں اور اس احساس کو ظاہر کرنے کے لیے شاعر نے چٹان کے سینے کو فخر سے ابھرتا ہوا بتایا ہے'' اس کے بعد غالب کے دو فارسی اشعار سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''مظفر حنفی کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں دونوں اشعار کی جھلک ہے لیکن ان کا مضمون بالکل ان کا اپنا ہے اس پر مستزاد مصرع ثانی کا پیکر ہے، تمام تصویروں اور تمام تقریروں سے بڑھ کر، کہ مصرع پڑھ کر جھرجھری آجاتی ہے۔''

اور آخر میں موصوف نے مظفر حنفی کے ایک شعر کے حوالے سے فراخدلی سے اعتراف کیا ہے کہ وہ عہد حاضر کے قادر الکلام شاعر بھی ہیں اور ان کے اشعار کی قدردانی بھی ہوئی ہے۔

کلیات کی اس جلد میں غیر مطبوعہ تخلیقات کے کچھ ایسے نمونے بھی شامل ہیں جن تک رسائی کا ہمارے پاس کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا اس تلاش و تحقیق کے لیے مرتب مبارکباد کا مستحق ہے، مثلاً شاد عارفی پر چار مرثیے، مزاحیہ قصیدہ در مدح عبداللطیف اعظمی، نذر غالب (تضمین)، سنٹرل یونیورسٹی کشمیر کے لیے لکھے گئے ترانے، جن کی تعداد نو ہے اور کلام فیض پر پیروڈی۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ باذوق قارئین اس سے استفادہ کریں گے۔

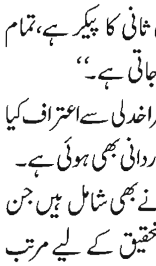

علی جواد زیدی

مصنف: وضاحت حسین رضوی

صفحات: 144 قیمت: 40 روپے

ناشر: ساہتیہ اکادمی نئی دہلی

مبصر: محمد عمران، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

علی جواد زیدی کا نام ہماری ادبی تاریخ میں کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت میں مختلف النوع صفات بیک وقت جمع ہوگئی تھی، ان میں علمی وادبی رہبری کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ انھوں نے تنقید اور تحقیق و تدوین کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ شاعری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی، لیکن ان کی انفرادی شان و شناخت تنقید و تحقیق کے میدان میں ہی نمایاں ہوئی۔

علی جواد زیدی نے بطور ناقد ترقی پسند فکر و نظر کی تشکیل و توضیح میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی تنقیدی تحریروں میں جو فکری پختگی اور نظریاتی وضاحت ملتی ہے وہ ان کے بیشتر معاصرین کے یہاں ناپید ہے۔ انھوں نے توازن کو ہمیشہ اپنا شعار بنایا، علی جواد زیدی نہ صرف نظریہ سازی اور فکری رہبری کے غازی تھے بلکہ تخلیقی میدان میں بھی بالخصوص بطور شاعر گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے شعری مجموعے رگ سنگ، (مجموعہ نظم) میری غزلیں (مجموعہ غزلیات) کے علاوہ دیگر اہم مجموعہ ہائے شعری تخلیقات ان کے تخلیقی جوہر کے عمدہ نمونے ہیں۔

ترقی پسند تحریک اور نظریے سے گہری وابستگی کے باوجود ان کی شعری تخلیقات خارجیت سے زیادہ باطنی کیفیات کی ترجمان ہیں۔ بنیادی انسانی اقدار کو وہ بے حد صداقت پسندی اور سادگی کے ساتھ اجاگر کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ علی جواد زیدی نے گرچہ اپنے عہد میں اپنی وقیع خدمات کی بدولت کافی شہرت پائی لیکن یہ بات تکلیف دہ ہے کہ بعد کی نسلوں نے ان کی تخلیقات اور علمی و ادبی کارناموں پر اتنی توجہ صرف نہیں کی جتنی توجہ کے وہ مستحق تھے۔ اپنے اسلاف کے کارناموں کی جانب سرد مہری کا رویہ اور اپنے ادبی و تہذیبی ورثے کے تعلق سے ہماری بے حسی یقیناً باعث تشویش ہے۔ اس تناظر میں وضاحت حسین رضوی صاحب کی پیش رفت بے شک لائق توجہ ہے۔ انھوں نے بطور ہندستانی ادب کے معمار علی جواد زیدی کی خدمات کے مجموعی جائزے پر مبنی ایک مبسوط مونوگراف 'علی جواد زیدی' تصنیف کیا ہے۔ اس مونوگراف کے پہلے باب میں علی جواد زیدی کی سوانحی زندگی سیاسی سماجی اور ادبی سرگرمیوں کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ان کے جملہ فنون غزل، نظم کے علاوہ مثنوی، شخصی مرثیے، سلام، رباعی قصائد، نعت قطعہ اور منقبت کے محاکمے کے ساتھ ساتھ ان کی شعری حسیت اور شعوری بالیدگی کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں بحیثیت محقق ان کی خدمات کا احاطہ مضبوطی سے کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں ان کی تنقید نگاری کا تذکرہ ان کی ہی تنقید نگاری کے کچھ اہم نمونوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان کی تنقید نگاری کے متعلق نقادوں کے کیا نظریات ہیں ان کے اقتباس بھی پیش کیے گئے ہیں۔ علی جواد زیدی کی حیثیت ایک محقق اور تدوین نگار کی بھی ہے، انہوں نے تحقیق و تدوین کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیے ہیں، چنانچہ پانچویں باب میں ان کی تحقیق و تدوین نگاری سے متعلق معلومات فراہم کی گئیں ہیں۔ مونوگراف کا آخری حصہ ان کی خاکہ نگاری اور صحافتی خدمات پر مشتمل ہے۔ متذکرہ مونوگراف کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں اس میں ان کے تمام ادبی سیاسی سماجی اور سوانحی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے وہیں ان کی مکمل تصانیف و اعزازات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ وضاحت حسین رضوی کی یہ سنجیدہ تنقیدی کاوش نہ صرف ان کی علی و ادبی Dedication اور ذوق کا مظہر ہے بلکہ اپنے اسلاف اور اپنے تہذیبی ورثے سے محبت کا ثبوت بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے علی جواد زیدی کی خدمات کے تعین قدر میں مدد ملے گی میں جناب وضاحت حسین رضوی کو اس پیش رفت کے لیے تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔

احوال صحافت

مصنف: سہیل انجم

صفحات: 256　قیمت: 200 روپے،

ناشر: سہیل انجم، A 370/6، ذاکر نگر، نئی دہلی 25

مبصر: ثاقب عمران، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو صحافت کے موجودہ منظرنامے میں سہیل انجم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں

ہے۔ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ 'میڈیا، روپ اور بہروپ' اور 'میڈیا، اردو اور جدید رجحانات'' کے علاوہ 'مغربی میڈیا اور اسلام' ان کی مشہور کتابیں ہیں جو کہ مقبول خاص و عام ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'احوال صحافت' ان کی تازہ ترین کتاب ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے پہلے باب کا عنوان 'اردو صحافت: تاریخ، تشکیل، تصویر' ہے۔ اس عنوان کے تحت چودہ مضامین شامل کیے ہیں۔ 'اردو صحافت اور اس کی مختصر تاریخ'، 'صحافت کے نقوش اولین'، اور 'صحافت اور تاریخ نویسی' جیسے موضوعات پر تو انھوں نے قلم اٹھایا ہی ہے، ساتھ ہی انھوں نے صحافت کے ایسے پہلوؤں پر بھی گفتگو کی ہے جن پر کم لکھا گیا ہے یا بالکل نہیں۔

'صحافت مشن ہے یا کچھ اور؟' اپنی نوعیت کا ایک منفرد مضمون ہے۔ اس میں سہیل انجم لکھتے ہیں کہ جہاں ایک جانب صحافت کے فروغ کے لیے لوگ کوشاں رہتے تھے وہیں صحافیوں کے لیے بھی کچھ قاعدے اور ضوابط بنائے جاتے تھے۔ لیکن وقت کی تبدیلی کے ساتھ تمام قوانین و ضوابط فرسودہ ہوتے رہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بعض صحافیوں نے ان اصول و ضوابط کو طاق پر رکھ دیا ہے۔ سہیل انجم کے مطابق جانبداری کا رویہ جو صحافت میں در آیا ہے اس کی اصل وجہ مادی ترقی ہے

زیر تبصرہ کتاب میں ایک مضمون 'صحافت اور جذباتیت کا کاروبار' ہے۔ اس میں مصنف نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ صحافت کی دنیا میں جذبات کا کوئی رول نہیں ہونا چاہیے۔ نہ ہی صحافی جذبات سے مغلوب ہوکر کوئی خبر تحریر کرے اور نہ ہی کسی خبر کو اس طرح پیش کرے جس سے قارئین کے جذبات میں اشتعال پیدا ہو۔ دراصل ادھر کچھ عرصے سے اردو اخباروں میں بھی کچھ اسی طرح کی اشتعال انگیز خبریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ کسی مسلمان کو گرفتار کیا گیا اور اسے دہشت گرد قرار دے دیا گیا (اب یہ غلط ہے یا صحیح یہاں اس سے بحث نہیں ہے) ہندوستان کے ہر اخبار میں اس کے متعلق مختلف خبریں اور بیانات شائع ہونے لگتے ہیں۔ بیشتر نیوز چینل ان ملزمین کو اسی وقت مجرم قرار دے دیتے ہیں اور ان کے متعلق اتنے خوفناک انداز میں باتیں بتائی جاتی ہیں کہ ناظرین کو اس بات کا یقین ہونے لگتا ہے کہ پکڑا گیا شخص مجرم ہے۔ اس کے برعکس دوسری جانب اردو اخبارات میں اس کے متعلق جو خبریں شائع ہوتی ہیں ان خبروں کو پیش کرنے کا انداز اتنا جذباتی ہوتا ہے کہ ہر مسلمان یہی محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ اخبار اور اس کا مدیر ہی ہمدرد ہے جبکہ مدیر صرف کاروباری نیت سے سوچتا ہے۔ اس طرح کی خبریں شائع کرکے اور ایسے جذباتی انداز میں پیش کرکے وہ صرف اپنے قارئین کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔

'احوال صحافت' میں دوسرے باب کے تحت پانچ شخصیتوں کی صحافتی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ ان مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ (1) مولانا عثمان فارقلیط کی صحافت (2) محمد عتیق صدیقی کو خراج عقیدت (3) محفوظ الرحمٰن کی صحافتی خدمات (4) صحافت کا چراغ: موہن چراغی (5) رضوان احمد: گویائی سے خاموشی تک۔

باب سوم کے تحت صحافت کی سات اہم کتابوں پر مصنف نے قلم اٹھایا ہے۔ وہ کتابیں یہ ہیں۔ (1) کلکتہ کی اردو صحافت اور میں (رضوان اللہ)، (2) ابلاغیات (شاہد حسین)، (3) تعارف و تنقید اردو (خواجہ اکرام)، (4) اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857 (معصوم مراد آبادی)، (5) اردو میں نشریاتی ادب (شکیل اختر)، (6) بچوں کی صحافت کے سو سال (ضیاء اللہ کھوکھر) اور (7) عہد عالمگیر میں درباری اخبار (سید شاہ غازی الدین ایڈوکیٹ)

کتاب کا چوتھا باب 'ہم عصر الیکٹرانک میڈیا کی ایک جھلک' ہے۔ اس کے تحت پانچ مضامین شامل ہیں۔ 'میڈیا اور معاشرہ کا باہمی رشتہ' ان ہی مضامین میں سے ایک ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں میڈیا اور سماج سے اس کے باہمی رشتے کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اس میں ہمیں مثبت اور منفی دونوں باتیں ملتی ہیں جو مصنف کے معروضی رویے کا پتا دیتی ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں میڈیا، خصوصاً الیکٹرانک میڈیا نے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر قبضہ کرلیا ہے۔ چھوٹی چیز سے لے کر بڑی چیز تک کے متعلق میڈیا معلومات فراہم کرتا ہے اور بیشتر لوگ میڈیا کے ذریعے دی گئی معلومات پر بھروسہ کرتے ہوئے ہی خریداری کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ تو میڈیا اور سماج کے رشتے کا ایک اچھا پہلو ہے۔ لیکن اگر میڈیا اپنی ذمہ داریوں کا حق ادا کرنے کے بجائے غلط پروگراموں کو نشر کرنے لگے، فحش چیزوں کی نمائش کرنے لگے، فحاشی اور عریانیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرے، ماڈرنیٹی کے نام پر بے حیائی کو بڑھاوا دے، حق بات کہنے سے پہلے اپنے مفاد کا خیال رکھے تو ایسے میں سماج پر میڈیا کے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ میڈیا اور سماج کا رشتہ اتنا گہرا ہے کہ ہم چاہ کر بھی انہیں الگ الگ نہیں دیکھ سکتے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چوتھے باب میں شامل ایک اہم مضمون 'میڈیا اور سماجی سروکار' ہے۔ اس میں مصنف نے الیکٹرانک میڈیا کے تعلق سے گفتگو کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب موٹے گتّے کی جلد میں ہے۔ اس کا کور پیج جاذب نظر اور چھپائی عمدہ ہے۔ ایک دو جگہ کے علاوہ کتاب پروف ریڈنگ کی غلطیوں سے پاک ہے۔ اس کی قیمت دو سو روپے ہے جو کہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

بازدید

مصنف: سید شکیل دسنوی

صفحات: 120، قیمت: 150 روپے

ناشر: اخبار اڑیسہ پبلی کیشنز

مبصر: آفتاب احمد منیری

'بازدید' سید شکیل دسنوی کی ایک منفرد تصنیف ہے جس میں اردو ادب کی شعری یا نثری اصناف پر طبع آزمائی کرنے کی بجائے مصنف نے مختلف موقعوں پر تحریر کیے گئے اپنے تبصروں کو یکجا کردیا ہے۔ یہ تبصرے جن 38 قلم کاروں سے ہمیں متعارف کراتے ہیں ان میں فضا ابن فیضی، ناوک حمزہ پوری، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ظہیر غازی پوری، علیم صبا نویدی، ذاکر عثمانی، حیرت فرخ آبادی اور ناز قادری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

کتاب کے شروع میں مصنف نے 'پیش دید' کے عنوان سے جو سببِ تالیف قلم بند کیا ہے وہ تبصرہ نگاری کے فن اور اس کی غرض و غایت سے قارئین کو روشناس کراتا ہے۔ اس تحریر کے اندر یہ احساس بھی شدت کے ساتھ موجود ہے کہ آج کل لکھے جانے والے بیشتر تبصرے قصیدہ خوانی یا تاثراتی رائے زنی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

مصنف کے 'پیش دید' کے علاوہ 'بازدید کا پیش منظر و پس منظر' بھی شاملِ کتاب ہے۔ اس تحریر میں بھی تبصرے کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز یہ اہم معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں کہ الطاف حسین حالی کے 'مقالاتِ حالی' سے اردو ادب میں باضابطہ تبصرہ نگاری کی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ ان دو فکر انگیز تحریروں کے بعد جب مصنف کے تبصروں پر نظر پڑتی ہے تو چند ساعتوں کی خوشی مایوسی میں بدل جاتی ہے۔ اس لیے کہ مصنف کے تبصرے بذاتِ خود بھی تاثراتی رائے زنی سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''کوچۂ میر اس قبلۂ سخن کی حیثیت رکھتا ہے جہاں آسمانِ ادب خود سجدہ ریز ہوتا ہے۔'' (ص:17)

''دانشورانِ سخن اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کسی شاعر کے کلام کو الہامی شاعری کا درجہ دیا جاتا تو دور دور تک غالب کا حریف نظر نہیں آتا۔'' (ص 18)

''شوکیس میں سجا ہوا ایک حسین مجسمہ خوبصورتی کے تمام معیار پر پورا اترتا ہے۔ جس زاویے سے دیکھیے آپ اس کی خوبصورتی کی تعریف وتوصیف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔'' (ص30)

یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو مصنف تبصرہ نگاری کے حوالے سے اتنی بیش قیمت معلومات فراہم کرتا ہے اسے یہ بتانے کی ضرورت پیش آئے کہ تبصرہ کسی تصنیف سے متعلق پیش کی گئی تنقیدی رائے کو کہتے ہیں۔ یہاں چمکتے دمکتے الفاظ اور جملوں کی مرصع کاری کی مطلق گنجائش نہیں۔ بہرحال مصنف نے تبصروں کے اس مجموعے میں کچھ ایسے تبصرے ضرور شامل کیے ہیں جنھیں فنی نقطۂ نظر سے واقعی تبصرہ کہا جاسکتا ہے۔ ان میں 'کلائمکس اینٹی کلائمکس'، 'عروضِ خلیل مکّفی' اور 'فضا ابن فیضی نمبر' پر کیا گیا تبصرہ شامل ہے۔ خصوصی طور سے 'عروضِ خلیل مکّفی' کے حوالے سے مصنف نے ایک بہترین تبصرہ قلم بند کیا ہے۔ اسی طرح تبصرہ نگار نے نثار احمد صدیقی کے افسانوں پر کچھ اس انداز میں تنقید کی ہے ''ان کے افسانوں میں بیشتر کردار افسانہ نویس اور قاری کے مشترکہ شعور سے نمودار ہوتے ہیں۔'' (ص35)

چند تبصروں کو ہٹا دیا جائے تو مصنف کی زبان سادگی اور دلکشی کا پرتو معلوم ہوتی ہے۔ صفحات معیاری اور سرِ ورق دیدہ زیب ہے۔ امید ہے یہ کتاب ادبی حلقوں میں قابلِ قبول ہوگی۔

مکتوبات شبلی

مرتب: ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی
صفحات:260، قیمت:-/250روپے
زیر اہتمام: ادبی دائرہ، اعظم گڑھ
مبصر: روبی نکہت، 236، شپرا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

خطوط کی روایت کا آغاز ماقبل تاریخ سے وابستہ ہے جب انسان ایک حد تک فہم وشعور کا مرحلہ طے کرچکا تھا۔ دور دراز علاقے میں سکونت پذیر ہونے کے باعث ذاتی ملاقات کے مواقع بہت کم دستیاب تھے۔ ایسی صورت میں یہ خطوط انسانی احساس و جذبے کی ترسیل اور اس کے تبادلے کا بہترین وسیلہ ثابت ہوئے۔ معاشرے کے مختلف طبقات میں یہ روایت قدیم زمانے سے ہی پائی جاتی ہے۔ اردو ادب میں مرزا غالب کے خطوط نثر کا بہترین سرمایہ ہیں۔ اسی طرح رجب علی بیگ سرور مصنف 'فسانۂ عجائب' کے خطوط جو 'انشائے سرور' میں شامل ہیں؛ انشا پردازی کا بے مثل نمونہ ہیں۔ بعد کے زمانے میں سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، اکبرالہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، نیاز فتح پوری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مکاتیب بھی اپنے کیف وکم ہر اعتبار سے بہترین نثری اثاثے ہیں۔ ان باتوں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ مکتوباتی ادب مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ ادب عالیہ کا حصہ ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی [1857 - 1914] اردو کے صاحب طرز انشاپرداز اور ادیب ہیں۔ ان کی تصنیفات وتالیفات کا دائرہ بڑا وسیع اور متنوع ہے۔ انھوں نے تاریخ وتنقید، فلسفہ وعلم کلام اور ادب وشاعری کے ساتھ اسلامیات اور سیرت نبوی کے موضوع پر بھی تصانیف چھوڑی ہیں۔ آپ کی مشہور ومعروف تصانیف یہ ہیں؛ المامون، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم، سیرۃ النبی، سیرۃ النعمان، اورنگ زیب عالم گیر، الکلام، علم الکلام، موازنۂ انیس و دبیر، شعر العجم، مقالات شبلی، دیوان شبلی، اسکات المعتدی، الجزیہ، النقد علی التمدن الاسلامی وغیرہ—اس کے علاوہ انھوں نے خطوط کا بھی وافر ذخیرہ چھوڑا ہے پھر بھی وہ بہت کم ہیں۔ علامہ شبلی نے اپنی زندگی میں بہت سارے خطوط لکھے ہیں لیکن وہ سبھی ہماری دسترس میں نہیں آسکے۔ ان میں سے کچھ خطوط کو ہی جمع کرنا ممکن ہوسکا۔ جس کی ترتیب کی سب سے پہلی کوشش سید سلیمان ندوی نے کی اور 784 خطوط کا مجموعہ 'مکاتیب شبلی' کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع کیا۔ دوسری کوشش محمد امین زبیری نے کی اور فیضی بہنوں (عطیہ بیگم وزہرا بیگم) کے نام لکھے گئے 100 خطوط کا مجموعہ 'خطوطِ شبلی' کے نام سے 1926 میں شائع کیا۔ ان کے علاوہ جزوی کوششیں بھی ہوئیں۔ اس تعلق سے خواجہ حسن نظامی، عبدالماجد دریابادی اور سید محمد حسنین کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے خطوط رسائل وجرائد کی زینت بنے۔ اس فہرست میں اب ایک اور نام کا اضافہ ہوگیا ہے۔ وہ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی ہیں جنھوں نے شبلی کے ان خطوط کو جمع کیا ہے جو رسائل اور دوسری کتابوں میں بکھرے پڑے تھے۔

تازگی، ندرت اور ایجاز شبلی کے اسلوب کی خصوصیت ہے۔ اس کے ساتھ زبان کی سادگی اور ادائے مطلب میں بے تکلفی ان کے خطوط کا بنیادی وصف ہے۔ مولوی عبدالحق نے 'خطوطِ شبلی' کے مقدمہ میں ان کے اسلوب کے انھیں خصوصیات کو نشان زد کرتے ہوئے تحریر کیا ہے: ''ان خطوط کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے؛ تکلف کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی دَراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا۔ گویا انسان اپنے سے خود باتیں کرتا ہے، جہاں اندیشۂ لائم نہیں ہوتا۔ یہ دلی جذبات اور خیالات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔ پھر کون ہے جو اس خاموش آواز کو سننے کا مشتاق نہ ہوگا۔ یہ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں، آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق اور شوق سے پڑھتے ہیں۔''

ڈاکٹر الیاس اعظمی کا نام 'مطالعات شبلی' کے حوالے سے بڑی اہمیت کا حامل ہے انھوں نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ علامہ شبلی کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ یکے بادیگرے شبلی کے تعلق سے ان کی کئی تصانیف شائع ہوچکی ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: متعلقات شبلی، کتابیات شبلی، شبلی سخنوروں کی نظر میں اور آثار شبلی کے بعد مکتوبات شبلی وغیرہ—ابھی تک شبلی کے تعلق سے بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ جس توجہ اور خلوص کے ساتھ انھوں نے لکھا ہے اس پر وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ مکتوبات شبلی — شبلی کے 210 خطوط کا مجموعہ ہے جسے مکتوب الیہ کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک اچھی کوشش اور بہترین خراج عقیدت ہے۔ ہاں پروف کی خامیاں گراں گزرتی ہیں۔

ذرہ بھر روشنی

مصنف: حسن مثنیٰ
صفحات 256، قیمت:200 روپے
ناشر: ایلیا پبلی کیشنز، گوپال پور، باقر گنج، سیوان (بہار)
مبصر: تابش مہدی، J-5/A، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

'ذرّہ بھر روشنی' اُردو کے جواں سال اسکالر ڈاکٹر حسن مثنیٰ کے اُن مضامین کا مجموعہ

ہے، جو وہ مختلف شعرا اد با اور ادبی نظریات ور جحانات کو موضوع بنا کر لکھتے رہے ہیں۔ ان میں وہ مضامین بھی ہیں جو انھوں نے کسی علمی و ادبی سیمینار کے لیے سپرد قلم کیے تھے اور وہ بھی جو انھوں نے محض کسی رسالے یا جریدے کی فرمائش پر لکھے اور وہ اُن میں شائع بھی ہوئے۔ ان کی مجموعی تعداد چودہ (14) ہے۔ عناوین کی فہرست اس طرح ہے۔ شاد عظیم آبادی مکتوبات کے آئینے میں، سرسید کا قومی شعور، پریم چند کا نظریۂ تعلیم، انسان کو بیدار تو ہو لینے دو، حسن، عشق اور رومان کی تثلیث اور جگر کا فن، سجاد ظہیر کی خاکہ نگاری، فیض اقوال کے آئینے میں، جدیدیت کے علم بردار وہاب دانش، عینی کے افکار و نظریات، احمد فراز کی تخلیقی حسیت، سرشار اور یوسفی کے دو منفرد کردار، ممتاز شیریں کا افسانوی سفر، مرثیوں میں ہندوستانی سماج کی عکاسی اور اردو شاعری کا سیکولر کردار۔

چونکہ حسن مثنّیٰ ایک ذہین اور سرگرم و فعال اسکالر ہیں اور معلّمی کے پیشے سے وابستہ ہیں، اس لیے ان کے مضامین میں خاصا تنوع بھی ہوتا ہے اور تدریسی ضرورت کے پیش نظر بڑی حد تک معلومات بھی فراہم کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ اُن مضامین کو پڑھ کر طالب علم متعلقہ موضوع پر بہت کچھ جان سکتا ہے۔ سرسید احمد خاں، منشی پریم چند، قرۃ العین حیدر اور فیض احمد فیض ہماری آج کی اردو درسیات کا اہم جزو ہیں۔

ان کے سلسلے میں حسن مثنّیٰ نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کے گہرے مطالعے اور علمی جستجو کا اندازہ ہوتا ہے۔ اِس سے یقیناً طلبہ کو استفادے کا موقع ملے گا۔ کتاب کے دوسرے مضامین بھی معلومات افزا ہیں اور مصنف کی علمی و ادبی جستجو اور ناقدانہ فہم و بصیرت کا پتا دیتے ہیں۔

اردو تنقید کے موجودہ منظرنامے کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ تنقیدیں تو بہت لکھی جارہی ہیں، مسلسل مضامین و مقالات دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے رہتے ہیں اور کتابیں بھی شائع ہورہی ہیں، لیکن ان مضامین و مقالات اور کتابوں میں زبان و بیان، املا و انشا اور لغات و محاورات کی طرف سے سخت بے توجہی ملتی ہے۔ یہ چیز 'ذرّہ بھر روشنی' میں بھی دیکھنے کو ملی۔ کتاب کے نام سے لے کر اس کے اختتام تک بے شمار ایسی چیزیں ملیں جو بہرحال کسی ایسی کتاب میں نہیں ہونی چاہئیں تھیں، جو تنقید کے حوالے سے پیش کی جارہی ہیں اور اس کا مصنّف اردو زبان کا استاذ بھی ہے۔ اگر کتاب کی اشاعت سے پہلے انھوں نے ان مضامین کو کسی اہلِ نظر کی نگاہ سے گزار لیا ہوتا تو یہ نقائص دور ہوسکتے تھے۔

یہ چند باتیں میں نے بہ طورِ تذکیر لکھ دیں۔ تاکہ دوسرے اربابِ قلم اور اساتذہ بھی اِس طرف توجہ فرمائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زیرِنظر کتاب صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے ایک اچھی اور قابلِ قدر کتاب ہے۔ بلاشبہ یہ طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے لائقِ مطالعہ ہے۔ اس سے ان کی بصارت بھی اضافہ ہوگا اور بصیرت میں بھی۔

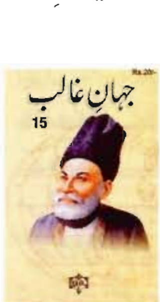

جہانِ غالب

جلد 8، شمارہ 15 (دسمبر 2012 تا مئی 2013)
نگراں: پروفیسر شمیم حنفی، مدیر: ڈاکٹر عقیل احمد
ناشر: غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی 13
مبصر: سلمان فیصل، 370/6A ذاکر نگر، نئی دہلی 25

اردو کے آفاقی شعرا میں غالب کا مقام سرفہرست ہے۔ غالب پر آج بھی رسالوں میں گوشے اور نمبر شائع ہوتے رہتے ہیں اور نت نئے انکشافات ہماری حیرت و استعجاب میں اضافے کے باعث بنتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ 'جہانِ غالب' جیسے رسالے صرف مطالعۂ غالب کے لیے مخصوص کیے جاتے ہیں جس میں صرف غالب پر تحریریں شامل ہوتی ہیں۔

غالب اکیڈمی نئی دہلی سے شائع ہونے والا رسالہ 'جہان غالب' اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہے جس میں غالب کے حوالے سے مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ نئے مضامین کے ساتھ کبھی کبھی اُن قدیم مضامین کو بھی جگہ دی جاتی ہے جو غالب اسٹڈیز میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پیش نظر شمارہ بھی جدید و قدیم مضامین پر مشتمل ہے۔ اس شمارے میں جو مضامین شامل ہیں وہ مختصر، متوسط اور طویل بھی ہیں۔

پہلا مضمون پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب کا 'احتشام حسین بحیثیت غالب شناس' کے عنوان سے ہے جو کہ سترہ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مضمون دراصل وہ لیکچر ہے جو پروفیسر احتشام حسین کی پیدائش کے سو سال مکمل ہونے پر غالب اکیڈمی میں پروفیسر علی احمد فاطمی نے پیش کیا تھا۔ یہ مقالہ احتشام حسین کے ان مضامین کے حوالے سے ہے جو انھوں نے غالب پر تحریر کیے تھے اور جن کی تعداد غالباً ڈیڑھ درجن ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کے مطابق احتشام حسین نے 1948 سے غالب پر لکھنا شروع کیا تھا لیکن 1969 میں غالب کے صدی سال وفات کے موقع پر ہی آدھا درجن مضامین لکھ ڈالے تھے۔ غالب پر لکھے گئے ان مضامین میں غالب کو ترقی پسند تنقید کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے جہاں غالب کے بارے میں ترقی پسند ناقدین کی آرا سامنے آتی ہیں وہیں احتشام حسین کی تنقیدی بصیرت اور غالب شناسی کا بھی علم ہوتا ہے۔ بقول پروفیسر علی احمد فاطمی ''غالب کی شاعری کے گن تو سبھی گاتے رہتے ہیں لیکن ان عوامل اور محرکات پر پہلی بار ترقی پسند تنقید نے عمیق نظر ڈالی اور بڑے غالب کو بڑے تناظر میں پیش کیا جس کی اولیت کا سہرا بہرحال احتشام حسین کو جاتا ہے''۔

پیش نظر شمارے کا دوسرا طویل اور مبسوط مضمون پروفیسر یوسف حسین خاں (مرحوم) کا 'متحرک جمالیات' کے موضوع پر ہے۔ یہ مبسوط اور طویل مضمون دراصل پروفیسر یوسف حسین خاں کے طویل ترمضمون غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات کا ایک حصہ ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے غالب اور اقبال کے حرکی تصورات کی مثالیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہیں۔ بقول یوسف حسین خاں ''دونوں شعرا کا جمالیاتی تجربہ فکر اور وجدان سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔ دونوں نے اپنی شاعری میں حقیقت کا، سکون و جمود کی حالت میں نہیں بلکہ فخر کی حالت میں مشاہدہ کیا۔'' اس مضمون میں مصنف نے اقبال اور غالب کے کلام سے بے شمار مثالیں پیش کر کے دونوں کی شاعری کی متحرک جمالیات کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے اور ان کے کلام میں ایسے استعاروں اور علامتی پیکروں کو تلاش کیا ہے جن سے حرکت و عمل کا احساس ہوتا ہے۔ بقول یوسف حسین خاں ''اقبال کے حرکی تصورات، اس کے ذہن کی تخلیق میں اور غالب کا متحرک نقطۂ نظر اس کی فطرت کا اقتضا ہے۔ دونوں کی متحرک جمالیات میں ان کے رویے نمایاں ہیں۔ دونوں کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ آزادی اور حرکت کے اصول کے بغیر انسان کی روحانی اور مادی زندگی کی تکمیل نہیں ہوسکتی''۔

'غالب بحیثیت فارسی شاعر' کے عنوان سے ڈاکٹر نیلوفر نازنحوی کا ایک مختصر مضمون رسالے میں شامل ہے۔ جس میں انھوں نے غالب کے فارسی کلام پر عمومی گفتگو کی ہے اور غالب کی فارسی غزلوں کے چند اشعار کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر نیلوفر کا کہنا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب ہم غالب کو نہ صرف اردو بلکہ فارسی کے توسط بھی یاد کریں گے اور غالب کو فارسی کے توسط سے بھی سلام بھیجیں گے۔

□

یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو کے نمبر کل نمبروں میں جڑیں گے

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بی اے، بی ایس سی اور بی کام کورس میں داخلہ لینے والے طلبہ کو اردو ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھنا ہوگا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اکیڈمک کونسل کے مشورے سے شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر محمد زاہد کی کنویز شپ میں قائم کی گئی کمیٹی کی سفارشات کو منظوری دیتے ہوئے اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے بی اے، بی ایس سی اور بی کام کورس میں تعلیمی میقات 2014-2013 کے دوران داخلہ لینے والے تمام طلبہ کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ اس نظم کے تحت طلبہ کی تین قسموں کے مطابق اردو کے مختلف النوع نصابات نافذ ہوں گے۔ ایسے طلبہ جنھوں نے سینئر سیکنڈری اسکول یا

انٹرمیڈیٹ سطح پر اردو کی تعلیم حاصل کی ہے، انھیں 'ایلیمنٹری اردو اے' پڑھنا ہوگا جب کہ ایسے طلبہ جنھوں نے اردو کی تعلیم کبھی حاصل نہیں کی ہے یا جو اتر پردیش سے متصل ریاستوں سے تعلق رکھتے ہیں انھیں 'ایلیمنٹری اردو بی' پڑھنا ہوگا اور غیر ملکی طلبہ یا ایسے طلبہ جو ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا ذکر اے ایم یو ایڈمشن گائیڈ 2014-2013 میں ٹیبل vi کے تحت درج ہے، انھیں 'غیر مادری زبان (اردو)' پڑھنا ہوگا۔ اے ایم یو رجسٹرار گروپ کیپٹن (ریٹائرڈ) شاہ رخ شمشاد کے دستخط سے جاری نوٹیفکیشن میں کہا گیا ہے کہ بی اے، بی ایس سی اور بی کام (سال اوّل) میں لازمی اردو کے محصلات طلبہ کل نمبرات میں شامل کیے گئے جائیں گے اور اس سے ڈویژن پر بھی اثر پڑے گا۔ اس مضمون میں پاس ہونے کے لیے طلبہ کو 50 میں سے کم سے کم 17 نمبر حاصل کرنا ہوں گے اور ڈگری کے حصول کے لیے سال دوئم تک اس مضمون میں کامیابی حاصل کرنی ہوگی۔ نوٹیفکیشن میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اس مضمون کی کلاسوں میں 75 فیصد حاضری لازمی ہوگی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 17 جولائی 2013

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ٹیگور پروجیکٹ کا پہلا توسیعی خطبہ

نئی دهلی: کبیر داس اور ٹیگور ہندوستان کی دو عبقری شخصیتیں ہیں۔ دونوں ہندوستانی ادبیات کے روشن ستارے ہیں۔ کبیر کی بنت بہت نرالی تھی انھوں نے مختلف علامتوں کی مدد سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ٹیگور نے کبیر کی سو نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ قابل توجہ ہے کہ کبیر میں آخر ایسی کیا خوبی تھی جس نے شہرہ آفاق شاعر و ادیب ٹیگور کو ان کی طرف متوجہ کیا۔ ان خیالات کا اظہار شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کے زیرِ اہتمام منعقدہ پہلے توسیعی خطبے میں ممتاز ہندی ادیب و دانشور پروفیسر مجیب رضوی نے کیا۔ اردو کے ادیبوں کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ ہندوستانی ادبیات سے اپنا رشتہ قائم کریں۔ ٹیگور کے ترجمے کے لیے بنگلہ زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں سے ضرور مدد لی جانی چاہیے۔ خطبے کا آغاز حافظ محمد جہانگیر اکرم کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ مہمانوں کا استقبال شعبہ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے کیا اور کہا کہ شعبہ اردو کے ٹیگور پروجیکٹ کے اس لیکچر میں پروفیسر مجیب رضوی اور سید شاہد مہدی کی آمد ہم سبھوں کے لیے مسرت کی بات ہے۔ توسیعی خطبے کی نظامت اردو کے ممتاز شاعر اور شعبہ اردو کے پروفیسر شہپر رسول نے کی۔ انھوں نے ہندوستانی ادبیات میں ٹیگور کی اعلیٰ خدمات پر موثر گفتگو کی۔ ٹیگور ریسرچ

تصویر میں دائیں سے بائیں پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر مجیب رضوی، سید شاہد مہدی اور پروفیسر وہاج الدین علوی

اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم کے کنویز پروفیسر شہزاد انجم نے سبھی معزز مہمانوں، اساتذہ اور طلبا و طالبات کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس پروجیکٹ کے تحت گیتا نجلی اور گورا کے اردو تراجم کے علاوہ ٹیگور کے تعلق سے متعد کتابیں شائع ہو کر جلد منظر عام پر آئیں گی۔ اس موقعے پر اس پروجیکٹ کے تحت شائع ہونے والی شمیم طارق کی تحقیقی و تنقیدی کتاب 'ٹیگور شناسی' کی ایک ایک جلدیں شرکا کو مطالعے کے لیے دی گئیں۔ اس توسیعی خطبے میں پروفیسر اصغر وجاہت، پروفیسر عبدل بسم اللہ، پروفیسر خالد حامدی، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر حبیب اللہ، ڈاکٹر عبدالرشید، محمود فاروقی، انوشا رضوی، اسرار جامعی کے علاوہ شعبہ اردو جامعہ کے اساتذہ اور کثیر تعداد میں طلبا اور طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 اگست 2013

ڈنمارک کوپن ہیگن سے شائع ہونے والے اردو جرائد

ایک طائرانہ نگاہ

نصر ملک

شمال مغربی یورپ کے کونے میں الگ تھلگ، بحر شمالی کے پانیوں میں جزیرہ در جزیرہ منقسم ملک ڈنمارک کے دارلحکومت کوپن ہیگن سے اردو جریدوں کی اشاعت، یہاں روزگار کے لیے، آباد ان پاکستانی تارکین وطن کی مرہون منت ہے جو یہاں 1960 کے عشرے میں آئے اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔

اب پہلی نسل کے ان پاکستانیوں کی دوسری اور تیسری پیڑھی جوں جوں جوان ہوکر مقامی معاشرے میں گھلتی ملتی جارہی ہے اس میں گھر کی حد تک اردو بول چال کا ماحول تو ہوسکتا ہے، لیکن اس دوسری یا تیسری نسل کو اردو موسیقی کے علاوہ اردو اخبارات و جرائد اور کتابوں کے مطالعے کا بھی کوئی شوق ہو، اس بارے میں بڑے محتاط طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ایسا نہیں ہے، لیکن کیوں؟، اس کی بہت سی وجوہات ہیں جو ہمارے اس مختصر سے مضمون کے موضوع سے تعلق نہیں رکھتیں ورنہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ تو آیئے اپنے اصل موضوع کی جانب لوٹتے ہیں۔

ڈنمارک کے دارلحکومت کوپن ہیگن سے سب سے پہلا اردو ماہانہ اخبار 'صدائے پاکستان' 1972 سے شائع ہونا شروع ہوا۔ صدائے پاکستان کی اشاعت کے محرک، میڈیسن کے ایک پاکستانی طالب علم ظفر ملک تھے۔

شروع میں یہ پرچہ اردو اور ڈینش، دونوں زبانوں میں شائع ہوتا رہا اور اپنی اشاعت کے صرف تین ماہ بعد راقم الحروف (نصر ملک) کو اس کا مدیر مقرر کیا گیا اور اس میں عربی زبان کے صفحات بھی شامل کر لیے گئے اور اس طرح 'صدائے پاکستان' بیک وقت جہاں اردو اور عربی پڑھنے والوں کی ترجمانی کرنے لگا وہاں ڈینش حکام تک اپنا نقطہ نظر پہنچانے کے لیے اس کے ڈینش صفحات مختص تھے۔ ڈنمارک میں غیر ملکیوں (پاکستانیوں) کا یہ پہلا اپنا اخبار تھا۔ پانچ برس تک 'صدائے پاکستان' ایک ماہنامہ کے طور پر شائع ہوتا رہا اور پھر اسے پندرہ روزہ کر کے ایک مکمل 'اردو' پرچے میں بدل دیا گیا جو آٹھ سال تک مسلسل جاری رہا۔

شمال مغربی یورپی ممالک مثلاً ڈنمارک، سویڈن اور ناروے میں 'صدائے پاکستان' اردو کا پہلا پرچہ تھا۔ نصف اخباری سائز میں 'صدائے پاکستان' بیس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور اس میں زیادہ تر مواد اگرچہ ڈنمارک، ناروے اور سویڈن کے پاکستانیوں کے بارے، میں بازار روزگار کے قوانین و صورت حال کا تذکرہ ہوتا تھا لیکن جنوبی ایشیائی ممالک کی سیاسی صورت حال اور خاص کر پاکستان، بھارت و بنگلہ دیش کے بارے میں خصوصی تجزیاتی مضامین اور خاص رپورٹیں بھی شامل ہوتی تھیں۔

اردو ادب کے حوالے سے 'صدائے پاکستان' نے ڈنمارک کے پاکستانی و ہندوستانی تارکین وطن میں شعور پیدا کرنے اور انھیں اردو شعر و نثر کی محفلیں منعقد کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا اور اس سلسلے میں ہمیشہ ان کی رہنمائی اور سرپرستی کی اور ڈنمارک میں اردو ادب کے حوالے سے جو 'بہار' اب دکھائی دیتی ہے اس کا بیج ادارہ 'صدائے پاکستان' ہی کا بویا ہوا ہے۔

'صدائے پاکستان' کی مکمل فائل کوپن ہیگن کی 'اسٹیٹ لائبریری آرھس کے شعبہ آرکائیو' میں موجود ہے اور ڈنمارک میں پاکستانیوں و ہندوستانیوں کے ابتدائی ایام کی صورت حال جاننے کے لیے حوالے کے طور پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈنمارک سے شائع ہونے والا اردو کا دوسرا پرچہ 'امن' تھا جس کے بانی و ایڈیٹر سردار شمشیر سنگھ شیر تھے۔ شمشیر سنگھ اردو و پنجابی کے ایک معروف شاعر تھے اور ان کی شاعری کے تین مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ 1973 میں انھوں نے جب 'ماہنامہ امن' کا اجرا کیا تو اس کا بڑا مقصد 'صدائے پاکستان' کا مقابلہ کرنا اور بھارت کی حمایت میں ایشیائی تارکین وطن کے حلقوں میں رائے عامہ ہموار کرنا تھا۔ 'ماہنامہ امن' کوئی چھ ماہ تک جاری رہنے کے بعد تب بند ہوا جب اس کی سرپرستی کرنے

والوں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ سردار شمیر سنگھ شیر نے پرچے کو اپنی تشہیر کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ 'صدائے پاکستان' کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہے تھے۔

اب تک ڈنمارک سے اردو کے کوئی اکیس بائیس پرچے شائع ہوتے رہے ہیں جن میں سے تین چار کو چھوڑ کر باقی دم توڑ چکے ہیں لیکن ان میں سے اب بھی کوئی نہ کوئی کبھی کبھار جلوہ نما ہو جاتا ہے اور اپنے 'ہونے' کا احساس دلا دیتا ہے۔ اس وقت 'حاضر' اردو جرائد میں ماہنامہ 'وقار' قابل ذکر ہے۔ ماہنامہ وقار ماسٹر ذوالفقار کی ادارت میں پچھلے اٹھارہ انیس سال سے بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا اور مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس پرچے میں زیادہ تر پاکستانی برادری سے تعلق رکھنے والے مقامی واقعات کی خبریں ہوتی ہیں۔ برادری میں شادی بیاہ کی مبارکبادیوں کے پیغامات، اموات پر تعزیت کا اظہار۔ کسی کے ہاں کوئی پیدائش ہو تو اس کا ذکر، غرض کہا جا سکتا ہے کہ یہ پرچہ پاکستانی برادری کے لیے ایک ایسے 'دیہاتی نمبردار' کا کردار ادا کرتا ہے جو برادری میں رونما ہوئے ہر اچھے برے واقعے، پیدائش و اموات اور شادی و طلاق کا ریکارڈ محفوظ کرتا چلا آرہا ہے۔ پرچہ 'مسلمانوں کی نمائندگی' کا دعویدار ہے اس لیے کبھی کبھار خود مسلمانوں ہی کی تنقید کا نشانہ بھی بن جاتا ہے۔ اس پرچے کے سارے اخراجات اس میں شائع ہونے والے پاکستانی کاروباری اداروں اور دکانوں کے اشتہارات سے پورے کیے جاتے ہیں۔ ایک ماہنامہ 'سرپرائیز' کچھ عرصے کے لیے مفت تقسیم کیا جاتا رہا لیکن بعد میں بند کر کے اسے ماہنامہ 'ساحل' کے نام سے جاری کیا گیا جو اب بند ہو چکا ہے اس کے مدیر محمد آصف تھے۔ اسی طرح ایک اور ماہنامہ 'وطن نیوز' بھی مارکیٹ میں ہے، جس کے مدیر امانت علی چوہدری ہیں۔ یہ پرچہ بھی مفت تقسیم ہوتا ہے۔ اور یہی وہ واحد پرچہ ہے جو بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔

ماہنامہ 'تنظیم' پاکستان کی جماعت اسلامی کی ذیلی تحریک 'تنظیم اسلامی' کی نمائندگی کرتا اور اس لحاظ سے اپنے آغاز سے لے کر آج تک ایک 'متنازع' پرچہ رہا ہے۔ غالباً 1975 میں ماہنامہ تنظیم کی اشاعت کا آغاز محامد صدیقی نے کیا تھا۔ وہی اس کے مدیر تھے اور تنظیم اسلامی کے کرتا دھرتا بھی۔ لیکن پھر یہ ماہنامہ 'تنظیم' کچھ عرصے تک خواجہ حسن کاشمیری کی ادارت میں شائع ہوتا رہا جو بعض ذرائع کے مطابق، محض ایک فرضی نام تھا۔ 'اندرونی رازداں' متفق ہیں کہ ماہنامہ تنظیم کے اصل کرتا دھرتا طارق عسکری تھے۔ یہ پرچہ بھی مفت تقسیم کیا جاتا تھا لیکن اب مدت ہوئی یہ بھی دم توڑ چکا ہے۔

طارق عسکری نے پاکستان سے شائع ہونے والے 'حرمت' رسالے سے مل کر یہاں سے 'حرمت' ہی کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا اور 1996 میں جاری ہونے والا یہ رسالہ کوئی زیادہ دیر نہ چل سکا۔ اگرچہ اس کی پیشانی پر 'کوپن ہیگن اور اسلام آباد سے بیک وقت شائع ہونے والا پرچہ' کے الفاظ لکھے ہوتے تھے لیکن اصل میں یہ کبھی کوپن ہیگن سے شائع ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ پرچہ بھی اب بند ہو چکا ہے۔ اس کا پاکستانی ایڈیشن آج بھی جاری ہے۔

ماہنامہ 'انقلاب' حادثاتی طور پر جنم لینے والا نومولود پرچہ تھا اور اب تو کافی عرصے سے بازار میں دکھائی نہیں دیا۔ یہ پاکستان مسلم لیگ نواز شریف کا ترجمان تھا اور اس

ڈنمارک کے دارلحکومت کوپن ہیگن سے سب سے پہلا اردو ماہانہ اخبار 'صدائے پاکستان' 1972 سے شائع ہونا شروع ہوا۔ صدائے پاکستان کی اشاعت کے محرک، میڈیسن کے ایک پاکستانی طالب علم ظفر ملک تھے۔ شروع میں یہ پرچہ اردو اور ڈینش، دونوں زبانوں میں شائع ہوتا رہا

حوالے سے زیادہ تر سیاسی مواد ہی شامل اشاعت کرتا تھا اس کے مدیر صدیق ملک تھے اور یہ پرچہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اشتہارات پر انحصار کرتے تھے۔ یہ مفت تقسیم ہوتا تھا۔ تعداد اشاعت معلوم نہیں لیکن اس کے قریبی ذرائع کا کہنا ہے کہ کوئی سوڈیڑھ سو کاپیاں شائع ہوتی تھیں۔

پاکستانی طلبا کی تنظیم 'اپسا' کا ماہنامہ 'اپسا' ڈینش اور اردو، دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا اور طلبا کی سماجی، ثقافتی اور علمی سرگرمیوں کی عکاسی کرتا اور ڈینش تعلیمی حلقوں میں ان کے لیے امکانات کی نشاندہی کرتا تھا۔ اپنے ممبران کو چندے کی ادائیگی پر مائل کیا جاتا تھا اور برادری کے باشعور احباب کو تحفتاً پیش کیا جاتا تھا۔ عرفان گوندل اس کے مدیر تھے۔ اب یہ بھی ختم ہو چکا ہے۔

ماہنامہ 'دستک' نے 1996 میں پاکستانیوں کے دروازے پر دستک دی۔ چوہدری امانت اور بعد میں نواز سندھو کی ادارت میں 1997 تک شائع ہوتا رہا۔ ادارہ منہاج القرآن کا ترجمان تھا اس لیے دین و سیاست' دونوں میں مولانا طاہر القادری کے گن گاتا تھا۔

ماہنامہ 'تحریک' 2000 سے شیخ اشفاق احمد کی ادارت میں شائع ہوتا رہا اور قوم وملت کی بھلائی کے لیے مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔ مولانا طاہر القادری کی سیاسی پارٹی 'پاکستان عوامی تحریک' کا وفادار تھا۔ یوں شیخ اشفاق 'دین و سیاست' دونوں میں ثواب حاصل کرتے ہوئے اپنے 'ہم مسلکوں' کی شفاعت کا سامان کرتے رہے۔ اور پھر خود ہی غائب بھی ہو گئے۔

1981 میں 'وحدت' کے نام سے عنصر علی خان نے ماہنامہ جاری کیا اور بعد میں اس کا نام 'ترجمان' رکھ دیا گیا۔ ان دونوں کی ادارت میں اسلام ساقی' محمد ایوب، اور صوفی منیر پیش پیش ہوتے تھے۔ ماہنامہ 'آئینہ' 1980 میں راجہ ظفر اقبال اور راجہ لیاقت نے مل کر جاری کیا جو ایک سال تک چلا۔ 'صدائے حق' ظفر چوہدری کا پرچہ تھا اور ابھی تک ہے بھی۔ سال میں کبھی شائع ہوتا ہے جب ضرورت ہوتی ہے۔ نظریہ پاکستان کا حامی اور اس حوالے سے لفظ 'پاکستان' کے 'خالق' چوہدری رحمت الٰہی کے نظریات وخیالات کا ترجمان اور مبلغ ہے۔

ایک ماہنامہ 'شاہین' 1995 میں خواجہ آصف کی ادارت میں بڑی دھوم دھام سے نکلا اور ایک سال تک خوب عروج پر رہا۔ علمی و ادبی ہر لحاظ سے ایک جاندار پرچہ تھا۔ مفت تقسیم ہوتا تھا اور کافی جانا جاتا تھا۔ لیکن پھر اچانک ایسا بند ہوا کہ جاری نہ ہو سکا۔

ماہنامہ 'ندائے حق' 2000 میں رحمت اللہ بیگ نے جاری کیا اور چند ایک شماروں کی اشاعت کے بعد بند کر دیا۔ ماہنامہ 'نصیحت' بشارت احمد کافی عرصے سے شائع کرتے ہیں یہ پرچہ جماعت احمدیہ کے حوالے سے احمدی مسلک کی ترجمانی کرتا ہے۔ بشارت احمد ایک معروف شاعر ہیں اور شاید اسی وجہ سے ان کے اس پرچے میں شعر وادب کے لیے بھی چند ایک صفحات مخصوص ہوتے ہیں۔ احمدیہ برادری میں کافی مقبول ہے غیر احمدی، مسلمانوں کے علاوہ دیگر حلقوں میں مفت بانٹا جاتا ہے۔ بشارت احمد ایک پرچہ الجہاد بھی شائع کرتے ہیں۔

ماہنامہ 'منزل' کی پیشانی پر اگرچہ درج ہوتا ہے کہ ''سٹاک ہالم سویڈن اور کوپن ہیگن ڈنمارک سے بیک وقت شائع ہوتا ہے لیکن اصل میں یہ پرچہ ملتان سے بڑی محدود تعداد میں شائع ہو کر ڈنمارک اور سویڈن میں تقسیم ہوتا ہے۔ اردو زبان وادب کی ترویج کا دعویدار ہے لیکن دوسرے اخبارات کے تراشوں کی اس میں بھر مار ہوتی

ہے۔ اس کے مدیران میں ڈنمارک سے اقبال اختر اور سویڈن سے جمیل احسن کے نام اس کی پیشانی پر درج ہوتے ہیں۔ جمیل ایک اچھے شاعر ہیں اوران کی شاعری کے تین مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اقبال اختر کرانے کی دوکان کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ شاعری بھی۔ پرچہ نکالنا 'گھر جلا کر تماشا دیکھنے کے مترادف' ہے اور وہ یہ تماشا دیکھ اور دکھا رہے ہیں۔ یہ پرچہ بھی مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔

یوسف خلجی پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک سرکردہ کارکن تھے کئی سال پہلے انھوں نے پارٹی کی ترجمانی کے لیے 'صداقت' نام سے ایک پرچہ نکالا تھا لیکن اب یہ پرچہ بند ہے۔ جب تک جاری رہا پاکستان کے فوجی آمر جنرل ضیاء الحق کے خلاف 'جہاد بالقلم' میں مصروف رہا۔ ماہنامہ 'اطلاعات' پاکستان پیپلز پارٹی کی خواتین ونگ کا ترجمان تھا اور پارٹی کی ڈنمارک میں رہنما بیگم ستارہ نسیم الٰہی کی ادارت میں بڑے زور وشور کے ساتھ شائع ہوا کرتا تھا لیکن ایک مدت سے اب اس کا بھی نام ونشان نہیں۔

ماہنامہ 'خاندان' 2000 میں کوئی دو تین بار شائع ہوا اور پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے مدیر درویش صفت، بندہ پرور رضی احمد صدیقی تھے جو کسی زمانے میں ڈنمارک میں پاکستان کے سفارت خانے میں 'کمیونیٹی ویلفیئر اتاشی' تھے۔ 'صدائے پاکستان' کے پلیٹ فورم سے، ڈنمارک میں 'اردو مشاعرے' کی پہلی 'باقاعدہ نشست' انہی کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ واہ کیا خوب منظر تھا۔

سہ ماہی 'ظریف پنچ' سید ترغیب بلند نقوی اوران کی اہلیہ محترمہ سیدہ تسنیم فاطمہ کی ادارت میں پاکستان سے شائع ہو کر ڈنمارک میں تقسیم ہوتا تھا یہ واحد پرچہ تھا جو خالصتاً علمی وادبی اور جاندار ثقافتی پرچہ تھا ترغیب اور تسنیم دونوں امروہہ کے سادات کے ایسے علمی وادبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں شعر وادب بچوں کو ورثے میں ملتے ہیں۔ اپنی جیب سے پرچہ نکالتے اور ذوق رکھنے والوں کے لیے ان کے گھروں پر مہیا کرتے تھے سیدہ تسنیم فاطمہ اگرچہ اب اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں اور ترغیب اس پرچے کو بھول چکے ہیں۔ تو قارئین! یہ تھا ڈنمارک سے شائع ہونے والے اردو جرائد کا کچھ تذکرہ۔ اب کچھ ذکر ڈنمارک کے حوالے سے قدیم ہندوستان میں ان ادبی سرگرمیوں یا ان سے متعلقہ قدیم کام کاج کا بھی ہو جائے جو ڈینشوں نے سرانجام دیے۔

ڈنمارک میں تاریخ کے حوالے سے جب بھی ہندوستان کا ذکر آتا ہے تو ذہن ڈنمارک اور ہندوستان کی صدیوں پرانی دوستی کی طرف چلا جاتا ہے۔ بسلسلہ روزگار کوئی تیس بتیس سال پہلے یہاں ڈنمارک میں آنے اور اب یہیں کے ہو کر رہ جانے والے پاکستانی و ہندوستانی جن کے آبا ایک ہی دھرتی کے 'پروردہ' تھے وہ آج شاید ہی اس بات سے آگاہ ہوں کہ ڈنمارک میں جہاں وہ آج ایک تارک وطن اور اجنبی کی حیثیت میں رہتے اور بھورے، کالے رنگ وروپ کی وجہ سے طعنے سنتے ہیں، اس ملک کے باشندے 1620 میں ہندوستان پہنچ چکے تھے لیکن کیسے؟

قصہ یوں ہے کہ 1620 میں ڈنمارک کے شاہ کرسچن چہارم جو اُس زمانے میں ناروے کے بھی بادشاہ تھے انھوں نے اپنے دو خاص ایلچیوں کو ہندوستان کے علاقے (موجودہ ریاست تامل ناڈو) میں تھنجور کے راجہ رگھوناتھ نایک کے پاس بھیجا تاکہ وہاں تجارت کے امکانات کا جائزہ لیا جاسکے۔

ان ڈینش ایلچیوں نے تھنجور کے ضلع زنجیار میں اپنی تجارتی منڈی قائم کر کے سلطنت ڈنمارک اور تھنجور کے درمیان دوہری تجارت کا ایک معاہدہ طے کیا۔ یہ معاہدہ جو سونے کے ایک 'بھاری پترے' پر کندہ ہے آج بھی کوپن ہیگن کی 'پترے شاہی دستاویزات' میں موجود ہے اور دیکھا جاسکتا ہے۔ تھنجور یا جیسا کہ ڈینش زبان میں اسے 'تھنکیبار' کے نام سے جانا اور پکارا جاتا ہے وہاں پر اپنی تجارتی منڈی قائم کرنے کے بعد ڈینش تجارتی سرحدیں 'سیرام پور' تک وسیع ہو گئیں اس علاقے پر ڈینش ایسٹ انڈیا کمپنی 1855 میں بہت پہلے اپنے قدم جما چکی تھی اور اس طرح زنجیار اور سیرام پور میں راجہ رگھوناتھ نایک کی راجدھانی میں ڈینش تجارتی چوکیاں 1620 سے لے کر 1855 تک قائم رہیں اس کے بعد ڈینشوں نے ہندوستان میں اپنے تجارتی حقوق ومراعات اور جائیدادیں خود ہی برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو فروخت کر دیں۔

ہندوستان میں ڈینش 'استعماریت' کے ایک سو پینتیس سال کے عرصے کے دوران شاہ ڈنمارک اور اس کے بعد تاج ڈنمارک کے وارثوں نے 'سیرام پور' میں اپنا شاہی نظم ونسق اور معاملات'' چلانے کے لیے وقفے وقفے سے چونتیس گورنر مقرر کیے۔ ان ڈینش گورنروں نے اس زمانے سے متعلقہ ہندوستانی تہذیب وتمدن، علم وادب اور فلسفہ حیات اور رسوم و مذاہب کو ڈنمارک میں متعارف کرانے میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ 1620 سے لے کر 1855 تک تھنجور میں متعین ڈینش گورنروں اور خاص کر پادریوں نے تھنجور سے لکھے ہوئے اپنے خطوط، روزنامچوں اور یادداشتوں میں ہندوستانی فلسفہ حیات، فنون لطیفہ، ادب ومذاہب اور رسومات کے متعلق تحریریں 'ابتدائی ہندوستانی ادب' تسلیم کی جاسکتی ہیں جو ڈینشوں نے تحریر کیا اور جو تین سو سال پہلے کے 'قلمی نسخوں' کی صورت میں معرض وجود میں آیا اور آج جدید تکنیک کے ذریعے کتابی صورت میں ڈینش دانش گاہوں اور کتب خانوں میں موجود ہے۔ ہندوستان کے شاندار ماضی سے منسلک یہ قدیم ڈینش ادبی خزانہ ہے۔

1650 سے لے کر 1855 تک 'سیرام پور' اور اس کے ماتحت علاقوں میں خدمات سرانجام دینے والے ڈینش پادریوں اور 'لسانی ماہرین' نے 'تامل اور پالی' زبانوں کی گرامر اور ان زبانوں کے مختلف الفاظ کی سکینڈے نیوین زبانوں یعنی ڈینش' سویڈش اور نارویجین کے ساتھ مماثلت اور معنی میں مطابقت کا پتا لگایا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان کی جو پہلی کتاب کسی باقاعدہ چھاپہ خانے میں طبع ہوئی وہ کتاب 'تامل ڈچ لغت' تھی اور جس چھاپہ خانے میں وہ طبع ہوئی وہ چھاپہ خانہ یہاں ڈنمارک سے تھنجور لے جایا گیا تھا۔ یہ 'تامل ڈچ لغت' جو 1801 میں شائع ہوئی اس کا اصل مسودہ آج بھی کوپن ہیگن کے شاہی کتب خانے کے ہندوستانی شعبے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد اسی چھاپہ خانہ سے 'تامل اور پالی' زبانوں میں 'انجیل مقدس' کے ترجمے شائع ہوئے اور 'مسیحیت' کے بارے میں اردو میں چھوٹے چھوٹے پمفلٹ تو کثرت سے شائع ہوتے رہے اس چھاپہ خانے کے قیام سے لے کر جب تک ڈینش گورنر' پادری اور دیگر شاہی اہلکار وہاں رہے اس چھاپہ خانے میں شائع ہونے والی کتابوں اور پمفلٹوں کے بیشتر اصلی مسودے اور طبع شدہ پمفلٹ اور کتابیں بھی کوپن ہیگن کے شاہی کتب خانے، قومی عجائب گھر اور ڈینش ایسٹ انڈیا کمپنی کی 'آرکائیوز' میں بحفاظت موجود ہیں اور کسی بھی وقت درخواست پر ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن کوئی محقق و دانشور ہے ہمارے حلقوں میں جو اِن دستاویزات کے ذریعے 'عہد رفتہ' کے شاندار ادبی و ثقافتی ورثے سے اپنے 'تعلقِ گم گشتہ' کو تلاش کر کے 'عہد حاضر' سے ملا دے؟

■

Mr. Nasar Malik & Huma Nasar
Vaerebrovej 14/1-3, DK- 2880,
Bagsvaerd, Copenhage, Denmark

عالمی اردو نامہ

سعودی عرب

ریاض میں حنیف ترین کو اعزازیہ

ریاض: معروف شاعر ڈاکٹر حنیف ترین کی تصنیف 'روئے شمیم سے نکہت عشق کی بہتی ہے' کو دہلی اردو اکادمی کی جانب سے 2013 کی بہترین ادبی تخلیق قرار دیے جانے پر سماجی تنظیم آندھرا پردیش یونائٹڈ سوسائٹی (آپس) کی جانب سے ایک شاندار تہنیتی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔

حنیف ترین کے اعزاز میں منعقدیہ محفل دو حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلا حصہ نثری نشست جس میں فرید بھٹہ اور پروفیسر اقبال اعجاز بیگ نے مضامین اور کےان واصف نے تعارفی خاکہ پیش کیا جب کہ خورشید الحسن نیر اور صدف فریدی نے منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ اس تقریب کی صدارت 'تنظیم ہم ہندوستانی' کے صدر محمد قیدر صاحب نے کی ڈاکٹر حنیف ترین مہمان خصوصی اور پروفیسر اقبال اعجاز بیگ نے بحیثیت مہمان اعزازی شرکت کی۔ صدر محفل محمد قیصر نے کہا کہ حنیف ترین کی شاعری حقیقت پسندانہ افکار لیے ہوئے ادب کی صحت مند قدروں کی پاسدار ہے۔ آخر میں محمد قیصر نے حنیف ترین کو اردو کی شمع کا ایک طاقتور محافظ قرار دیا۔ اس موقعے پر اپنے مختصر خطاب میں حنیف ترین نے کہا کہ ہندوستان میں حیدرآباد ایک ایسا شہر ہے جہاں اردو کی بقا، ترقی و ترویج کے لیے سنجیدہ کوشش کی جارہی ہے جس کے لیے اہل حیدرآباد قابل مبارکباد ہیں۔ انھوں نے آندھرا پردیش یونائیٹڈ سوسائٹی کا بھی بہترین الفاظ میں شکریہ ادا کیا جنھوں نے ان کے اعزاز میں اس پروقار محفل کا اہتمام کیا۔ حنیف ترین نے تمام مضمون نگار اور شعرا کا شکریہ ادا کیا۔ 'آپس' کی جانب سے حنیف ترین کو تنظیم کے صدر ڈاکٹر اشرف علی اور نائب صدر محمد رفیق نے یادگاری تحفہ پیش کیا جب کہ ایم اے سبحان نے حنیف ترین کو شال پیش کی۔ شکیل احمد، سید خالد کریم، آفتاب نظامی، عبدالباسط اور میر محسن علی نے گلدستے پیش کیے۔ آخر میں میر فراست علی خسرو کے ہدیہ تشکر پر محفل کا اختتام عمل میں آیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 جون 2013

کویت

آبشار غزل کی رونمائی

5 جولائی 2013 کی دوپہر بعد نماز جمعہ کویت کی معروف ادبی تنظیم ارباب فکروفن کے منفرد لہجے کے شاعر اور انجمن کے قابل قدر رکن جناب عماد بخاری کی رہائش گاہ (خیطان) پر ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ محفل کی صدارت کی ذمے داری کویت کے سینئر شاعر جناب سعید نظر کڑپوی نے انجام دی۔ شیخ طارق محمود کے ہاتھوں کتاب کی رونمائی کی تقریب عمل میں آئی۔ آخر میں مہمان خصوصی نے اپنے کلمات سے نوازا اور تمام شعرا کی کاوشوں کو سراہا اور شکریہ ادا کیا۔ صدر انجمن صفدر علی صفدر نے عماد بخاری، سونیل سونی اور لیاقت علی بٹ کے علاوہ دیگر شرکا کا بھی شکریہ ادا کیا، تمام مہمانوں نے عماد بخاری کی مخلصانہ کاوش اور مسعود حساس کے مزاحیہ قطعات کو نہایت ہی یادگار کہا۔

رپورٹ: صدر حسین صدر کویت،
innurdunews.blogspot.in

لندن

مقصود الٰہی شیخ کو بریڈفورڈ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی

مقصود شیخ اور ان کی اہلیہ فریدہ شیخ

لندن: برطانیہ میں مقیم مشہور ناول نگار، افسانہ نویس اور شاعر مقصود الٰہی شیخ کو برطانیہ میں اردو ادب کی خدمات کے عوض بریڈفورڈ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی ہے۔ ان کی شناخت پوپ کہانی کو ادبی دنیا میں متعارف کرانے کے طور پر بھی ہے۔ وہ برطانیہ سے شائع ہونے والے ضخیم ادبی رسالے مخزن کے ایڈیٹر ہیں۔ بیرون ممالک اردو کی ترویج و اشاعت میں اہم رول ادا کررہے ہیں۔ اردو کے فروغ میں انھوں نے ناقابل فراموش اور گراں قدر خدمات انجام دیں۔ برطانیہ، ناروے، امریکہ سمیت دیگر ممالک سے اردو کے اخبارات، ہفت روزہ یا رسالے نکل رہے ہیں وہاں بھی آپ فعال اور متحرک ہیں۔ انھوں نے صحافت، مضمون نگاری، افسانہ نگاری، ناول نگاری سمیت اردو کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کی ادبی خدمات کے عوض حکومت پاکستان نے انھیں باوقار ایوارڈ نشان امتیاز سے بھی نوازا ہے۔ وہ برطانیہ سے نکلنے والے ہفت روزہ راوی کے 1973 سے 1999 تک مدیر بھی رہے ہیں۔ مقصود الٰہی شیخ کی ادبی خدمات پر پاکستان کے گورنمنٹ کالج (یونیورسٹی فیصل آباد) کی طالبہ میمونہ روحی نے ایم فل کا مقالہ تحریر کیا ہے۔

رپورٹ: تعمیر نیوز ڈاٹ کام، 18 جولائی 2013

خبر نامہ

اردو زبان نے رقم کی ایک اور نئی تاریخ۔ اردو پیڈیا اور اردو ٹولس کا شاندار عوامی اجرا
کمپیوٹر ٹکنالوجی کے ذریعے ہی اردو والوں کو روزگار سے جوڑا جاسکتا ہے: کپل سبل
اردو حلقوں نے اس تاریخی قدم کا کیا زبردست خیر مقدم

نئی دھلی: 03 اگست، اردو زبان کے حوالے سے دہلی کا ذاکر حسین کالج آج ایک اور تاریخ کا گواہ بنا، کیونکہ اسی تاریخی کالج کے سلمان غنی ہاشمی آڈیٹوریم میں اردو ٹولس اور اردو پیڈیا کا اجرا مرکزی وزیر مواصلات جناب کپل سبل کے ہاتھوں ہوا۔ اس اجرا سے کمپیوٹر، انٹرنیٹ موبائل فون و دیگر ذرائع ابلاغ کے استعمال کی راہیں ہموار ہوگئی ہیں۔ اردو والے اب تک ان کی فونٹ (Key-Font) سے محروم تھے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے وزارت مواصلات کے تحت کام کرنے والے ادارے Deity، TDIL، سی ڈیک (پونے) کے توسط سے اب اردو والوں کو بھی کی فونٹ (Key-Font) اور اردو ٹولس فراہم کرا دیے ہیں، جس کی مدد سے اردو والے بہ آسانی اردو کی بورڈ کا استعمال کمپیوٹر انٹرنیٹ کی مدد سے کرسکیں گے۔ اپنی خصوصی تقریر میں مرکزی وزیر جناب کپل سبل نے اردو عوام کو اس موقعے پر نہ صرف مبارکباد پیش کی بلکہ انھیں یہ پیغام بھی دیا کہ وہ کمپیوٹر ٹکنالوجی کی بڑھتی ترقی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ کیونکہ مرکزی حکومت اردو زبان کو جدید ٹکنالوجی سے جوڑنے اور اسے فروغ دینے کے لیے کوشاں ہے۔ اردو پیڈیا اور اردو ٹولس کا اجرا دراصل اسی کوشش کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو ٹولس اور اردو پیڈیا کی ایجاد سے آکاش ٹیبلیٹ کے استعمال کی راہیں بھی اردو والوں کے لیے ہموار ہوئی ہیں۔ اس موقعے پر انھوں نے اپنی نظم 'انصاف' بھی سنائی اور کہا کہ اردو کی وکالت میں ہمیشہ کرتا رہوں گا۔

اردو ٹولس اور اردو پیڈیا کا تعارف کراتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ اب تک ہم غیر ملکی اردو ٹولس و اردو فونٹ استعمال کرتے تھے لیکن اب ہمارا ملک خود اس معاملے میں خود کفیل ہوگیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ٹولس اور اردو پیڈیا کے سلسلے میں انھیں وزارتِ مواصلات بالخصوص وزیر موصوف جناب کپل سبل کا بھرپور تعاون رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں آج قومی اردو کونسل اس تاریخی کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے۔ دیگر اداروں کے اشتراک بالخصوص سی ڈیک (پونے) ٹی ڈی آئی ایل کے تعاون کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل کو یہ کامیابی گزشتہ آٹھ ماہ کی زبردست محنت کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ جس کے نتیجے میں نسخ کے 12 فونٹ اور ایک نستعلیق کا فونٹ وجود میں آیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تین سے چار ماہ کے اندر اردو ٹولس کی تمام تر تفصیلات انٹرنیٹ پر بہ آسانی مہیا کرادی جائیں گی انھوں نے کہا کہ مذکورہ 12 فونٹ اور نستعلیق کا ایک فونٹ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہے۔

www.urdu .tdil-dc.in, www.tdil-dc.in, www.urducouncil.nic.in اس سلسلے میں کسی بھی طرح کی مدد کے لیے قومی اردو کونسل سے کسی بھی وقت رجوع کیا جاسکتا ہے۔

قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے کہا کہ اردو ہماری مشترکہ تہذیب کی امین ہے اور نئی نسل اب اردو ٹولس اور اردو پیڈیا کی مدد سے بھی اردو کی مشترکہ اقدار سے واقف ہو سکے گی۔ انھوں نے کہا کہ عہد حاضر میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ کا استعمال ناگزیر ہے اس لیے اردو والوں کو اس کے استعمال سے محروم نہیں کیا جاسکتا تھا۔

پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ دراصل اردو پیڈیا اور اردو ٹولس کا اجرا لنگویج ٹکنالوجی کے میدان میں ایک اہم قدم ہے اور اب محبان اردو کونسل کی 1200 سے زائد مطبوعات، کونسل کی اسکیموں اور اردو زبان کے عصری منظرنامے سے بھی واقفیت حاصل کرسکیں گے۔ قومی اردو کونسل اور مدارس کے رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے معروف عالم دین مولانا ولی رحمانی نے کہا کہ اردو زبان کے فروغ میں اہل مدارس کا اہم ترین کردار رہا ہے۔ قومی اردو کونسل کے اس قدم سے مدارس کے طلبہ و طالبات کو بڑا فائدہ حاصل ہوگا۔

اس موقعے پر 'راشٹریہ سہارا اردو' کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی، روز نامہ 'انقلاب' کے مدیر جناب شکیل حسن شمسی، ذاکر حسین کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسلم پرویز نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس تاریخی کامیابی کے لیے کونسل کو مبارکبادی پیش کی۔ علاوہ ازیں بڑی تعداد میں محبان اردو بالخصوص اردو اداروں کی سرکردہ شخصیات، طلبہ، ریسرچ اسکالرس، اساتذہ، سی ڈیک (پونے)، ٹی ڈی آئی ایل و دیگر متعلقہ اداروں کے نمائندگان، عہدیداران نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس پروقار تقریب کی نظامت کے فرائض معروف صحافی جناب تحسین منور نے انجام دی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 3 اگست 2013

وزیر مواصلات جناب کپل سبل، قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی، ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر اختر الواسع اور دیگر رفقا

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد 4 ستمبر سے

اردو زبان کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر فروغ دیے جانے پر کیا جائے گا غور وخوض: پروفیسر وسیم بریلوی اور ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کا مشترکہ بیان

نئی دہلی: 20 اگست، اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی اور فروغ اردو مشن کے لیے کام کرنے والے مرکزی حکومت کے سب سے بڑے ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے 4 ستمبر تا 6 ستمبر 2013 کو دہلی میں سہ روزہ عالمی کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ لیا ہے، جس میں ملک و بیرون ملک کے نامور ادبا، شعرا، قلم کار، مصنّفین و نمائندہ اردو شخصیات شرکت کررہی ہیں۔ کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی اور ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کے مطابق اس سہ روزہ عظیم الشان عالمی اردو کانفرنس کا افتتاح مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب پلم راجو کے ہاتھوں ہوگا۔ وزیر موصوف کے علاوہ مرکزی وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل جناب جتن پرساد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایس کے سپرو، ساہتیہ اکادمی کے سابق صدر وممتاز اردو ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ اور معروف اردو ادیب سید محمد اشرف کے علاوہ بڑی تعداد میں محبان اردو اِس افتتاحی اجلاس میں شرکت کریں گے۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین افتتاحی اجلاس کو کونسل کے اغراض و مقاصد سے متعارف کرائیں گے۔ استقبالیہ خطبہ کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی پیش کریں گے۔ اپنے مشترکہ بیان میں کونسل کے دونوں ذمے داران نے کہا کہ اس سہ روزہ کانفرنس کے مختلف اجلاس ہوں گے جس میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کیا جائے گا اور ماہرین مقالات پیش کریں گے۔ انھوں نے کانفرنس کی غرض و غایت بتاتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل فروغ اردو مشن کے تحت متعدد اسکیموں کے علاوہ اردو زبان کے مسائل اور اس کی اہمیت اور ترقی کے موضوع پر ملک کے مختلف علاقوں میں سیمینار و سمپوزیم وغیرہ کا بھی انعقاد کرتی آئی ہے اور اب کونسل عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد اس لیے کررہی ہے تاکہ قومی اور بین الاقوامی تناظر میں اردو زبان کے فروغ کے امکانات کو تلاش کیا جا سکے اور اس کی ہمہ جہت ترقی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جا سکے۔ انھوں نے کہا اردو خالصتاً آریائی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی رابطے کی بھی زبان ہے اور آج یہ زبان امریکہ، کناڈا، برطانیہ، روس، مصر، ترکی، ایران، ماریشس جیسے ممالک میں بھی مقبول ہوتی جارہی ہے۔ اردو کی نئی بستیوں سے اردو زبان و ادب کو ایک نئی جہت ملی ہے۔ اِس عالمی کانفرنس کا انعقاد اسی پس منظر میں ہے۔

سہ روزہ عالمی کانفرنس کی تفصیلات بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ 4 ستمبر کو افتتاحی اجلاس کے بعد 5 ستمبر کے پہلے سیشن میں 'اردو کے فروغ میں سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کے کردار' کے موضوع پر اردو اداروں سے جڑی سرکردہ شخصیات مقالات پیش کریں گی۔ اس سیشن کی مجلس صدارت کے اراکین میں پروفیسر وسیم بریلوی، سابق مرکزی وزیر محمد علی اشرف فاطمی، جسٹس راجندر سچر، مولانا ولی رحمانی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد میاں اور انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی کے نام شامل ہیں۔ 5 ستمبر کو دوسرے سیشن کا موضوع 'اردو کا عالمی تناظر تہذیب و ادب کے حوالے سے' ہے۔ جس میں امریکہ، روس، مصر، ترکی، ایران، پاکستان اور ماریشس کے ادبا اپنے مقالات پیش کریں گے۔ ممتاز اردو ادیب پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، سید تقی عابدی، اور پروفیسر عبدالحق اس دوسرے سیشن کی صدارت فرمائیں گے۔ 5 ستمبر کی شام ساڑھے پانچ بجے بین الاقوامی مشاعرے کا انعقاد کیا جارہا ہے جس میں پروفیسر وسیم بریلوی، راحت اندوری، نواز دیوبندی، منصور عثمانی، فرحت شہزاد (امریکہ)، عباس تابش (پاکستان)، ڈاکٹر عبداللہ (امریکہ)، ڈاکٹر زبیر (دبئی)، عمر سلیم العدروس (جدہ) عزیز نبیل (دوحہ قطر)، محمد جلیل احمد (دوحہ قطر)، اشفاق حسین زیدی (کناڈا)، نکہت نسیم (آسٹریلیا)، عطا الحق قاسمی (پاکستان) کے علاوہ ملک کے نامور شعرا شرکت کررہے ہیں۔

اسی طرح 6 ستمبر کو 'اردو کے فروغ میں فلم اور میڈیا کے کردار' کے موضوع پر پہلے سیشن کا انعقاد ہوگا جس میں بی بی سی لندن کے رضا علی فاطمی، دور درشن کے ڈائرکٹر جنرل (نیوز) ایس ایم خان، فلم ساز مظفر علی، زاہد علی خان اور کامنا پرساد شرکت کریں گی۔ اس اجلاس میں فلم اور صحافت سے جڑی ملک و بیرونِ ملک کی نامور شخصیات اپنے مقالات پیش کریں گی۔ دوسرے سیشن کا موضوع 'انسان دوستی کے فروغ میں اردو کا کردار' ہے۔ جس کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر عتیق اللہ اور وبھوتی نرائن کریں گے۔ اردو کے نامور قلم کار و ادیب اس اجلاس میں اپنے قیمتی مقالات پڑھیں گے۔ 6 ستمبر کا آخری اجلاس سفارشات وتجاویز پر مبنی ہوگا۔ اجلاس کے دوران جو سفارشات اور تجاویز آئیں گی کونسل انھیں عملی شکل دینے کا اعلان کرے گی۔ 5 اور 6 ستمبر کے تمام اجلاس و مشاعرہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے کنونشن سینٹر میں منعقد ہوں گے۔ کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی اور ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے ملک کے تمام محبان اردو سے اس عالمی کانفرنس میں شرکت کرکے کامیاب بنانے کی پرزور اپیل کی ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ اردو کا ہر خاص و عام اس عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کرکے فروغ اردو مشن کو مزید آگے بڑھانے میں کونسل کی معاونت کرے گا۔

اردوٹولز اور اردو کی فونٹس سی ڈی کی مفت تقسیم بہت جلد۔ اس کی ترقی کا انحصار صارفین پر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دهلی: 19 اگست، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے وزارت مواصلات کے تحت کام کرنے والے ادارے Deity ، TDIL، سی ڈیک (پونے) کے اشتراک سے اردو والوں کو اردو کی فونٹ (Key-Font) اور اردوٹولس فراہم کرا دیے ہیں، قومی اردو کونسل کے اس تاریخ ساز کارنامے کی ستائش چوطرفہ ہو رہی ہے۔ محبان اردو کی اس حوصلہ افزائی اور بڑھتی مقبولیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اردو عوام کو یہ خوش خبری دی ہے کہ بہت جلد اردوٹولس اور اردو کی فونٹ (Key-Font) سافٹ ویئر کی سی ڈی مفت تقسیم کی جائیں گی تاکہ محبان اردو، اردو زبان پر موبائل فون، لیپ ٹاپ، کمپیوٹر انٹرنیٹ اور ونڈو فون پر اردو فونٹس کا استعمال باآسانی کر سکیں۔

انھوں نے کہا کہ 4 ستمبر سے سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کونسل کے زیراہتمام دہلی میں کیا جا رہا ہے، جس میں نہ صرف ملک و بیرون ملک کے اردو ادیب، شاعر اور اردو کی نمائندہ شخصیات بڑی تعداد میں شرکت کریں گی، بلکہ بڑی تعداد میں اردو عوام الناس کی بھی شرکت متوقع ہے۔ انھوں نے کہا کہ محبان اردو کی خواہش کے پیش نظر کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی کی موجودگی میں یہ فیصلہ لیا گیا کہ عالمی اردو کانفرنس کے دوران اردوٹولس اور اردو فونٹ کی سی ڈی اردو عوام تک مفت تقسیم کی جائے، علاوہ ازیں اردو نسخ کے 12 فونٹ اور ایک نستعلیق کا فونٹ منظر عام پر آ چکے ہیں اور اب ان تمام فونٹس کی سی ڈی مفت فراہم کرا دی جائے گی۔ کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی اور کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اردو عوام سے یہ اپیل بھی کی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اردوٹولس کا استعمال کریں اور اگر اس سلسلے میں انھیں کوئی دشواری پیش آئے تو وہ کونسل سے رابطہ بذریعہ ٹیلی فون، فیکس اور اس ای۔میل پتے پر E-mail. director@ncpul.in پر کر سکتے ہیں۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 19 اگست 2013

قومی اردو کونسل پر حکومت کی خصوصی توجہ ہے: جتن پرساد
قومی اردو کونسل کے رسالے 'بچوں کی دنیا' کا اجرا

نئی دهلی: 01 اگست۔ قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کا ایسا ادارہ ہے جو اردو کی ترقی کے لیے اپنے قیام کے بعد سے مسلسل کوششیں کرتا رہا ہے۔ کونسل نے مختلف علوم وفنون پر تقریباً 1500 کتابیں شائع کی ہیں جن میں بچوں سے متعلق 300 سے زیادہ کتابیں بھی ہیں۔ قومی اردو کونسل پر حکومت خاص توجہ دیتی رہی ہے۔ ٹکنالوجی کی ترقی سے ایسا نہیں کہ کتابوں کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اردو زبان کا جنگ آزادی میں بڑا رول رہا ہے اور آج بھی یہ شیریں زبان زندہ متحرک ہے، یہ زبان تفریح کے تمام ذرائع میں استعمال ہوتی ہے۔ فلموں اور نغموں میں اس کے بغیر کام ہی نہیں چل سکتا۔ یہ زبان کسی ایک مذہب کی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی زبان ہے۔ اردو میں بچوں کے اچھے رسالے بھی کم ہو گئے ہیں۔ اس کمی کو دیکھتے ہوئے کونسل نے بچوں کا رسالہ شروع کیا ہے۔ 'بچوں کی دنیا' میں بہت اچھی اچھی تصویریں چھپی ہیں۔ اس میں سائنس، مذہب اور جنرل نالج کی باتیں بھی ہیں۔ یہ باتیں وزیر مملکت برائے ترقی انسانی وسائل جناب جتن پرساد نے شاستری بھون میں اپنے دفتر میں 'بچوں کی دنیا' کے پہلے اور دوسرے شمارے کا اجرا کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ

وزیر مملکت جتن پرساد، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین، ڈاکٹر کلیم اللہ، اسسٹنٹ ڈائرکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) کمل سنگھ، اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحئی، اعزازی مدیر نصرت ظہیر اور ریسرچ اسسٹنٹ قاسم انصاری

اردو کا فروغ تب ہی ہوگا جب بچے اور نئی نسل اردو زبان وادب سے قریب ہوں گے اور اردو پڑھیں گے۔ مجھے قومی اردو کونسل، اس کے سربراہ اور اس کے کارکنان پر مکمل بھروسہ ہے کہ یہ نیا رسالہ بچوں کے ادب میں سنگ میل ثابت ہوگا۔

اس موقع پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے رسالے کی غرض وغایت بیان کی اور کہا کہ 'بچوں کی دنیا' ایک ایسا رسالہ ہے جس میں نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ بڑوں کے لیے بھی دلچسپیوں کا سامان ہوگا۔ یہ رسالہ بچوں کے ابھی تک نکل رہے دیگر رسالوں سے بالکل مختلف ہے اور تمام تر رنگین کاغذ پر دلکش چھپائی کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں مزے مزے کی کہانیاں، دماغی ورزشیں، معلوماتی مضامین ہیں جنھیں پڑھ کر بچے کافی لطف اندوز ہوں گے۔ ہماری درخواست ہے کہ اساتذہ کرام اور والدین اپنے بچوں کے لیے اس رسالے کو خریدیں اور انھیں پڑھنے کی ترغیب دیں تاکہ ہماری نئی نسل اردو زبان وادب سے بہرہ ور ہو سکے۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (ایڈمن) جناب کمل سنگھ، ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحئی، اعزازی مدیر نصرت ظہیر، ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر قاسم انصاری، منیر انجم اور نیلم رانی وغیرہ نے شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 01 اگست 2013

ہندوستانی زبانوں کا ادب اور قومی اردو کونسل

ہندوستان کی علاقائی زبانوں اوران کے ادب سے اردو زبان کا بڑا گہرا تعلق ہے جس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ایک ذولسانی (bilengual) پینل تشکیل دیا ہے جو ہندی اور ہندوستانی آئین کے آٹھویں شیڈول میں شامل تمام علاقائی زبانوں کے ادب کو اردو میں اور اردو کے ادب کو اِن زبانوں میں منتقل کرنے کی خدمت انجام دے گا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ علاقائی زبانوں کے بہت سے الفاظ کو ہماری یہ زبانیں قبول کرتی ہیں اوران سے متاثر بھی ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں اردو نے علاقائی زبانوں کے الفاظ بالخصوص ہندی کے الفاظ اور محاوروں کو قبول کرنے میں ہمیشہ فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے اردو کبھی انتہا پسندی کا شکار نہیں رہی۔ اسی طرح ہندی نے بھی اردو کے بہت سے لفظوں اور محاوروں کو من وعن قبول کیا ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ ہماری دوسری علاقائی زبانوں میں تہذیبی اور ثقافتی یکسانیت بہت ہے اسی کے باعث لفظوں کے لین دین کی اس روایت کو فروغ مل رہا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہر علاقائی زبان میں اچھا ادب تیار ہو رہا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس اعلیٰ تخلیقی ادب کا تبادلہ ایک سے دوسری زبان میں ہو اس سے دونوں زبانیں متمول ہوں گی اور ایک دوسرے کے قریب آئیں گی۔ اردو شاعری کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ہندی کے ادیبوں اور پبلشروں نے میر سے لے کر تا حال بہت سے شعرا کا کلام من وعن دیوناگری رسم الخط میں شائع کیا ہے ساتھ ہی پڑوسی ملک پاکستان کے اردو شاعروں مثلاً فیض احمد فیض، پروین شاکر، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی اور دوسرے اہم شعرا کو بھی آج ہندی رسم الخط میں من وعن پڑھا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس ابھی تک ہندی کا اعلیٰ تخلیقی ادب بالخصوص ہندی شاعری کو اردو رسم الخط میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے اردو والوں کو یہ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ ہندی زبان میں کس طرح کی اور کیسی شاعری ہو رہی ہے۔

قومی اردو کونسل نے اس ضمن میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ سب سے پہلے ہندی زبان کے ادب کو اردو میں منتقل کرے کیوں کہ ہندی، اردو سے صوتی اور نحوی دونوں اعتبار سے بہت قریب ہے، ہندی کے بعد بھارتی آئین میں منظور شدہ دوسری علاقائی زبانوں کے ادب کو بھی اردو زبان سے متعارف کرایا جائے گا۔

اگر چہ زبان وادب سے تعلق رکھنے والے دوسرے کئی اداروں نے مختلف زبانوں کے ادب کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کا کام اپنی استطاعت کے مطابق تھوڑا بہت کیا ہے۔ لیکن اردو کے تعلق سے یہ میدان ابھی تک خالی پڑا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قومی اردو کونسل اپنے بہتر وسائل اور وسیع اشاعتی تجربے کو بروئے کار لا کر اردو کے ادب کو ہندی اور علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ ان زبانوں کی بہتر تخلیقات سے اردو والوں کو آشنا کرائے گی تو اِس سے ملک میں زبان اور ادب کی سطح پر میل جول اور اشتراک کا ایک صحت مند ماحول پیدا ہو سکے گا۔

(پروفیسر) وسیم بریلوی
وائس چیئرمین، قومی اردو کونسل

اقلیتی اداروں میں اردو کی صورت حال پر 'اردو دنیا' کا خصوصی شمارہ

قومی اردو کونسل نے اپنے مقبول اور کثیر الاشاعت ماہانہ رسالے 'اردو دنیا' میں کور اسٹوریز اور خصوصی شماروں کے ذریعے قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں اردو زبان وادب کے مکمل منظرنامے کی تصویر کشی کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس کے تحت کونسل نے اس مرتبہ ملک کے اقلیتی تعلیمی اداروں میں اردو زبان وادب کی تعلیم وتدریس اور اس کے فروغ کے سلسلے میں ہونے والی سرگرمیوں اور اس سلسلے میں درپیش مسائل کا جائزہ لینے اور اس سلسلے میں مختلف شعبہ ہائے زندگی اردو دانش وروں کی آرا اور تاثرات پیش کرنے کے لیے 'اردو دنیا' کے ایک خصوصی شمارے کی اشاعت کا فیصلہ کیا ہے۔ ملک کے اطراف و جوانب میں سرگرم سبھی اقلیتی ادروں کے سربراہان و منتظمین سے درخواست ہے کہ وہ اپنے ادارے کی تاریخ، سرگرمیوں اور ادارے کی اردو خدمات کا مختصر احوال، تصاویر کے ساتھ 'اردو دنیا' کے ای میل آئی ڈی urduduniyancpul@yahoo.co.in یا editor@ncpul.in پر زیادہ سے زیادہ 31 جولائی 2013 تک ارسال فرمادیں۔ مضمون اور تصاویر قومی اردو کونسل کے پتے پر بھی ارسال کر سکتے ہیں۔

پتہ ہے: شعبۂ ادارت، قومی اردو کونسل، فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9 انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025

(منجانب: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام، ڈائریکٹر قومی اردو کونسل و ایڈیٹر، ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی)

گزارش

مضمون نگاروں سے گزارش ہے کہ اپنی نگارشات کے ساتھ ایک عدد پاسپورٹ سائز کی تصویر ضرور ارسال کریں۔ مضمون کے ساتھ تحریری طور پر یہ تصدیق کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ مضمون غیرمطبوعہ ہے اور کسی بھی رسالے اخبار یا کتاب میں شایع نہیں ہوا ہے۔ مضمون تحریر کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھا جائے کہ نئے موضوعات اور جدید تقاضوں پر لکھے گئے مضامین کو اشاعت میں ترجیح دی جائے گی۔ (ادارہ)

موبائل وین پروگرام کا21واں مرحلہ
(تمل ناڈو، کیرالہ، کرناٹک، گوا اور مہاراشٹر)

1	25 تا26 اگست 2013	میل وشارم	2	27 تا28 اگست 2013	ویلور
3	29 اگست 2013	گڈیاٹم	4	30 اگست 2013	عمرآباد
5	31 اگست 2013	امبر	6	1 ستمبر 2013	ونیام باڑی
7	2 ستمبر 2013	کرشن گیری			
8	4 ستمبر 2013	کوئمبٹور	9	6 تا 9 ستمبر 2013	کیرالہ (کالی کٹ)
10	11 تا13 ستمبر 2013	میسور	11	16 تا17 ستمبر 2013	پنجی (گوا)
12	19 ستمبر 2013	رائے گڑھ (مہاراشٹر)	13	20 تا21 ستمبر 2013	رتنا گیری
14	22 تا23 ستمبر 2013	چپلین	15	24 تا25 ستمبر 2013	کھیڈ
16	26 تا27 ستمبر 2013	ڈپولی	17	28 تا29 ستمبر 2013	مرد
18	30 ستمبر 2013	ماہد	19	3 تا5 اکتوبر 2013	پونے

قومی اردو کونسل کی کتاب گاڑی چینئی میں

چینئی میں جب قومی اردو کونسل کی کتاب گاڑی پہنچی تو اس کا والہانہ استقبال کیا گیا اور شہر کی معروف شخصیات نے کتابوں کی خرید میں کافی دلچسپی دکھائی۔ نیو کالج رویا پیٹا کے شعبہ اردو اور ای سنٹر کے تعاون سے کالج کے احاطے میں 9 جولائی کو قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی کتابوں کی چلتی پھرتی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے معتمد نیو کالج الحاج جناب اے محمد اشرف نے کہا کہ قومی اردو کونسل کی یہ منفرد پیش کش یقیناً موجودہ دور میں کتابوں سے قریب کرنے کی کامیاب کوشش ہے قومی اردو کونسل کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ کتابیں ہمارا سب سے بڑا اثاثہ ہیں اور ہمیں زیادہ سے زیادہ کتابوں سے دوستی کرنی چاہیے۔ صدر شعبہ اردو اور ای سنٹر کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر محمد عبید الرحمٰن، ڈاکٹر ایس مظفر الدین، پرنسپل ڈاکٹر عبدالمالک بھی اس موقعے پر موجود تھے۔ نمائش میں کالج کے طلبا نے بڑی تعداد میں کتابیں خریدیں اور قومی اردو کونسل کے اس اقدام کی ستائش کی۔ کونسل کے ذمے دار شہنواز خرم کا اس نمائش کے حوالے سے کہنا تھا کہ چینئی کا موبائل وین کا ٹور بے حد کامیاب رہا اور جنوبی ہندوستان کے لوگوں نے جس طرح اس نمائش کا استقبال کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ اردو کی ترویج وترقی کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے ہیں اور اردو کے مستقبل سے قطعی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتابوں کی اس نمائش کو نہ صرف اردو خبارات میں بلکہ انگریزی کے اہم اخبارات مثلاً دکن کرانیکل، دی ہندو وغیرہ میں بھی نمایاں خبروں کے کالم میں جگہ دی گئی۔ (پریس نوٹ، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 10 جولائی)

(2)

شعبۂ اردو جے بی اے ایس کالج فار ویمن، چنئی نے 10 جولائی 2013 کو شعبہ عربی، فارسی و اردو، مدراس یونی ورسٹی کے اشتراک سے کتابوں کی نمائش 'رواں پہیوں پر، کا اہتمام جے بی اے ایس کالج فار ویمن کے احاطہ میں کیا تھا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت انسانی وسائل وترقیات، حکومتِ ہند، نئی دہلی کی جانب سے روانہ کردہ کتابوں کی یہ وسیع وکشادہ وین ملک بھر کا چکر کاٹتے ہوئے شہر چنئی میں خواتین کے اس عظیم کالج میں ایک دن مقیم رہی۔ کتابوں کی وین کا مقصد اردو بولنے والے طبقے میں مطالعے کا شعور بیدار کرنا اور ان کی ضروریات خود ان کے دروازے تک پہنچانا ہے۔ پدم بھوشن جناب موسیٰ رضا، چیرمین ایس آئی ای ٹرسٹ نے کتابوں کی وین کا افتتاح کیا۔ آپ نے خود پندرہ ہزار کی کتابیں خریدیں اور گیارہ ہزار کی کتابیں شعبہ اردو کے لیے مختص کی گئیں۔ طالبات اور دیگر اساتذہ نے بھی کافی کتابیں خریدیں۔ افتتاح کے موقع پر کالج پرنسپل کے علاوہ ڈاکٹر سید سجاد حسین، صدر شعبۂ اردو، ڈاکٹر ذاکرہ ام شہلا، صدر شعبہ اردو، جے بی ایس کالج (صباحی)، ڈاکٹر قاضی حبیب احمد، شعبۂ اردو مدراس یونی ورسٹی، ڈاکٹر بشیرہ سلطانہ، صدر شعبہ اردو، جے بی اے ایس کالج (مسائی)، ڈاکٹر امان اللہ، شعبہ اردو، مدراس یونی ورسٹی، نکہت سلطانہ، استاذ شعبہ اردو کے علاوہ دیگر اساتذہ و طالبات موجود تھے۔ پریس ریلیز، ڈاکٹر امان اللہ، ایم بی، شعبہ عربک اینڈ پرشین، مدراس یونیورسٹی، چینئی، 25 جولائی 2013

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی ہمہ گیر شخصیت

انجمن اسلام نہرو آرٹس، سائنس کامرس، بی بی اے، بی سی اے کالج اور پی جی سینٹر کے شعبۂ اردو وایک روزہ قومی کانفرنس قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے بہ عنوان 'امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی ہمہ گیر شخصیت' 29 جون 2013 کو منعقد کیا گیا جس میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر امجد حسین حافظ کرناٹکی، سابق چیئرمین کرناٹک اردو اکادمی نے شمع روشن کرکے اس کا افتتاح کیا اور صدر انجمنِ اسلام ہبلی الحاج جبار خاں ہوخلی نے صدارتی خطبہ دیا۔ کل 23 مقالے اس ایک روزہ قومی کانفرنس میں پڑھے گئے۔ بذریعہ ڈاک، ڈاکٹر ایس نسیم بانو، ہبلی کرناٹک، 2 جولائی 2013

اردو کے مسائل وامکانات پر سیمینار

اٹوا/سدھارتھ نگر: مقدس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، کرہی، سدھارتھ نگر کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سیمینار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے بہ عنوان 'آزاد ہندوستان میں اردو: مسائل اور امکانات' کے موضوع پر 11 اور 12 اگست کو جامعہ اتحاد ملت، اٹوا، سدھارتھ نگر میں منعقد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس میں مہمانوں کا خیر مقدم مولانا محمد عثمان نے کیا۔ انھوں نے اردو کے تابناک ماضی اور موجودہ دور میں اس کے ساتھ ہورہے سوتیلے برتاؤ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اردو کو عام کرنے کی ضرورت ہے اور ہمارے مدارس اس کے لیے نہایت ہی موثر قدم اٹھا رہے ہیں۔ سیمینار کا افتتاح ڈاکٹر محمد عیسیٰ، پرنسپل، الفاروق انٹر کالج، اٹوا بازار نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے فروغ میں بے شمار لوگوں نے حصہ لیا لیکن اسی مردم خیز علاقہ کے قاضی محمد عدیل عباسی نے اردو کے فروغ اور بقا کے لیے نہ صرف انتھک کوشش کی بلکہ ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر مشکل ہے۔ انھوں نے دینی تعلیمی کونسل کے ذریعے گاؤں گاؤں میں مدارس و مکاتب کا جال بچھا دیا اور ان مدارس ومکاتب نے پورے اتر پردیش میں اردو کی ترویج واشاعت کا بے مثال کارنامہ انجام دیا۔

صدارت عبدالصبور ندوی، ایڈیٹر، ترجمان السنہ، رچھا بریلی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ آج جہاں جہاں اردو پہلے سے کم پڑھی جارہی ہے اس میں انگریزی یا کسی اور زبان کا دخل نہیں بلکہ والدین کی عدم دلچسپی ہے۔ افتتاحی اجلاس کے آخر میں صغیر احمد، ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو مواد کی فراہمی جس حد تک انٹرنیٹ پر ہونی چاہیے، اس لحاظ سے نہیں ہے۔ سائنس کی کتابیں اردو میں آن لائن موجود نہیں ہیں اور آن لائن اردو ڈکشنری بھی نہ کے برابر ہے۔ اس ضمن میں اردو ادارے خاص طور سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ جمال احمد نے اردو کے متعلق ایک نظم پیش کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اگست 2013

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

قومی اردو کونسل کے 'اردو کی بورڈ' کا پرزور استقبال

فیروز آباد: کامنی اُردو مرکز، فیروز آباد نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اُس تاریخی قدم کا خیر مقدم کیا ہے، جس میں اُس نے اردو کی ترقی میں سنگ میل کا کام کرتے ہوئے نئے اردو فونٹ اور کی بورڈ مینیجر ایجاد کیے ہیں، اس سلسلے میں مرکز کی ایک نشست الہدیٰ ماڈل اسکول پر منعقد کی گئی، جس میں حاضرین کو اس نئی ایجاد اور اس کے استعمال کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا۔ مرکز کے صدر میاں بصارالدین نے اس تاریخی قدم کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ خطاطی میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اب سے کچھ سال پہلے تک اردو صرف کیل کی لکھائی جیسے فونٹ میں ہی کمپیوٹر پر دستیاب تھی، لیکن گزشتہ کچھ سالوں میں اس شعبے میں خاصی ترقی دیکھنے کو ملی اور اب ایک اچھی خاصی تعداد میں نئے نئے فونٹ مارکیٹ میں نظر آنے لگے ہیں، لیکن ہندوستان میں اس شعبے میں ممبئی کے سید منظر صاحب کا ہی کچھ کام رہا، جو ایک سافٹ میڈیا نام کی کمپنی چلاتے ہیں، باقی اردو خطاطی کے شعبے میں تمام کام پاکستان سے ہی دیکھنے کو ملا تھا، اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ہندوستان میں اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک بڑا کام کیا ہے اور اس کے خاطر خواہ نتائج بھی سامنے آرہے ہیں خاص طور پر اردو کی بورڈ مینیجر اس کی واقعی بیش بہا کامیابی ہے۔ اس کام کے لیے کامنی اردو مرکز قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو اور خاص طور پر اس کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین اور ڈاکٹر وسیم بریلوی کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔ شاذیہ کفیل نے اس موقعے پر بتایا ہے کہ کونسل کا یہ قدم اس لیے اور بھی زیادہ تعریف کا مستحق ہے، کیوں کہ اس نے اس کو بغیر کسی اجرت کے عوام کو مہیا کرایا ہے، دنیا کے کسی کونے میں بھی جو لوگ اس کی بورڈ یا فونٹ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ کبھی بھی کونسل کی ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔ اس کو انسٹال کرنا بے حد آسان ہے اس کے لیے آپ سب سے پہلے ونڈو ایکس پی کی سی ڈی لگائیں، اگر آپ کے کمپیوٹر میں ونڈو ایکس پی کا بیک اَپ موجود ہے تو سی ڈی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے اسٹارٹ بٹن سے کنٹرول پینل میں جائیں اور ریجنل اور لینگویج آپشن پر کلک کریں۔ لینگویج ٹیب کا انتخاب کریں اور پھر انسٹال فائلس فار کامپلکس اسکرپٹ اینڈ رائٹ ٹو لیفٹ لینگویجز پر ٹک کا نشان لگادیں، پھر اپلائی بٹن پر کلک کریں، اس کے بعد ایڈ بٹن پر کلک کریں، پھر ان پُٹ لینگویج پر کلک کر کے اردو کو منتخب کرلیں۔ اس کے بعد آپ باہر آجائیں، اور کی بورڈ لے آؤٹ پر کلک کر کے فونیٹک کو منتخب کرلیں اور او کے بٹن پر کلک کر کے باہر آجائیں، اس کے بعد اپنے کمپیوٹر کو دوبارہ اسٹارٹ کرلیں اب آپ کے ڈیسک ٹاپ پر لینگویج آپشن آچکا ہوگا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 جولائی 2013

یو این آئی اردو ویب سائٹ کی رونمائی

نئی دھلی: خبر رساں ایجنسی یو این آئی کی اردو ویب سائٹ کی یہاں مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات منیش تیواری، اقلیتی امور کے وزیر کے رحمان خان، مرکزی وزیر نقل وحمل آسکر فرنانڈیز اور مرکزی وزیر عمل داری شری کانت جینا کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے اہم نمائندوں کی موجودگی میں رونمائی عمل میں آئی۔ مسٹر منیش تیواری نے اسے ایک مبارک آغاز قرار دیتے ہوئے کہا کہ صحافت کے محاذ پر اس انقلابی قدم سے اردو دنیا کو فیض یاب کرنے کی یہ کوشش اردو زبان کے فروغ کو بھی مہمیز لگائے گی جو محض ایک زبان نہیں بلکہ تہذیب ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر قومی اردو کونسل کی خدمات کی بھی ستائش کی اور کہا کہ آئی آئی ایم سی کے اردو جرنلزم کورس سے بھی وہ بے حد پر امید ہیں۔ کے رحمان نے کہا کہ اردو ویب سائٹ لانچ کرنے کی یو این آئی کی اس کوشش کی ہر حلقے سے عملاً تائید ہونی چاہیے۔ کیونکہ اردو

یو این آئی اردو ویب سائٹ کی لانچنگ کے دوران تقریر کرتے ہوئے مرکزی وزیر منیش تیواری اس موقعے پر مرکزی وزیر کے رحمٰن خان، کمال فاروقی ودیگر

اخبارات کے قدم مضبوط کرنے اور انھیں دوسری زبانوں کے اخبارات کے ہم پلہ بنانے میں اس ایجنسی کی اردو سروس کا اہم رول ہے۔ مسٹر خان نے کہا کہ چونکہ وہ خود اخبار نکال چکے ہیں اس لیے انھیں اس پیشے کی دشواریوں کا علم ہے اور وہ چاہیں گے کہ قومی اردو کونسل کی طرف سے اردو کے فروغ کا دائرہ اس اردو ویب سائٹ تک وسیع کیا جائے اور حکومت کو چاہیے کہ وہ یو این آئی کی اس کوشش کو کامیاب بنانے میں تعاون کرے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 اگست 2013

زبانوں سے متعلق از سر نو سروے کی ضرورت: نائب صدر جمہوریہ

نئی دھلی: نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری نے کہا ہے کہ ملک میں ایک بار پھر سے زبانوں سے متعلق سروے کرائے جانے کی ضرورت ہے۔ دہلی اقلیتی کمیشن کے وفد نے ان سے دہلی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ رکھنے والی اردو اور پنجابی زبان کے تحفظ کے لیے دہلی یونیورسٹی میں ماضی کی طرح ہی رعایت دلانے کی درخواست

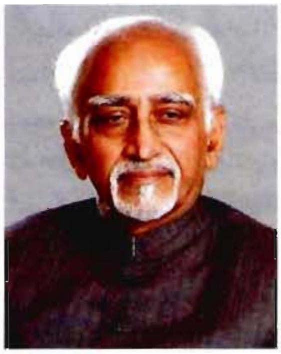

کی۔ وفد کے اراکین نے نائب صدر جمہوریہ کو دہلی یونیورسٹی میں شروع کیے گئے نئے چار سالہ کورس کے سبب ہندوستانی زبانوں کے لیے پیدا ہوئے خطرے سے روشناس کرایا۔ وفد نے حامد انصاری کو بتایا کہ اردو اور پنجابی پڑھنے، لکھنے اور بولنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ وفد نے حامد انصاری سے درخواست کی کہ ان دونوں زبانوں کے طلبا کو دہلی یونیورسٹی میں جو رعایت اب سے پہلے ملتی رہی ہے اس رعایت کو برقرار رکھنے کی ہدایات جاری کی جانی چاہیے اور ہر کالج کو ڈی سی- 1 لینے کا پورا اختیار ہونا چاہیے۔ وفد کے اراکین نے مطالبہ کیا کہ اس تعلق سے دہلی یونیورسٹی نے جو نئی شرائط عائد کردی ہیں ان میں نرمی برتی جانی چاہیے اور جس طرح 'اے بی سی' اسٹریم کے تحت کورس چلائے جارہے تھے ویسے ہی جاری رہیں تو طلبا کے لیے زیادہ بہتر رہے گا۔ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر ایچ خان نے اس موقعے پر نائب صدر جمہوریہ کو کمیشن کے ذریعے کرائے گئے مدارس کے سروے کی تفصیلات سے بھی آگاہ کرایا۔ وفد نے نائب صدر کو دہلی میں عیسائی اور مسلمانوں کے لیے قبرستانوں کی کمی کے مسئلے سے بھی واقف کیا۔ محمد حامد انصاری نے وفد کی باتوں کو غور سے سنا اور وفد کی پیش کردہ تجاویز پر سنجیدگی سے غور کرنے کی یقین دہانی بھی کرائی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 جولائی 2013

دہلی :

اردو میں تربیت یافتہ صحافیوں کی شدید کمی

نئی دہلی: ہندوستان کے ممتاز تعلیمی ادارے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن (آئی آئی ایم سی) میں اردو صحافیوں کے لیے تربیتی کورس کے نصاب پر غور کرنے کے لیے بلائی گئی میٹنگ میں ایک مربوط تربیتی صحافتی کورس کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ ماہرین کی رائے تھی کہ اچھے اور تربیت یافتہ صحافیوں کی شدید قلت ہے۔ اس میدان میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے پوسٹ گریجویٹ طویل مدتی یا قلیل مدتی کورس کی ضرورت ہے۔ روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر شکیل حسن شمسی نے کہا کہ فوری طور پر تربیتی کورس کی ضرورت ہے وہ چاہے طویل مدتی ہو یا قلیل مدتی۔ انھوں نے کہا کہ ٹیلی ویژن اور پرنٹ دونوں میں تربیت یافتہ لوگوں کی ضرورت ہے۔ گروپ ہیڈ سہارا اردو پبلی کیشنز اور عالمی سہارا چینل سید فیصل علی نے کہا کہ جب سے کارپوریٹ گھرانے اردو صحافتی میدان میں آئے ہیں اردو میں بے پناہ مواقع پیدا ہوگئے ہیں۔ اس میدان میں ڈیمانڈ زیادہ اور سپلائی کم ہے۔ اس صحافتی کورس کے نصاب کو ترتیب دیتے وقت جرنلزم کے عملی پہلوؤں کی تربیت پر توجہ دینی چاہیے۔ آئی آئی ایم سی کا اردو تربیتی صحافتی کورس شروع کرنے کا یہ قدم قابل قدر ہے لیکن کورس اتنا چھوٹا نہیں ہو کہ اس کی اہمیت ہی فوت ہوجائے۔ سید فیصل علی نے اردو صحافتی کورس شروع کرنے کے سرکار کے فیصلے کی تعریف کی اور اس کو خوش آئند قرار دیا۔ اس موقعے پر شرکا نے کورس کے تین مہینے کی مدت کو کافی کم بتایا۔ اس مذاکرے میں ڈی ڈی اردو کے مشیر انور جمال، یو این این کے رضا حیدر کے علاوہ آئی آئی ایم سی کے براڈ کاسٹ کے سربراہ پروفیسر ایس راگھو آچاریہ، تحسین حیدر وغیرہ موجود تھے۔ اس میٹنگ کی نظامت کے اس سری واستو نے، جبکہ صدارت سومیت ٹنڈن نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 جولائی 2013

گلزار دہلوی کی 88 ویں سالگرہ

نئی دہلی: سابق مرکزی وزیر اور جھارکھنڈ کے سابق گورنر سید سبط رضی نے انجمن تعمیر اردو دہلی کے بانی مشہور شاعر گلزار دہلوی کی 88 ویں سالگرہ کے موقعے پر منعقدہ تقریب تہنیت کے خطاب میں کہا کہ انھوں نے اردو کی بے لوث خدمت کی ہے۔ ان کی خدمات سنہری حروف میں لکھی جائے گی۔ جلسے کا اہتمام شمیم احمد ایڈوکیٹ نے کیا تھا۔ سید سبط رضی نے کہا گلزار دہلوی کو اردو زبان، اس کے شعر و ادب اور صوفیائے کرام سے والہانہ وابستگی رہی ہے۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو جوڑنے کا کام کرتے رہے۔ ان کی شاعری اور ان کے خیالات کا اظہار ایک ایسے دریا کی مانند ہیں جو صرف بہتا نہیں بلکہ ہمیشہ طغیانی میں رہتا ہے۔ اردو کونسل کے رکن شیخ علیم الدین اسعدی نے کہا کہ آج دہلی والے مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، اور مولانا حفظ الرحمٰن جیسی ماضی کی عظیم شخصیات کو فراموش کرتے جارہے ہیں لیکن گلزار دہلوی ہر موقعے پر اپنی تقریر و تحریر میں ان شخصیات کے ذکر کو کبھی نہیں بھولتے۔ گلزار دہلوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ انھوں نے زندگی بھر اردو کی بقا کے لیے جہاد کیا ہے۔ آج انھیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ نئی نسلیں بھی اردو شعر و ادب سے دلچسپی لے رہی ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عقیل احمد، انوک شریواستو ساز، نسیم اختر، ہندی شاعر برج کمار، چودھری رئیس عالم وغیرہ موجود رہے۔ آخر میں شمیم احمد ایڈوکیٹ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 جولائی 2013

آندھرا پردیش

دکن میں طنز و مزاح کی روایت اور مجتبیٰ حسین

اورنگ آباد: باباصاحب امبیڈکر یونیورسٹی اورنگ آباد میں 'دکن میں طنز و مزاح کی روایت اور مجتبیٰ حسین کی خدمات' کے موضوع پر پچھلے سال سیدہ شائستہ مقیم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی تھی۔ اب یہ ضخیم مقالہ کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے جس کے اجرا کے سلسلے میں پچھلے ہفتے مولانا آزاد

ریسرچ سنٹر اورنگ آباد میں طنز و مزاح کے موضوع پر ایک سہ روزہ سیمینار منعقد کیا گیا۔ مسز فوزیہ خاں وزیر مملکت حکومت مہاراشٹرا نے سیمینار کے افتتاح کے علاوہ اس کتاب کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے اس توقع کا اظہار کیا کہ اس کتاب کی اشاعت سے مجتبیٰ حسین جیسے بلند پایہ ادیب کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مسٹر راجیش ٹوپے وزیر برائے اعلا تعلیم نے بھی تقریب کو مخاطب کیا۔ ڈاکٹر عتیق اللہ (دہلی) نے کلیدی خطبہ پڑھا۔ اس سیمینار کے اجلاسوں میں ڈاکٹر ارتکاز افضل کے علاوہ روزنامہ انقلاب ممبئی کے ایڈیٹر شاہد لطیف، پروفیسر ظہیر علی، ڈاکٹر انتخاب حمید، رفیق جعفر، ڈاکٹر احمد امتیاز (دہلی) وغیرہ نے بھی مخاطب کیا۔ مجتبیٰ حسین پر تحقیقی کام کے سلسلے میں اب تک چھ ریسرچ اسکالروں کو مختلف جامعات کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں عطا کی جاچکی ہیں۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 12 جولائی 2013

اتر پردیش:

جنرل ضمیر الدین شاہ قابل مبارک باد

انجمن ترقی اردو اتر پردیش کے صدر چودھری شرف الدین اور جنرل سکریٹری محمود الظفر رحمانی (ایڈوکیٹ) نے اپنے ایک مبارک بادی پیغام میں کہا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کے وائس چانسلر ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ نے جب سے یونیورسٹی کی کمان سنبھالی ہے انھوں نے یونیورسٹی کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے اور اپنی ہی اس مدت کار میں کئی بڑے اہم فیصلے کیے ہیں مگر ابھی انھوں نے جو تازہ ترین فیصلہ کیا ہے وہ انتہائی قابل مبارکباد ہے، انھوں نے یونیورسٹی میں 12 ویں درجہ تک اردو کو لازمی قرار دیا ہے اور یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ ہر طالب علم کو پچاس نمبر کا اردو کا امتحان پاس کرنا ہوگا جس کے لیے 75 فیصد حاضری اور کم سے کم 17 نمبر لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اس سلسلے میں انھوں نے دو کورس تیار کیے ہیں۔ ایک تو ان طلبا کے لیے ہے جو نیچے سے اردو پڑھتے آئے ہیں اور دوسرا نصاب ان طلبا کے لیے ہے جنھوں نے نویں، دسویں میں اردو نہیں پڑھی ہے۔

بذریعہ ڈاک، محمود الظفر رحمانی (ایڈووکیٹ)، جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو اتر پردیش، 22 جولائی 2013

قرآن کے نادر و نایاب نسخوں کی نمائش

رامپور: رضا لائبریری میں حسب روایت رمضان المبارک کے آخری عشرے میں نادر و نایاب قرآن کے نسخوں کی نمائش لگائی گئی جس کو دیکھنے کے لیے ہر روز کثیر تعداد میں لوگ لائبریری پہنچے اور وہاں موجود قرآن عظیم دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور فن کی تعریف کی۔ نمائش میں

خاص طور سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک سے ہرن کی کھال پر تحریر کردہ کلام پاک لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا۔ اس کے علاوہ امام موسیٰ رضا، امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہا کا کپڑے پر لکھا ہوا قرآن، الفی دوادی قرآن، سونے کے پانی سے لکھا ہوا قرآن اور سب سے زیادہ نایاب ایک انچ پر لکھا ہوا قرآن کو دیکھ کر لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ لائبریری ڈائرکٹر سید محمد عزیز الدین نے بتایا کہ اس نمائش کا مقصد ہے کہ لوگوں کو اپنے آبا و اجداد کے ان اہم کارناموں کے بارے میں معلومات ہو جس کا تصور بھی اب ممکن نہیں۔ انھوں نے کہا کہ لائبریری میں قرآن کریم کے علاوہ بھی کثیر تعداد میں ایسے قلمی نسخے موجود ہیں جس کو دیکھ کر انسان رشک کرتا ہے۔ بہت سی ایسی کتب بھی یہاں موجود ہیں جو دنیا کی کسی دوسری لائبریری میں نہیں ہیں۔ یہ نمائش بارہ روز تک جاری رہی۔

روزنامہ 'انقلاب' 7 اگست، 2013

راجستھان:

تصوف مشترکہ کلچر

اجمیر: خواجہ کی نگری میں وہی آتے ہیں جنھیں خود خواجہ غریب نواز طلب کرتے ہیں۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے ہمارے ملک کو امن و امان کی دولت سے نوازا اور اپنے چشتیہ سلسلے سے بھارت کو کمپوزٹ کلچر دیا جس پر ہمیں جتنا بھی ناز ہو کم ہے۔ ان کے سلسلۂ تصوف کی روشنیوں کا نام کاکی بھی محبوب الٰہی بھی، فرید بھی ہے اور صابرؒ بھی، گیسو دراز بھی ہے اور خسروؒ بھی۔ یہ الفاظ مہارشی دیانند سرسوتی یونیورسٹی میں منعقدہ قومی صوفی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر جسپال سنگھ نے کہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ صوفیوں کے پیغام امن و سلامتی کو فروغ دینے کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر ناشر نقوی کی تصانیف 'صوفیانہ ادبی روایت' اور 'زیارتوں کا سفر' مہمانوں کو پیش کیں۔ مہارشی دیانند سرسوتی یونیورسٹی اجمیر کے وائس چانسلر ڈاکٹر روپ سنگھ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ہمیں ناز ہے کہ اجمیر میں یونیورسٹی سطح پر تصوف کے موضوع پر پہلا سیمینار ہمارے کیمپس میں منعقد ہو رہا ہے۔ ہماری یونیورسٹی بھی ایک مہارشی کے نام سے منسوب ہے لیکن دنیاوی موضوعات سے ہٹ کر انسانی سوچ میں تبدیلی پیدا کرنے والا ہمارے کیمپس کا یہ پہلا سیمینار ہے جس کو منعقد کرانے کا سہرا بابا فرید صوفی سینٹر پٹیالہ کے سر جاتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر لیاقت حسین معینی نے کہا یہ آپسی رواداری ایک دوسرے کے مذہب اور عقیدے کا احترام کرنا اور ہر قسم کے ٹکراؤ کو روک کر محبت کے بھاؤ سے جینے کا طرز ہمارے چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کی سب سے بڑی دین ہے۔ راجستھان اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی نے کہا کہ آج ہم جن قومی زبانوں اور خاص طور پر جس اردو پر ناز کرتے ہیں اس کو بنانے والے بھی صوفی ہی تھے۔ چیئرمین راجستھان ساہتیہ اکادمی وید ویاس نے تصوف اور ہندوستانی زبانوں پر گفتگو کی جب کہ ایم ڈی ایس یونیورسٹی سے وابستہ ڈاکٹر گل راج کلسی، ڈاکٹر شمع خان نے بھی اظہار خیال کیا۔ رضا لائبریری رامپور کے سید محمد عزیز الدین حسین، جموں کے ڈاکٹر خالد حسین، دہلی سے ڈاکٹر کلجیت شیلی اور ڈاکٹر جگجیت کور، اجمیر سے بخشش سنگھ اور ڈاکٹر شمع خان، پٹیالہ سے ڈاکٹر جسوندر سنگھ اور ڈاکٹر دھنونت کور وغیرہ شامل رہے۔ سیمینار سے پہلے صوفی سینٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر ناشر نقوی کی قیادت میں جملہ مہمانان اور مندوبین کو درگاہ غریب نوازؒ کی زیارت کرائی گئی جہاں درگاہ کے ناظم ڈاکٹر انصار احمد خان اور گدی نشین ڈاکٹر لیاقت حسین معینی نے استقبال کیا۔ اس موقعے پر وائس چانسلر پنجابی یونیورسٹی کی طرف سے خواجہ صاحب کے آستانے پر چادر بھی پیش کی۔

روزنامہ 'انقلاب'، دہلی، 28 جولائی 2013

کرناٹک:

ریاست میں 22 ہزار اردو ٹیچر

بنگلور: کل ریاستی صدر کراٹا شیخ فیاض الدین کی قیادت میں کراٹا کے ایک وفد نے کمشنر محمد محسن سے ان کے دفتر میں ملاقات کر کے ان کا خیر مقدم کیا۔ دوران گفتگو کمشنر جناب محمد محسن نے ریاست میں اردو اسکولوں کی تعداد معلوم کی تو بنگلور ساؤتھ کے صدر سجاد قریشی نے بتایا کہ ریاست میں چار ہزار پانچ سو اردو اسکولوں میں تقریباً 22 ہزار اردو اساتذہ اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس دوران کمشنر سے گفتگو کرتے ہوئے صدر کراٹا شیخ فیاض الدین نے کہا کہ تعلیمی فروغ کی غرض سے حکومت جو بھی منصوبے بناتی ہے وہ منصوبے اردو اسکولوں تک بہت دیر سے پہنچتے ہیں۔ صدر کراٹا نے کمشنر سے گزارش کی کہ تعلیمی فلاحی اسکیموں کو بروقت اردو اسکولوں میں رائج کرائیں اور کراٹا وفد کے ساتھ ایک اجلاس طے کریں تاکہ اردو اسکولوں کے مسائل پر تفصیلی گفتگو ہو سکے۔ بنگلور ساؤتھ ضلع کی سکریٹری محترمہ محمودہ خانم، ضلعی نائب صدر محمد سیف اللہ، آرگنائز سکریٹری عزیز اللہ خان موجود تھے۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 12 جولائی 2013

مدھیہ پردیش:

اردو ہندی مسائل مل کر حل کرنے کی اپیل

بھوپال: 'بزم شائقین ادب' کے زیر اہتمام منعقدہ ادبی جلسے اور مشاعرے میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا کہ اس وقت اردو کی جو صورت حال ہے ہندی زبان بھی کم و بیش اسی حالت سے دوچار ہے جس کی آبیاری کی کوشش کی جانی چاہیے۔ جلسے کی صدارت معروف کہانی کار شیام منشی نے کی جب کہ جلسے کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدھیہ پردیش ہندی ساہتیہ سمیلن کے نائب صدر مکیش ورما

موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہندی اور اردو کا وطن ایک ہے مسائل بھی ایک ہیں تو ان مسائل کو اب مل جل کر سلجھانے کا وقت آ گیا ہے۔ اس موقعے پر موجود جنوادی لیکھک سنگھ کے رام پرکاش ترپاٹھی نے کہا کہ زبانوں کا تحفظ گھروں کے اندر ان کا استعمال کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ آج ہم اپنی مادری زبانوں کو بھولتے جا رہے ہیں۔ اقبال مسعود نے کہا کہ ہمیں انگریزی سے پرہیز نہیں ہے کیونکہ اس وقت نئی نسل کو ترقی کے لیے اس زبان کی ضرورت ہے لیکن ہندی اور اردو جب تک اچھی طرح بولی اور سمجھی نہیں جاتی اس وقت تک ہم اپنی روایتوں اور تہذیب سے دور ہو جاتے ہیں، اصل خطرہ یہی ہے اس کی طرف ہم کو متوجہ ہونا ہے۔ جلسے میں بطور خاص اشوک جین بھابھا اور آنند تارن کے علاوہ ابھینو کلا پریشد کے سکریٹری سریش تانتیڑ بھی موجود تھے، ان حضرات کا بھی بزم کی طرف سے گلپوشی کر کے استقبال کیا گیا۔ اس موقعے پر نوجوان شاعر و فنکار بدرواسطی کو مدھیہ پردیش ہندی ساہتیہ سمیلن کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر اور مدھیہ پردیش بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشنل اردو زبان کی سلیبس کمیٹی اور اقبال لائبریری کی ورکنگ کمیٹی کا اعزازی ممبر نامزد کیے جانے کی خوشی میں تمام احباب کی جانب سے اعزاز و استقبال کیا گیا۔ ابتدا میں بزم شائقین ادب کے صدر شعیب علی خاں نے مہمانوں کا استقبال کیا بعد میں بزم کے سرپرست جناب شوکت علی خاں نے سبھی کی گلپوشی کی۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 14 جولائی 2013

مہاراشٹر:

بھاشا بھون میں اردو کو جگہ ملے گی

ودھان بھون: ممبئی میں ریاستی حکومت کی جانب سے 8 کروڑ روپے لاگت سے تعمیر ہونے والے 'بھاشا بھون' میں اردو سمیت اقلیتی درجہ رکھنے والی دیگر زبانوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔ اقلیتی امور کے وزیر محمد عارف نسیم خان کی قیادت میں اردو، ہندی اکادمیوں کے سربراہ اور دونوں زبانوں کے شعرا اور ادبا پر مشتمل ایک وفد نے وزیر اعلیٰ پرتھوی راج چوہان سے ملاقات کی۔ وفد میں شامل ریاستی اردو اکادمی کے کارگزار چیئرمین ڈاکٹر خورشید صدیقی، اردو اکادمی کے رکن فاروق انصاری کے علاوہ ممبئی یونیورسٹی شعبہ ہندی کے سربراہ کرونا شنکر اپادھیائے، ہندی کے شاعر رام جی تیواری سمیر دیگر شامل تھے۔ اس موقعے پر اقلیتی امور کے وزیر نے وزیر اعلیٰ کو بتایا کہ ریاستی کابینہ کے فیصلے کے مطابق میٹرو سنیما سے متصل دھوبی تلاؤ میں واقع رنگ بھون ہال میں مراٹھی زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے 'بھاشا بھون' تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جس میں ہندی، اردو، گجراتی اور مراٹھی ان چاروں زبانوں کے دفاتر و لائبریریاں قائم کی جائیں گی۔ اقلیتی امور کے وزیر نے کہا کہ ریاستی کابینہ کی میٹنگ میں، بھاشا بھون، میں دیگر زبانوں کو بھی شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن گزشتہ دنوں کابینہ کی قرارداد کی جو کافی وزرا کو فراہم کی گئی ہے اس میں اردو کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ نسیم خان نے کہا کہ منظور شدہ فیصلے میں اردو کو شامل کیا جائے وزیر اعلیٰ پرتھوی راج چوہان نے اردو کو شامل کرنے کی یقین دہانی کرائی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جولائی 2013

اردو کی درسی کتابوں میں غلطیاں

ممبئی: ریاستی اسمبلی میں اردو کی دسویں اور بارہویں جماعت کی درسی کتابوں میں املا اور دیگر غلطیوں کا معاملہ ایوان میں گونجا۔ اجلاس کی کارروائی کے دوران رکن اسمبلی ابوعاصم اعظمی نے کتابوں میں غلطیوں کی جانب نشاندہی کرتے ہوئے سخت احتجاج کیا اور سرکار سے مطالبہ کیا کہ فوری طور پر غلطیوں کو درست کیا جائے۔ تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو اساتذہ کی تنظیم اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن نے اردو کی دسویں جماعت کی کتاب میں 260 اور بارہویں کی کتاب میں 550 غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس تعلق سے اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن متعلقہ محکموں کے ذمے داران سے ملاقات کی اور اس جانب ان کی توجہ مبذول کرائی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کالجوں میں دسویں اور بارہویں کی پڑھائی شروع ہوئے 2 ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا ہے لیکن اب تک غلطیوں کو درست کرنے کی کوئی کارروائی نہیں کی گئی ہے یہ بڑے تشویش کی بات ہے۔ انھوں نے درسی کتابوں میں املا اور دیگر غلطیوں کی جانب سرکار کی توجہ دلائی اور چند اقتباسات پڑھ کر ایوان میں سنایا اور کہا کہ غلطیوں کی وجہ سے جملوں کا مفہوم ہی بدل جا رہا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم اگست 2013

اعزاز و اکرام:

پروفیسر گوپی چند نارنگ کسما نجلی ساہتیہ سمان سے سرفراز

نئی دھلی: پروفیسر گوپی چند نارنگ علم کے سمندر بھی ہیں اور ہر دلعزیز شخصیت بھی۔ پوری ادبی دنیا میں ان کی فکر و نظر کی قدر کی جاتی ہے۔ وہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہیں۔ ان خیالات کا اظہار وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت کیا۔

وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت کے ہاتھوں پروفیسر نارنگ کسما نجلی ساہتیہ سمان حاصل کرتے ہوئے

انھوں نے کہا کہ ان کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کے سب معترف ہیں۔ وہ یقیناً ایک بڑے ادیب، نقاد اور محقق ہیں۔ کسما نجلی فاؤنڈیشن نے اپنے ایوارڈ سے انھیں نواز کر قابل تحسین کام کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کو فروغ دینے کے لیے کسما نجلی فاؤنڈیشن جو خدمات انجام دے رہا ہے وہ قابل قدر ہے۔ انھوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ اور رمیش دِوے کو ڈھائی ڈھائی لاکھ روپے پر مشتمل ایوارڈ، شال اور پلاک سے نوازا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ زبان تہذیب کی کلید ہے۔ اپنی کتاب 'فکشن شعریات: تشکیل و تنقید' پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ فکشن اور شاعری دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جتنے بھی قدیم صحائف مثلاً رامائن اور مہابھارت ہیں ان میں زیادہ تر کتھائیں شاعری کی شکل میں ہیں۔ دراصل کہانی ادب کا جوہر ہے اور شاعری کو بھی داخلی غذا اس سے ملتی ہے۔ اکیسویں صدی فکشن کی صدی ہے۔ کسما نجلی فاؤنڈیشن اردو اور ہندی کے ساتھ دیگر ہندوستانی زبانوں کی ترویج و اشاعت اور فروغ کے لیے جو کام کر رہا ہے اس کے لیے جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ فکشن نگار سید محمد اشرف نے کہا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوا کرتیں۔ دنیائے ادب میں پروفیسر نارنگ کی واحد شخصیت ایسی ہے جن کو تقریر اور تحریر دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ ان کی گراں قدر خدمات اور ان کی فکر و نظر کی پوری اردو دنیا قائل ہے۔ کسما نجلی فاؤنڈیشن گورننگ بورڈ کے صدر سشل انسل، محترمہ کسم انسل اور ڈاکٹر ایچ کے کول نے بھی اظہار خیال کیا اور اردو اور ہندی کے صاحبان اعزاز کو مبارکباد پیش کی۔ اس تقریب میں دہلی کی سیکڑوں سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 اگست 2013

حلیم بابر کو امجد حیدرآبادی ایوارڈ

محبوب نگر: جناب حلیم بابر صدر بزم کہکشاں

ہریانہ اردو اکادمی کی تقریبِ اعزازات

چنڈی گڑھ: ہریانہ اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام تقسیم اعزاز و ایوارڈ تقریب میں گورنر ہریانہ جگن ناتھ پہاڑیا نے بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ گورنر نے ایوارڈ اور اعزاز پانے والے قلمکاروں کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اردو کا شمار عالمی زبانوں میں کیا جاتا ہے۔ اس زبان کا ادب نہ صرف یہ کہ بہت اعلیٰ اور معیاری ہے بلکہ زبان کے چاہنے والے دنیا کے کونے کونے میں موجود ہیں۔ کسی بھی صحت مند معاشرے میں قلمکار کی خصوصی اہمیت ہوتی جو معاشرے کو آگہی دیتا ہے۔ انھوں نے ہریانہ اردو اکادمی کی اسکیموں اور پروجیکٹوں کو ہر ممکن مدد دینے کا بھی یقین دلایا۔ وزیرِ اطلاعات و محکمۂ رابطہ عامہ و ثقافت شیو چرن لال شرما نے کہا کہ ہریانہ ابتدا سے ہی اردو شعر و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور یہاں بڑے بڑے

تقریب اعزاز کے موقعے پر گورنر ہریانہ جگن ناتھ پہاڑیا کے ساتھ اعزاز یافتگان

ادیب اور قلم کار پیدا ہوتے رہے ہیں جن میں حالی کا نام بہت نمایاں ہے۔ اردو کا اس سے گہرا رشتہ ہے۔ ہریانہ اردو اکادمی کے ڈائرکٹر کے کھنڈیلوال نے ہریانہ اور اردو کے رشتے کو واضح کیا۔ انھوں نے وزیر اعلا ہریانہ کی جانب سے ایک نئے ایوارڈ کا اعلان کیا، جو گورنر ہریانہ کے نام سے موسوم ہوگا، اسے 'جگن ناتھ پہاڑیا نو آموز اردو ایوارڈ' کا نام دیا گیا یہ ایوارڈ ایک ایسے نو آموز اردو قلمکار کو پیش کیا جائے گا جو تین برسوں کے دوران اردو زبان میں اپنی تخلیقات کو معیار کی سطح پر پیش کرے گا یہ ایوارڈ 21 ہزار روپے پر مشتمل ہوگا۔ نظامت ہریانہ اردو اکادمی کے اڈیٹر شمس تبریزی نے کی۔ اکادمی کے ڈپٹی چیئر مین اعزازی پدم شری کشمیری لال ذاکر نے حکومت کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اردو کی سرپرستی کو اہم فریضہ سمجھتی ہے۔ ہریانہ اردو اکادمی کی چار کتابوں کی رسمِ اجرا بھی عمل میں آئی ان کتابوں میں کیفی اعظمی فن و شخصیت، حالی شناسی، جمناتٹ اور بروشر برائے تعارف ایوارڈ یافتگان شامل ہیں۔ انعام یافتگان کے اسما ہیں:

فخر ہریانہ ایوارڈ کشمیری لال ذاکر اور ڈاکٹر نریش کو پیش کیا گیا، جو ایک لاکھ پچاس ہزار روپے توصیفی سند، ممینٹو اور شال پر مشتمل ہے، حالی ایوارڈ ڈاکٹر شکیل الرحمان کو دیا گیا جو ایک لاکھ اکیس ہزار روپے، کنور مہندر سنگھ بیدی سماجی و ثقافتی ایوارڈ ڈاکٹر کمار پانی پتی کو جو پچیس ہزار روپے، صابر دت ایوارڈ برائے بہبودی خواتین ڈاکٹر رونق زیدی کو جو پچیس ہزار روپے، سید مظفر حسین برنی ایوارڈ برائے شاعری ڈاکٹر کے کے رشی کو پچیس ہزار روپے، خواجہ احمد عباس ایوارڈ برائے نثر ڈاکٹر قمر الدین ذاکر کو جو پچیس ہزار روپے، منشی گمانی لعل ایوارڈ برائے فکشن ڈاکٹر ناظمہ جبیں کو جو اکیس ہزار روپے، سریندر پنڈت سوز ایوارڈ برائے فروغ اردو جناب مکیش انبالوی کو جو اکیس ہزار روپے، اردو صحافتی ایوارڈ جناب نرائن داد خوشدل اور ڈاکٹر سلطان انجم کو مشترکہ طور پر جو اکیس ہزار روپے، اردو ترجمہ نگاری ایوارڈ ڈاکٹر راجونتی مان کو جو اکیس ہزار روپے، جعفر زٹلی ایوارڈ برائے طنز و مزاح ٹی این راز کو جو اکیس ہزار روپے، ایوارڈ برائے خصوصی خدمات فارسی پروفیسر چند شیکھر کو جو اکیس ہزار روپے، غزل گائیکی ایوارڈ ونود سہگل کو جو اکیس ہزار روپے، اردو تھیٹر ایوارڈ پرویش سیٹھی کو جو اکیس ہزار روپے، ہریانہ سے باہر رہ کر ہریانوی ادب و ثقافت پر خصوصی خدمات ایوارڈ پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی کو جو اکیس ہزار روپے، ایوارڈ برائے سائنسی ادب و ماحولیات ڈاکٹر انیس الحسن صدیقی کو جو اکیس ہزار روپے اور اردو کی ترویج و ترقی کے لیے خصوصی خدمات کے عوض ایوارڈ امر ساہنی کو جو اکیاون ہزار روپے پر مشتمل ہے، پیش کیے گئے۔ علاوہ ازیں ہریانہ اردو اکادمی کی خصوصی اسکیم کے تحت ریاست کے وہ قلمکار و ادیب جو اپنی عمر کے پچھتر برس مکمل کر چکے ہیں اور ابھی بھی اردو شعر و ادب کی ترقی میں مشغول ہیں ان کو بھی خصوصی اعزاز سے نوازا گیا، جس میں اکیس سو روپے، شال اور توصیفی سند شامل ہیں ان اعزاز یافتگان میں ہمت سنگھ سنہا نام، جناب روپ نارائن چاندنہ، امر ناتھ وڈیرا، دیپک ٹنڈن، ٹی آر جوشی، جناب اوم پرکاش پوار، گوپال داس انبالوی اور اوم پرکاش الفت شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 اگست 2013

محبوب نگر و موظف ایکزیکیوٹیو انجینئر و سابق صدر اردو گھر کی دیرینہ ادبی و شعری خدمات کے اعتراف میں اردو اکادمی حیدرآباد کی جانب سے 6 جولائی کو اندرا پریادرشنی باغ عامہ حیدر آباد میں منعقدہ تہنیتی تقریب میں معتبر ایوارڈ بہ شکل توصیف نامہ و چیک استاد نامور شاعر حضرت امجد حیدرآبادی کے نام سے موسوم کرتے ہوئے جناب احمد ندیم آئی اے ایس سکریٹری محکمہ اقلیتی بہبود حکومت آندھرا پردیش کے ہاتھوں عطا کیا گیا۔ جناب حلیم بابر زائد از دو چار دہوں سے دنیائے علم و ادب کسے وابستہ ہیں۔ بزم کہکشاں و دیگر ادبی انجمنوں سے وابستگی کے ساتھ ساتھ نامور بزم علم و ادب حیدرآباد کے معتمد عمومی بھی ہیں۔ تاحال موصوف کے چار شعری مجموعے 'وابستگی'، 'کہکشاں در کہکشاں'، 'روداد دل' و مکمل نعتیہ حمدیہ و منقبتی کلام خوشبوئے عقیدت کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور ان کتابوں پر اردو اکادمی نے انعامات سے نوازا ہے۔

روزنامہ 'رہنمائے دکن' حیدرآباد، 8 جولائی 2013

اکبر رضا جمشید علم و ادب ایوارڈ

پٹنہ: ممتاز ادیب اور سبکدوش ضلع جج اکبر رضا جمشید کے 69 ویں یومِ پیدائش کے موقعے پر سنیچر 6 جولائی 2013 کو اردو بھون کے سیمینار ہال میں جلسۂ تقسیم انعامات کا انعقاد کیا گیا۔ جلسے میں انور شمیم (مدیر کسوٹی جدید، سمستی پور)، بھاگل پور کے جواں سال شاعر اوینا ش امن، بتیا کے ڈاکٹر نسیم احمد نسیم (ادیب و مصنف) اور شیوہر کی ڈاکٹر مسرت جہاں کو 'اکبر رضا جمشید ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایوارڈ میں مومنٹو، پانچ پانچ ہزار روپے نقد اور توصیفی سند شامل ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر علیم اللہ حالی، زبیر الحسن غافل اور معین کوثر کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ ایک شال، مومنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ اس تقریب کی صدارت جسٹس پٹنہ ہائی کورٹ سید شاہ نیر حسین نے فرمائی انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو والوں کو سہ لسانی فارمولے پر کام کرنا چاہیے اور اپنے بچوں کو سہ لسانی فارمولے سے الگ نہیں کرنا چاہیے، اس سے اردو کو فائدہ پہنچے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے جس پر ہمیں بے حد فخر ہے۔ اس لیے کہ یہ زبان ہمارے جذبات کا احاطہ کرتی ہے۔ انھوں نے اردو کے شاعروں ادیبوں کے لیے انعامات کا سلسلہ شروع کیے جانے پر اکبر رضا جمشید کو مبارکباد دی اور کہا کہ یہ ایک اچھے اور گراں قدر سلسلے کا آغاز ہے۔ اس موقعے پر گورنمنٹ اردو لائبریری کے

چیئر مین اور مگدھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر شمشاد حسین نے اکبر رضا جمشید کے اس مخلصانہ جذبے کی تعریف کی اور کہا کہ اسے آئندہ بھی جاری رہنا چاہیے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ایوارڈ دیے جانے پر اکبر رضا جمشید کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ انھوں نے جس محبت سے ان کی پذیرائی کی ہے اس کی وہ قدر کرتے ہیں۔ انھوں نے تنقید سے متعلق کہا کہ تنقید کسی ادبی متن کی خوبیوں کو بیان کرنے کا نام ہے۔ اس سے قبل اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اکبر رضا جمشید نے کہا کہ بچپن سے ان کی خواہش تھی کہ وہ اردو زبان و ادب کے لیے کچھ کریں، لیکن افسوس کہ وقت نکل گیا اور میں کچھ نہیں کرسکا۔ انھوں نے کہا کہ آج کی اس تقریب سے میں نے اپنی اس دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ اس جلسے سے انیل سلبھ اور سینئر صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے بھی خطاب کیے۔ نظامت کے فرائض علمی مجلس بہار کے جنرل سکریٹری پرویز عالم نے انجام دیے۔ جلسے کے شروع میں تلاوت کلام پاک اور نعت خوانی کے بعد ظفر صدیقی نے اپنی ایک نظم چند توصیفی قطعات سے سامعین سے داد و تحسین بٹوری۔ جلسے میں بڑی تعداد میں دانش وران اردو اور ادبا و شعرا شامل ہوئے۔

بذریعہ ڈاک، پرویز عالم، جنرل سکریٹری، علمی مجلس بہار، 6 جولائی 2013

امین نواز کو صحافتی اعزاز

بیدر: بنگلور سے شائع ہونے والا ہفت روزہ 'اونچی آواز' کی ایک سالہ اشاعت کی تکمیل پر منعقدہ جشن وکل ہند مشاعرے کے موقعے پر 'اونچی آواز' کے مدیر اعلیٰ محمد ابراہیم نفیس کی جانب سے بیدر شہر کے صحافی محمد امین نواز کو روزنامہ عزیز الہند کے گروپ ایڈیٹر و صحافی عزیز برنی اور ریاستی وزیر برائے اقلیتی بہبود قمر الاسلام کے ہاتھوں اعزاز سے برائے اخباری خدمات پیش کرتے ہوئے ان کی گل پوشی کی گئی۔ محمد امین نواز کو گزشتہ سال کرناٹک اردو رپورٹس فورم اور کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے بنگلور کے ٹاؤن ہال میں بھی صحافتی خدمات پر ایوارڈ پیش کیا گیا تھا۔ اس موقعے پر کرناٹک اردو اکادمی کے رجسٹرار عظمت اللہ، بنگلور کے اردو روزنامہ پاسبان کے مدیر اعلیٰ عبید اللہ شریف، الحاج باباجی، سید شجاع الدین، شیخ حسین داداجان، ٹارگیٹ اسلم اور محترمہ نازنین موجود تھے۔

روزنامہ 'سیاست' بنگلور، 12 جولائی 2013

شان رفعت سروش

نئی دھلی: ایک لڑکی تعلیم حاصل کرتی ہے تو اس کی گود میں پرورش پانے والی نسل غیر تعلیم یافتہ نہیں رہ سکتی۔ آج کا دور مقابلے کا دور ہے اس لیے خود کو مقابلے کے لیے تیار کرنا ہوگا ان خیالات کا اظہار آج اردو اکادمی کے وائس چیئر مین پروفیسر اختر الواسع نے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں منعقد ایک تقریب میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران کیا۔ اس تقریب کا اہتمام سوشل کونسلر اور انجمن فکرِ رفعت سروش کے زیر اہتمام راجدھانی کے ہونہار مسلم بچوں کی حوصلہ افزائی اور

انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں اردو میڈیم کے طلبا اور طالبات کو نقد انعام اور مومنٹو پیش کرنے کے بعد تصویر کشی کا منظر

پذیرائی کے لیے کیا گیا تھا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ترجمان م افضل نے کہا کہ تعلیم کے بغیر ترقی ممکن نہیں ہے، اس لیے مسلمانوں کو اپنی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا ہوگا۔ دہلی اسٹیٹ اقلیتی کمیشن کے چیئر مین صفدر ایچ خان نے کہا کہ اب مسلمان تعلیم کے تعلق سے کافی بیدار ہوچکے ہیں اور وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی کوشش کررہے ہیں۔ ڈاکٹر شبانہ نذیر نے کہا کہ اردو میڈیم کے طلبہ کو کسی طرح کے احساس کمتری کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ اردو میں ہی آئی اے ایس کی تیاری کریں اور کامیابی حاصل کریں۔ معصوم مرادآبادی نے کہا کہ ہم نے اب تک لڑکیوں کی تعلیم کی جانب بہت زیادہ توجہ نہیں دی اب ہمیں اپنی روش کو تبدیل کرنا چاہیے کیونکہ ایک لڑکی تعلیم حاصل کرتی ہے تو پورا کنبہ تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ اس موقعے پر دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں کے 40 ہونہار اور ٹاپر بچوں کو انعامات سے نوازا گیا۔ ان تمام بچوں کو 15-15 ہزار روپے، شیلڈ اور سند سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ اردو میں 100 میں سے 100 نمبر حاصل کرنے پر فتح پوری سینئر سیکنڈری اسکول کے عبدالرحمٰن کو 15 ہزار روپے کے علاوہ 'نشان رفعت سروش' سے بھی نوازا گیا جن بچوں کو آج انعامات سے نوازا گیا ان میں 28 لڑکیاں اور 12 لڑکے شامل ہیں۔ ان میں آرٹ اسٹریم میں ٹاپر شکتی نگر اسکول کی میمونہ شیخ بھی شامل ہے جسے اس سے قبل سی بی ایس سی کی جانب سے ایک لاکھ روپے، وزیر اعلیٰ کی جانب سے 50 ہزار روپے اور سوشل کونسلر کی جانب سے 1100 روپے کے انعامات سے نوازا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ بلبلی خانہ اسکول کی پانچ طالبات، ایس کے وی نمبر 2 جامع مسجد کی پانچ لڑکیوں، زینت محل اسکول لال کنواں کی پانچ طالبات، اینگلو عربک اسکول کے ایک طالب علم، فتح پوری اسکول کے ایک طالب علم، ذاکر حسین اسکول جعفر آباد کے 6 طلبہ، نور نگر اسکول کے 6 طلبا اور جوگا بائی اسکول کا ایک طالب علم شامل ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 جولائی 2013

رسم اجرا:

جامعہ واچ

نئی دھلی: وزیر اعلیٰ شیلا دکشت نے جامعہ واچ کتاب کی رسم اجرا اپنی سرکاری رہائش گاہ پر کیا۔ اس موقعے پر شیلا دکشت نے کہا کہ اس طرح کی کتابیں شائع ہونے سے آنے والی نسلوں کو روشنی ملتی ہے یہ کتاب جامعہ واچ ایک تاریخی کتاب ثابت ہوگی۔ اس کتاب کے خالق اسد نے بتایا کہ جامعہ واچ میں ساٹھ (60) ایسی شخصیت کے سوانح حیات کے بارے میں تفصیلی جانکاری دی گئی ہے جنھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور بہت ہی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں، جن میں دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ، سلمان خورشید، پدم شری اختر الواسع، برکھا دت، آسٹریلیا میں کونسلر و ماہر تعلیم امتاج خاں، ٹی وی اسٹار نیہاریکا اچاریہ، آئی یو خان۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، 28 جولائی 2013

سفر گزار

علی گڑھ: ملک کا ایک مخصوص طبقہ اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان کے طور پر پیش کر کے اس کی اہمیت کو کم کررہا ہے۔ اردو سفر کے منظر نامے میں جمنا پرساد راہی کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو سب کی زبان

ہے۔ ان خیالات کا اظہار ابن سینا اکادمی میں منعقد معروف شاعر جمنا پرساد راہی کی تازہ ترین تخلیق شعری مجموعہ 'سفر گزار' کی رسم اجرا تقریب کو بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے دہلی اردو اکادمی کے نائب صدر و شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سربراہ پروفیسر اختر الواسع نے کیا، انھوں نے مزید کہا کہ مصنف نے پرانے الفاظ کو بہترین انداز میں نئی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے استاد سید سراج الدین اجملی نے کہا کہ یہ مجموعہ جمنا پرساد راہی کی نصف صدی سے زیادہ محنت کا ثمرہ ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر چاولہ نے کہا کہ جمنا پرساد راہی نے اردو زبان کی شاعری پر جو عبور حاصل کیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ اس موقعے پر صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے ان کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جمنا پرساد راہی کی شاعری میں زبان و بیان کی شاندار مثال ملتی ہے۔ انھوں نے علی گڑھ کے شعرا میں امین اشرف کے بعد جمنا پرساد راہی کو سب سے بڑا شاعر قرار دیا، پروفیسر سعید الظفر چغتائی نے جمنا پرساد راہی کی کتاب 'سفر گزار' کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ شاعر نے بہترین انداز میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 جولائی 2013

وفیات

فرمان فتح پوری

نئی دہلی: نامور محقق، نقاد اور ماہر لسانیات فرمان فتح پوری کا 3 اگست کو صبح کراچی (پاکستان) میں انتقال ہوگیا۔ وہ 87 برس کے تھے۔ مرحوم مشہور زمانہ ماہنامے 'نگار' کے مدیر علامہ نیاز فتح پوری کے قریبی عزیز تھے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ ماہنامے کے ساتھ کراچی منتقل ہوگئے تھے جہاں دہائیوں اس رسالے کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ غالب اور اقبال کی اردو شاعری کے علاوہ دیگر لسانی، تنقیدی اور سوانحی موضوعات پر 60 سے زیادہ کتابوں کے مصنف فرمان فتح پوری کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے 'نشان امتیاز' سے سرفراز کیا تھا۔ پاکستان میں 1947 میں اردو میں اولین ڈاکٹر آف لٹریچر ہونے کا شرف حاصل کرنے والے ڈاکٹر فرمان فتح پوری بعد ازاں 30 برسوں تک کراچی یونیورسٹی سے بحیثیت مدرس وابستہ رہے۔ ہندوستان میں علامہ اقبال پر ان کی کتاب 'اقبال سب کے لیے' بے پناہ مقبول ہوئی۔ انھوں نے اردو املا اور رسم الخط کے علاوہ رانی کیتکی پر بھی موثر کام کیا۔ یہاں ان کی موت پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے جے این یو کے

پروفیسر معین الدین جینا بڑے، دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالحق اور صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ اس سانحے نے علم و ادب کی دنیا کو اپنے ایک عظیم محسن سے محروم کردیا۔ ڈاکٹر فرمان 26 جنوری 1926 کو فتح پور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد سید دلدار علی کا شمار بھی علم دوستوں میں ہوا کرتا تھا۔

روزنامہ 'جدید خبر' نئی دہلی، 4 اگست 2013

شمس اعجاز

جلگاؤں: معروف صحافی و شاعر شمس اعجاز کا مورخہ 24 جولائی کی صبح مختصر سی علالت کے بعد 79 برس کی عمر میں ان کی کرم بھوی بھساول میں انتقال ہوگیا۔ یوں تو ان کا اولین وطن بالا پور تھا تاہم پیرانہ سالی کی خار دار پگڈنڈی نے انھیں تلاش معاش میں ملکی سطح پر اپنے ریلوے یارڈ کے لیے مشہور شہر بھساول پہنچا دیا۔ یہاں انھوں نے اپنے فرائض درس و تدریس بھی بخوبی انجام دیے اور اپنے قلم سے بھی فرائض رہبری سنجیدگی کے ساتھ ادا کیے۔ سینئر فکشن رائٹر احمد کلیم فیض پوری نے بتایا کہ ابتدائی ایام میں شمس صاحب نے اپنی رپورٹنگ کے ذریعے روزنامہ انقلاب کے صفحات کو منور کیا۔ یاد رہے کہ مرحوم کم و بیش 40 برسوں سے روزنامہ اردو ٹائمز کے لیے خدمات انجام دے رہے تھے۔ شمس اعجاز نے قبل از وقت ملازمت سے سبکدوشی لے کر وکالت بھی کی اور سرزمین بھساول سے اخبار مہاراشٹر کا اجرا کر کے جہاں اہل مہاراشٹر کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی ربع صدی قبل کوشش کی وہیں وہ افکار ملی (دہلی) کی بھی مجلس ادارت میں بھی شامل تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں انھوں نے مراٹھی صحافی وانی کے ساتھ مل کر مراٹھی روزنامہ لوک شاہی کا ہفتہ وار اردو ایڈیشن بھی سنہ 1995 میں شروع کیا تھا۔ شمس صاحب کو جہاں صحافت سے محبت تھی وہیں انھیں جدید شاعری سے بھی عشق تھا۔ ان کے بھتیجے صلاح الدین ادیب نے بتایا کہ مرحوم، حضرت شاہ سیلانی (بلڈانہ) کے خلیفہ معصوم ارمان نقشبندی کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ ان کی تدفین بھساول میں عمل میں آئی۔ جنازہ میں کثیر تعداد میں ان کے متعلقین نے شرکت کی۔ جن میں شہر و بیرون شہر کے فنکاروں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ ذرا عہد بہار تو آنے دو، خود گھاتوں میں آجائے گا وہ پنچھی ڈال سے اڑ کر مرے ہاتھوں میں آجائے گا۔ مرحوم کا یہ شعر ان کی تدفین کے وقت کئی اذہان میں گونجا ہوگا۔ اتنی طویل ادبی و صحافتی خدمات کے باوجود ان کا مجموعہ منظر عام پر نہیں آسکا تھا۔

پریس نوٹ: مشتاق کریمی جلگاؤں 27 جولائی 2013

مجید مضمر

نئی دہلی: کشمیر یونیورسٹی کے معروف ادیب و ناقد پروفیسر مجید مضمر کا 24 جولائی کو انتقال ہوگیا۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر ابن کنول کے مطابق 60 سالہ پروفیسر مضمر کا انتقال دل کا دورہ پڑنے سے ہوا۔ ان کی مطبوعات میں اردو کا عالمی افسانہ، رنگ باتیں کریں (تنقید)، کشمیری ڈرامہ اور فکشن (تنقید)، اردو ادب میں کشمیر کے علاوہ کئی اہم کتابوں کے تراجم کیے جب کہ نقوش ادب اور روح ادب جیسی

بی اے کی نصابی کتابوں کو ایڈٹ کیا۔ پروفیسر ابن کنول کے مطابق پروفیسر مضمر نے 1986 میں شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی بطور استاد مقرر ہوئے تھے اور اس وقت بطور صدر اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ پروفیسر موصوف یونیورسٹی میں اردو افسانہ، ڈرامہ، ترجمہ نگاری کا فن، اردو غزل، نظم، ادبی تحریک اور رجحانات کے موضوع کو پڑھاتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ چار کتابوں کے مصنف تھے۔ اس کے علاوہ تین اہم مونوگراف کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جسے ساہتیہ اکادمی نے شائع کیا۔ پروفیسر ابن کنول نے اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر مضمر بہت سرگرم اور ادب دوست انسان تھے۔ ان کے انتقال سے یقیناً اردو زبان و ادب کو بڑا نقصان ہوا ہے۔ ہم ان کے انتقال پر تعزیت پیش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ پسماندگان کو صبر جمیل عطا ہو اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ نصیب ہو۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جولائی 2013

نفیس الرحمٰن

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ میتھ میٹکس کے لیکچرار نفیس الرحمٰن کا جمعہ کو اسکارٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ انھیں گزشتہ منگل کو طبیعت خراب ہونے پر اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں ان کا ڈاکٹروں کی نگرانی میں علاج چل رہا تھا۔ ان کی عمر تقریباً 51 سال تھی۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ مرحوم شعبہ ریاضی میں پچھلے 28 سال سے درس و تدریس سے وابستہ تھے۔ ان کی نماز جنازہ جامعہ میں ہوئی جب

کہ تدفین جامعہ کے قبرستان میں عمل آئی۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں اساتذہ اور طلبا موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، 27 جولائی 2013

خورشید عالم خان

نئی دهلی: گزشتہ سات دہائیوں سے تعلیم، سیاست اور قومی ترقیات کے میدان میں کلیدی کردار ادا کرنے والے عظیم سیاست داں خورشید عالم خان کا 19 اور 20 جولائی کے درمیانی رات ڈیڑھ بجے اسکارٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی طبیعت گزشتہ 15 دنوں سے کافی خراب تھی۔

کانگریس کے اہم رہنماؤں نے ان کے صاحب زادے مرکزی وزیر خارجہ مسٹر سلمان خورشید سے اظہارِ تعزیت کیا۔ 96 سالہ خورشید عالم خان دیندار انسان تھے۔ خاص طور سے رمضان کے مہینے میں وہ عبادت کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ 20 جولائی کو موسلا دھار بارش کے دوران ہی ان کے جسد خاکی کو جامعہ قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس موقعے پر تعزیت کے لیے دگوجے سنگھ، شیلا دکشت، نوین جندل اور پدم شری اختر الواسع کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ آئے۔ پروفیسر اختر الواسع نے ان کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم خورشید عالم خان کی حیثیت جامعہ برادری کے سب سے بڑے بزرگ کی تھی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ میں یہ بات روشن حروف سے لکھی جائے گی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو 1988 میں مرکزی یونیورسٹی کا درجہ انھیں کی کوششوں سے ملا تھا۔ وہ جامعہ کی بہبود اور ترقی کے لیے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے، بحیثیت ممبر پارلیمنٹ مرکزی وزیر اور گورنر، انھوں نے ہر عہدے کو وقار اور اعتبار بخشا۔ 5 فروری 1919 میں فرخ آباد یوپی میں پیدا ہوئے۔ وہ 1989 سے 1991 تک گوا کے اور 1991 سے 1999 تک کرناٹک کے گورنر کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔ وہ حکومت ہند کی وزارت برائے خارجہ امور کے وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ 15 برسوں تک راجیہ سبھا اور لوک سبھا کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی یونیورسٹی سے فراغت کے بعد امریکہ کی یونیورسٹی آف پینسیلوانا سے مینجمنٹ کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے فروغ کے تئیں ان کی مہارت اور دلچسپی کی بنیاد پر انھیں ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کالج نئی دہلی کی گورننگ باڈی کا ممبر بھی بنایا گیا۔ وہ وائی ایم سی اے انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ فرید آباد کے گورننگ باڈی کے چیئرمین رہے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سلسلے میں انھوں نے شاندار خدمات انجام دیں۔

روزنامہ 'انقلاب' 21 جولائی 2013

مولانا عبدالحمید رحمانی

نئی دهلی: ہندوستان کے مشہور عالم دین مولانا عبدالحمید رحمانی رحمہ اللہ صدر ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر نئی دہلی 20 اگست صبح 6:30 بجے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ 73 سال کے تھے۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹی اور پانچ بیٹے ہیں۔ آپ کافی عرصے سے علیل تھے اور سنٹر کے خدیجہ نیشنل ہاسپٹل دریا گنج نئی دہلی میں زیر علاج تھے۔ آپ کا انتقال قوم وملت کے لیے ایک دل دوز سانحہ ہے۔ آپ عزم وہمت کے پیکر، ارادے کے دھنی اور بلند حوصلہ والے تھے۔ آپ کی پیدائش مشرقی اتر پردیش کے ضلع سدھارتھ نگر کے ایک گاؤں تندوا میں 1940 میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم ضلع بستی کے مختلف مدارس میں حاصل کی اور 1962 میں جامعہ رحمانیہ بنارس میں فضیلت اور 1970 میں جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ سے کلیہ اصول الدعوۃ والدین سے بی اے کیا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ نے جامعہ رحمانیہ بنارس میں چار سال اور جامعہ سلفیہ بنارس میں دو سال مختلف علوم وفنون کی تدریس کے فرائض انجام دیے۔ تدریسی ذمے داریوں کے علاوہ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی نظامت اور جمعیت کے آرگن 'ترجمان' کی ادارت بھی سنبھالتے رہے۔ 1971 سے 1974 تک آپ مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کے ناظم اعلی رہے۔ آپ نہ صرف اردو بلکہ عربی زبان کے ایک عظیم خطیب تھے۔ خطابت کے ساتھ قلم سے بھی آپ کا گہرا رشتہ تھا۔ مختلف موضوعات پر آپ نے ترجمان، کو اپنے رشحات قلم سے نوازا۔ مرحوم جن مناصب پر فائز رہے ان میں • جنرل سکریٹری، مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند • بانی وصدر، جمعیۃ الشبان المسلمین، بنارس • معاون سکریٹری، مسلم مجلس مشاورت ہند • رکن کل ہند مسلم پرسنل لا بورڈ • رکن، کل ہند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی • رکن، دینی تعلیمی کونسل، اتر پردیش • رکن مجلس ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نئی دہلی • جنرل ایڈوائزر، جامعہ دارالسلام، عمر آباد، تامل ناڈو • رکن، مرکزی ایڈوائزری، حج کمیٹی، حکومت ہند • رکن، مائنارٹی کمیٹی، حکومت ہند۔ آپ نے سعودی عرب، مصر، ملیشیا، امریکہ، انگلینڈ، سنگاپور، سری لنکا اور بنگلہ دیش وغیرہ کی مختلف کانفرنسوں میں شرکت کی۔ جامعہ اسلامیہ سنابل، معہد عثمان بن عفان لتحفیظ القرآن الکریم جوگابائی، عائشہ صدیقہ

شریعت کالج جوگابائی، خدیجۃ الکبریٰ گرلز پبلک اسکول جوگابائی، معہد عمر بن الخطاب علی گڑھ اور معہد علی بن ابی طالب لکھنؤ کی آپ نے سربراہی کی۔ اللہ رب العالمین آپ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ کے اہل خانہ اور سنٹر کے ذمے داران ومنسوبین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

پریس ریلیز، سہیل انجم، ذاکر نگر نئی دہلی، 20 ستمبر 2013

خراج عقیدت

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

نئی دهلی: اردو کے ممتاز اسکالر، ادیب اور دانش ور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی وفات پر آج انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر میں انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی صدارت میں ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی، جس میں سب سے پہلے انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری 16 جنوری 1926 کو فتح پور (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم فتح پور سے ہی حاصل کی۔ 1948 میں الہ آباد سے انٹرمیڈیٹ کیا اور پھر 1950 میں آگرہ یونی ورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ بعد میں انھوں نے کراچی یونی ورسٹی سے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ پہلے ایسے پاکستانی اسکالر تھے جنھیں 1974 میں ڈی لٹ (اردو) ڈگری سے سرفراز کیا گیا۔ ڈاکٹر فاروقی نے کہا کہ فرمان فتح پوری مختلف موضوعات پر پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مرتب تھے۔ ان کے انتقال سے ہم صفِ اوّل کے ایک ادیب، محقق اور نقاد سے محروم ہوگئے ہیں۔ جناب شاہد ماہلی نے کہا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ممتاز نقاد اور دانش ور تھے۔ انھوں نے نیاز فتح پوری کی وراثت کو اعلا مقام پر پہنچایا۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ فرمان فتح پوری سے میری پہلی ملاقات خلیق انجم کے گھر پر اس وقت ہوئی جب وہ اور مشفق خواجہ 1980 کے دہے کے ابتدائی برسوں میں دہلی تشریف لائے تھے۔ فرمان فتح پوری کا علم اور ان کی ادبی لیاقت تو سامنے کی چیزیں ہیں لیکن وہ بلا کے خورد نواز بھی تھے، ڈاکٹر خلیق انجم جو اس تعزیتی نشست میں شامل ہونے سے قاصر تھے، انھوں نے اس تعزیتی نشست میں بذریعے

فون خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں عمر کے اعتبار سے خود کو فرمان فتح پوری صاحب کے خوردوں میں شمار کرتا ہوں لیکن وہ میرے اتنے مشفق اور مہربان تھے کہ دہلی ہو یا کراچی وہ میری پذیرائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے علمی کام بھی کیے۔ انھوں نے نیاز فتح پوری کے رسالے 'نگار' کو مرتے دم تک زندہ رکھا اور وہ ان کی یاد کو ہمیشہ گلے سے لگائے رہے۔ جناب سید شریف الحسن نقوی نے اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری زندگی بھر علم و ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر اہم کتابیں لکھیں۔ بلاشبہ ان کے انتقال سے علم و ادب کی دنیا میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے جسے آسانی سے پُر نہیں کیا جاسکتا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ فرمان فتح پوری کو بہ حیثیت ادیب اور نقاد اردو دنیا میں ایک اعلا مقام حاصل تھا۔ نیاز فتح پوری کی روایت اور اقدار کو مرتے دم تک زندہ رکھا۔ پاکستان جانے کے بعد انھوں نے نیاز فتح پوری کے رسالے 'نگار' کو جاری رکھا۔ انھوں نے ہندوستان اور ہندستان کے ادیبوں اور شاعروں سے اپنے تعلقات ہمیشہ استوار رکھے۔ انھیں ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے ادبی حلقوں میں یکساں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ آج ان کے انتقال پر پوری اردو دنیا سوگوار ہے۔ روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 6 اگست 2013

پروفیسر شاہ عبدالسلام

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں شعبہ اور کل ہند انجمنِ اساتذہ و علمائے عربی (AIAATS) کی طرف سے رام پور رضا لائبریری کے سابق او ایس ڈی، لکھنؤ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ عربی اور معروف محقق و اسکالر پروفیسر شاہ عبدالسلام کے انتقال پر ملال پر ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ طویل علالت کے بعد 17 اگست بروز سنیچر دوپہر میں موصوف کا انتقال ہوا۔ جلسے کی صدارت شعبہ و انجمن کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے کی۔ نشست میں شاہ صاحب کی ذی علم اور باوقار شخصیت کو یاد کیا گیا۔ پروفیسر محمد نعمان خان نے کہا کہ وہ لکھنوی تہذیب و ثقافت کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ انھوں نے اپنی تحقیقی زندگی میں خود اپنی ہی خاندانی لائبریری کے ایک نادر و نایاب مخطوطے 'رسائل الشاہ ولی اللہ واولادہ ومعاصرہ' کو ایڈٹ کرکے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے علاوہ ان کے متعدد علمی و تحقیقی مقالات مختلف رسائل و جرائد اور مجلّات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ پروفیسر خان نے مزید کہا کہ رضا لائبریری کے دورانِ قیام انھوں نے بہت ہی مہتم بالشان تحقیقی اور علمی سیمیناروں کا اہتمام کیا، جن میں ملک کے تقریباً تمام ہی معتبر اہلِ علم سے لوگوں نے استفادہ کیا۔ نیز وہاں کے تحقیقی جرنل میں تاریخی اور قیمتی مقالوں کو شائع کرایا۔ موصوف لمبے عرصے سے تنفس کے عارضے میں مبتلا ہونے کے باوجود بہت ہی فعال علمی زندگی گزاری اور ہمارے لیے قابلِ قدر نمونہ چھوڑا۔ اس نشست میں سابق صدر شعبہ ڈاکٹر ولی اختر ندوی، ڈاکٹر نعیم الحسن اثری کے علاوہ دیگر اساتذہ کرام، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 اگست 2013

مجید مضمر

نئی دہلی: کشمیر یونیورسٹی کے نقاد اور محقق پروفیسر مجید مضمر کے اچانک انتقال سے پوری اردو دنیا نے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ یہ صرف اردو کا نہیں کشمیر کا بڑا نقصان ہے۔ پروفیسر مجید مضمر کے انتقال پر امریکہ سے کے اشرف ڈنمارک سے نصر ملک پاکستان سے فہمیدہ ریاض، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر بادشاہ منیر بخاری، احمد صفی، مقصود شیخ، مہتاب قدر، رضیہ کاظمی، ماریشس سے رشید نیروا، دبئی سے نیر عابد اور کوکب ندیم کے علاوہ پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر فاروق بخشی، پیغام آفاقی، حسن کاظمی، ڈاکٹر صفدر امام قادری اور دیگر ادیبوں نے تعزیتی پیغامات بھیج کر اظہارِ افسوس کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 جولائی 2013

حسن فرخ

حیدرآباد: سید وقارالدین چیف ایڈیٹر روزنامہ 'رہنمائے دکن' نے سینئر صحافی و شاعر حسن فرخ کی صحافتی، شعری و ادبی، سماجی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ جہاں ان کے انتقال سے ان اہم شعبہ جات کا نقصان ہوا ہے وہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "مجھ سے میرا بھائی بچھڑ گیا" ان میں اللہ تعالیٰ نے بے شمار دوسری خوبیاں بھی ودیعت کی تھیں۔ انھیں اس بات کا ملکہ تھا کہ وہ ایک ہی نظر میں بین الاقوامی اور قومی حالات کا تجزیہ کرتے اور اسے بڑے احسن انداز سے صفحۂ قرطاس پر لے آتے، اس سیکولر ملک میں مسلمانوں میں کس طرح شعور کو بیدار کیا جاسکتا ہے انھیں اس کا اچھی طرح علم تھا، حکومت کے رویے پر وہ بڑے احسن طریقے سے قلم اٹھاتے۔ ظلم و زیادتی، ناانصافی پر انھوں نے خوب لکھا۔ ان خیالات کا اظہار سید وقارالدین نے کیا۔ اس موقعے پر دومنٹ کی خاموشی بھی اختیار کی گئی۔ سوماسندر صدر آندھرا پردیش یونین آف ورکنگ جرنلسٹس نے حسن فرخ کی صحافتی خدمات کی ستائش کی۔ نریندر ریڈی جنرل سکریٹری آندھرا پردیش یونین آف ورکنگ جرنلسٹس نے کہا کہ ان کی بحیثیت صحافتی خدمات 'رہنمائے دکن' کے علاوہ دوردرشن اور اردو اکادمی میں رہیں۔ باقر مرزا (آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد) نے کہا کہ حسن فرخ نے اخبار رہنمائے دکن سے وابستہ ہوکر بھی ریڈیو کے لیے کام کیا اور ان کی آواز میں ایک جادو تھا جس کے لیے محکمہ ان کی خدمات کو حاصل کرتے ہوئے روانہ خبریں نشر کرواتا رہا۔ خواجہ مصطفیٰ علی ایڈوکیٹ وسینئر جرنلسٹ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں ایسا انسان پیدا کیا تھا جو ہمیشہ بیدار رہا کرتا جس کو وہ بروئے کار لاکر سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کے حل کے لیے اپنے قلم کو حرکت میں لایا، عابد صدیقی سابق نیوز ایڈیٹر دوردرشن نے حسن فرخ کی طویل رفاقت کا تذکرہ کیا۔ شجاعت علی شجیع ڈپٹی ڈائرکٹر دوردرشن، ڈاکٹر یوسف اعظمی، حمید الظفر، فاضل حسین پرویز ایڈیٹر گواہ، ودیگر نے اظہارِ خیال کیا۔ طاہر رومانی نائب صدر حیدرآباد یونین آف جرنلسٹس نے کارروائی چلائی۔ فیض محمد اصغر نے تجویز پیش کی کہ حسن فرخ کے نام پر ایک ایوارڈ صحافی کو دیا جائے۔ روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 28 جولائی 2013

امیر انصاری

امروہہ: انجمن ترقی اردو اترپردیش کا ایک تعزیتی جلسہ انجمن کے دفتر محلہ ملانہ میں منعقد ہوا جس میں حسن پور کے کہنہ مشق شاعر اور ہفتہ وار اخبار چیف نیوز لیڈر کے ایڈیٹر امیر انصاری کے سانحہ ارتحال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ امیر انصاری کا انتقال 24 جولائی کو ہوگیا تھا۔ اس موقعے پر انجمن کے صدر ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ امیر انصاری ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کی شاعری بڑی معیاری شاعری تھی۔ مرحوم اردو کی بقا کے لیے جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ ان کے دل میں غریبوں کے لیے ہمدردی اور مظلوموں کے لیے درد تھا۔ ایک دوسرے تعزیتی جلسے کے موقعے پر شاعر مدحت سعود نے کہا کہ امیر انصاری کی موت سے ادب کی دنیا میں جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی مشکل ہے۔ حسن پور کے عوام ان کی خدمات فراموش نہیں کرسکیں گے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر منور تابش اور دیگر حضرات نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جلسے کی صدارت معروف شاعر رضوان مسرور نے کی اور نظامت کے فرائض میر شاہ حسین نے انجام دیے۔ اس موقعے پر شوق امروہوی، ڈاکٹر جمشید کمال، ڈاکٹر چندن نقوی، شکیل جاوید، فردوس عالم، اسلم بقائی، رئیس احمد، عادل رشید، عتیق الرحمٰن، عالمگیر خسرو، نفیس مصطفیٰ، متین صدیقی، پرانس درانی، انتخاب عالم، صبا کریمی کے علاوہ شہر کے کئی ادبی حضرات بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 جولائی 2013